حجۃ الوداع و عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

برکۃ العصر حضرت الحاج الحافظ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم المدنی

ترجمہ

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ناشر

معہد الخلیل الاسلامی

۳/۴۴۵ بہادر آباد، کراچی۵، پاکستان

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

حَجَّةُ الْوَدَاع

وَ

عُمُرَاتُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

برکۃ العصر حضرۃ الحافظ الحاج مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم المدنی مدظلہم

ترجمہ

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ناشر

معہد الخلیل الاسلامی

۳/۴۴۵، بہادر آباد، کراچی ۵ پاکستان

① اسلامی کُتب خانہ ـ علامہ بنوری ٹاؤن - کراچی

② درخواستی کُتب خانہ - علامہ بنوری ٹاؤن - کراچی

③ کُتب خانہ مَظہری - گلشنِ اقبال - کراچی

④ مولانا اقبال نُعمانی - آفیسرز کالونی گارڈن روڈ - کراچی

⑤ مکتبۃ الشیخ ۳/۳۶۷ بہادر آباد - کراچی

⑥ مکتبہ سیّد احمد شہید - اُردو بازار - لاہور

فہرستِ مضامین رسالہ حجۃ الوداع

رسالہ عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تقدیم

از: شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد

عبادات میں فریضۂ حج بیت اللہ الحرام ایک عجیب و غریب عبادت ہے، حج کیا ہے؟ بارگاہِ قدس کی تجلیات کا ایک رُوح پرور نظارہ ہے، ایک مومن قانت اپنی استعداد کے مطابق اس مرکزِ تجلیات سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ اس منبعِ انوار کے جلووں سے نورِ ایمانی پاتا ہے اور اس سرچشمۂ فیضان سے غذائے روحانی کا سامان مہیا کرتا ہے ——— غسل کر کے اور لباسِ مرگ پہن کر رضائے محبوب پر مرمٹنے کا عہد (احرام) باندھ لیتا ہے اور پھر عاشقانہ و والہانہ انداز میں نعرۂ توحید بلند کرتا ہے، کبھی محویت کے عالم میں بادہ پیمائی، صحرانوردی اور آبلہ پائی کے ذریعہ دلِ مضطر کا سکون ڈھونڈتا ہے اور کبھی دیوانہ وار تلاشِ محبوب میں دیارِ محبوب کے چکر پر چکر لگاتا ہے۔ صفا، مروہ، منیٰ کے مراحل طے کر کے وادیٔ عرفات پہنچ جاتا ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمت کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور اپنے ظرف و استعداد کے مطابق سیرابی حاصل کرتا ہے۔ مزدلفہ و منیٰ میں نفس و شیطان کے مقابلہ کے تمام مراحل طے کر کے اور نفحاتِ الٰہیہ سے سرشار ہو کر دیارِ محبوب کے آخری دیدار سے سرفراز ہوتا ہے اور دُنیا و عقبیٰ کی سعادتوں سے مالا مال ہو کر وطن پہنچ جاتا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج ——— جو فرضیتِ حج کے بعد ادا فرمایا ——— مدینہ طیبہ سے کیا کس تاریخ کو روانہ ہوئے؟ کب ذوالحلیفہ پہنچے؟ احرام کب اور کیسے باندھا؟ منازلِ سفر کیسے طے فرمائیں؟ راستے کی ایک ایک منزل پر کیا کیا واقعات پیش آئے؟ اور کیا کیا ہدایات فرمائیں؟ مرکزِ تجلیاتِ الٰہی ——— بیت اللہ ——— کب پہنچے اور کس انداز میں پہنچے؟ طواف کیسے کیا؟ صفا و مروہ کی سعی کیسے فرمائی؟ منیٰ کو روانگی کب ہوئی اور کس شان سے ہوئی؟ منیٰ سے عرفات کب اور کیسے پہنچے؟ وقوفِ عرفات کب سے کب تک رہا؟ کیا کیا پڑھا؟ کیا کیا مانگا؟ اور کیسے مانگا؟ حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے کیا کیا بشارتیں ہوئیں، عرفات سے مزدلفہ کا سفر کیسے ہوا؟ وہاں کب پہنچے؟ نمازیں کیسے پڑھیں؟ رات کیسے گزاری؟ وہاں کیا کچھ مانگا؟ کیسے وقوف فرمایا؟ منیٰ کے لیے کب روانگی ہوئی؟ رمی جمرات کیسے کی؟ حج کی قربانی کیسے کی؟ کتنے جانور ذبح کیے؟ اور کیسے کیے؟ ان راتوں کو اور ان لمحوں کو کیسے ذکر اللہ میں گزارا؟ وہاں امت کو کیا کیا وصیتیں فرمائیں؟ منیٰ سے کب روانگی ہوئی؟ محصّب کس وقت پہنچے؟ وہاں کتنا ٹھہرے؟ بیت اللہ کا آخری دیدار اور آخری الوداعی طواف کیسے کیا؟ مدینہ طیبہ واپسی کب ہوئی؟ سفرِ عشق کے یہ تمام مراحل کتنے عرصے میں طے ہوئے؟ اور حیاتِ مقدسہ کے کتنے ایام باقی تھے؟ حج کے علاوہ عمرے

کتنے کیے؟ اور ان تمام اسفار میں کیا کیا واقعات پیش آئے اور کن کن مسائل کی گرہ کشائی فرمائی؟

اِن سے تمام سوالات کے تفصیلی جوابات کے لیے دورِ حاضر کے سب سے بڑے محدث، عالم، شیخ الحدیث حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب صدیقی، کاندھلوی ثم المدنی ۔ دامت برکاتہم ۔ کی کتاب "حجۃ الوداع وعمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا مطالعہ کیجیے جو اپنے موضوع پر جامع ترین کتاب ہے۔

یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس سے علماء ہی مستفید ہو سکتے تھے ۔ حق تعالیٰ برادرِ محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی ۔ مدیر ماہنامہ "بینات" نیوٹاؤن کراچی کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اس کا اردو ترجمہ کر کے عام مسلمانوں پر احسان فرمایا کہ اس خوانِ یغما سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے اور عربی نہ جاننے والے دینی علوم سے ناواقف حضرات بھی خوشہ چینی کر سکیں جن قلم سے علمی نفحات ماہنامہ "بینات" وغیرہ میں مشتاقانِ دین کے دماغوں کو معطر فرماتے رہتے ہیں ۔ اس کے ترجمہ کے بارے میں کچھ کہنے کی حاجت نہیں ۔ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" ۔ جزاء عن العلم خیرا۔

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ
۱۸ ربیع الآخر ۱۳۹۶ھ

"دہلی"

مکرم محترم جناب الحاج مولانا یوسف صاحب لدھیانوی
بعد سلام مسنون! بھائی یوسف صاحب کے خط سے
حجۃ الوداع کا ترجمہ مکمل ہونے کی خبر سے بہت مسرت
ہوئی اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور آپ کے لیے اور
میرے لیے اس کو صدقہ جاریہ بنائے دونوں جہان
میں بہترین بدلہ عطا فرمائے ۔ یہ ناکارہ بجز دعا کے
اور کیا کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے علمی فیوض میں
برکت عطا فرمائے
حضرت مولانا کے مقدمہ کے بعد کچھ لکھنا تو مادح خورشید
مداح خود است کا مصداق ہے اللہ تعالیٰ زیادہ
سے زیادہ مولانا کو نوازے کہ میری وجہ سے بہت
ہی بیگاریں مولانا کو بھگتنی پڑتی ہیں ۔

فقط والسلام
حضرت شیخ مدظلہ بقلم شاہد غفرلہ
۱۴ مئی ۱۹۷۶ء

حجۃ الوداع کا نام حجۃ الاسلام اور حجۃ البلاغ بھی ہے، جیسا کہ "البدایہ والنہایہ" میں ہے اور "خمیس" میں حجۃ التمام بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل خطبہ منیٰ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً، اما بعد:- جب میں پہلی مرتبہ مشکوٰۃ شریف کی تدریس میں کتاب الحج پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قصہ حجۃ الوداع میں روایات کی کثرت اختلاف نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا، کیونکہ میرے لئے اس فن شریف کی تدریس کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اگرچہ زمانہ تعلیم ہی سے یہ روایات موجب خلجان تھیں، کیونکہ انکے طرق و متون اور ان کے درمیان تطبیق و ترجیح میں شدید اختلاف تھا۔ ان احادیث پر مشائخ نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے، چنانچہ نوویؒ کہتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ:

"ان احادیث پر لوگوں نے بکثرت کلام کیا ہے۔ چنانچہ بعض نے بڑی عمدہ اور منصفانہ بحث کی ہے اور بعض نے تکلف و کوتاہی سے کام لیا ہے۔ بعض نے کثرت کلام سے بحث کو طویل کر دیا ہے اور بعض نے بقدر ضرورت پر اکتفا کیا ہے" اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تفصیلی کلام ابوجعفر طحاوی حنفی نے کیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے ہزار ورق سے زیادہ میں اس پر بحث کی ہے، انکے علاوہ ابوجعفر طبری، ابو عبداللہ بن ابی صُفرہ ان کے بھائی مہلّب، قاضی ابو عبداللہ بن مُرابط، قاضی ابوالحسن بن قصّار بغدادی اور حافظ ابو عمر بن عبدالبر وغیرہ نے ان احادیث پر بہت کچھ لکھا ہے۔"

نووی کا کلام، معہ اضافہ از شرح مواہب زرقانی ختم ہوا۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

اسی طرح قصۂ حجۃ الوداع میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سب سے جامع ہے جن محدثین اور اہل سیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی تفصیل ذکر کی ہے۔ انہوں نے اسی حدیث کو مدار بنایا ہے اسی بنا پر شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر کی کتاب الحج کے آغاز میں اسی حدیث کو ذکر فرمایا چنانچہ لکھتے ہیں:

"جی چاہا کہ اس رکن حج کے آغاز میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث طویل سے برکت حاصل کروں، کہ یہ بہت بڑی اصل اور اس باب کی جامع ترین حدیث ہے"

اور نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

"یہ ایک عظیم الشان حدیث ہے جو بہت سے فوائد اور نفیس و اہم قواعد پر مشتمل ہے قاضی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس حدیث کے فقہی مسائل پر بکثرت کلام کیا ہے، اور اس حدیث کی شرح میں ابن منذر نے ایک بڑا رسالہ تالیف کیا ہے، اور اس سے ڈیڑھ سو سے زیادہ مسائل اخذ کئے ہیں اور اگر مزید غور و فکر اور بحث و تفتیش سے کام لیا جاتا تو تقریبًا اتنے ہی اور مسائل اس سے نکل سکتے تھے"

نووی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"حجۃ الوداع کی حدیث کو بہترین طریقہ سے روایت کرنے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے سبقت لے گئے ہیں، انہوں نے مدینہ طیبہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی سے لے کر آخر تک حجۃ الوداع کا پورا واقعہ ذکر فرمایا ہے"

(بہر حال ان احادیث پر متقدمین نے اگرچہ طویل کلام کیا ہے) مگر قصۂ حجۃ الوداع پر مشتمل جو کتابیں میرے پاس موجود تھیں ان میں شیخ ابن قیمؒ کی "زاد المعاد" سب سے جامع نظر آئی، شیخ ابن قیمؒ کے کلام میں واقعہ کی تفصیل اگرچہ موجود تھی مگر ان لوگوں کے لئے، جو موصوف کے فقہی مسلک سے متفق نہیں، کچھ زیادہ مفید نہیں تھی، کہ اول تو اس میں حنبلی مذہب کی تائید ہے، علاوہ ازیں اس میں احناف کے قول کو دوسروں کے اقوال سے ممتاز نہیں کیا گیا۔ اس لئے جی چاہا کہ "زاد المعاد" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کے بیان کی تلخیص کروں۔ اور اصل قصہ کو اس رسالہ کا متن قرار دوں اور متعلقہ مباحث کو بمنزلہ اسکی شرح کے بنا دوں۔ نیز حضرات احناف کے اقوال اور دلائل و مؤیدات بھی ذکر کروں۔ مگر چونکہ مختصر وقت میں قصہ کا استحضار مقصود تھا، اور تمام متعلقہ مباحث کا ذکر اتنی قلیل فرصت میں ممکن نہ تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس قصہ کا خلاصہ بطور متن کے پہلے مرتب کر لیا جائے اور شرح و تعلیق کا اضافہ وقتاً فوقتاً فارغ اوقات میں ہوتا رہے۔ چنانچہ بتاریخ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ شب جمعہ کو مقامی وقت کے مطابق بارہ بجے اس رسالہ کا آغاز کیا وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ لِكُلِّ خَيْرٍ وَالْمُيَسِّرُ لِكُلِّ عَسِيْرٍ

محمد زکریا کاندھلوی   مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

قَالَ الشیخ ابن القیم (فصل) فی ھدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی حجتہ

ترجمہ: شیخ ابن قیم فرماتے ہیں: فصل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ حج کے بیان میں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجوں کی تعداد

شیخ ابن قیم فرماتے ہیں: فصل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حج میں۔ اس میں تو اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف ۱۰ھ میں ایک حج کیا۔ یعنی حجۃ الوداع [اس کو حجۃ الوداع کہنا جائز ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا] البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے حج کیا یا نہیں؟ - ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے دو ہجرت سے پہلے الخ" امام ترمذی فرماتے ہیں: "یہ حدیث بروایت سفیان غریب ہے۔ امام بخاریؒ اسے بروایت ثوری نہیں پہچانتے"۔ ــــــ شیخ اکبر ابن عربیؒ نے اپنی کتاب "محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار" میں اسی پر جزم کیا ہے۔ اسی طرح صاحب "سفر السعادۃ" نے بھی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "جمہور علماء اس پر ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد صرف ایک حج کیا۔ اور یہ حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ یہ ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ باقی رہا قبل از ہجرت کا سوال؟ سو جامع ترمذی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از ہجرت دو حج کئے۔ صاحب "المحلی" نے نقل کیا ہے کہ آپ نے تین یا چار سے زیادہ حج کئے۔ مگر کوئی تعداد محفوظ نہیں"۔

ابن اثیر فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے" ابن جوزی کہتے ہیں کہ "آپ نے اتنے حج کئے جنکی تعداد اللہ ہی جانتا ہے"۔ ابن جوزی کا یہ قول حافظ ابن حجرؒ، حافظ عینیؒ، قسطلانی نے مواہب میں، زرقانی شارح مواہب اور شارح سفر السعادۃ نے اسی طرح نقل کیا ہے ابن جوزی کے قول کا مضمون حاکم نے سفیان ثوری سے بھی روایت کیا ہے۔ ــــــ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا، آپ نے ہندوستان سے چالیس حج پیدل کئے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے حج نہ کیا ہو، جیسا کہ "الاقناع" میں ہے۔ اور "القِرٰی لقاصد ام القریٰ" میں تخریج ازرقی، عثمان بن ساج سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے سعیدؒ نے خبر دی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ستر حج پیدل کئے۔ الحدیث۔

---

[1] حضرت شیخ مدظلہ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ متن اور شرح میں جہاں عبارت "قال" کے لفظ سے شروع ہوگی وہ حافظ ابن قیمؒ کی عبارت ہے۔ اور "قلت" سے حضرت شیخ مدظلہ کی اپنی عبارت ہوگی۔ ترجمہ میں "قال" کی جگہ صرف (ق) کی اور قلت کی جگہ (ش) کی علامت رکھی گئی ہے۔ یعنی ق سے مراد ابن قیمؒ اور شین سے مراد حضرت شیخ مدظلہ۔ (مترجم)

(قال) ولما نزل الحج بادر رسول الله صلی الله علیه وسلم الیه (قال) ولما عزم صلی الله علیه وسلم اعلم الناس انه حاجّ

ترجمہ: ابن قیمؒ فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تیاری شروع کی (ق) اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں۔

حج کب فرض ہوا؟

ابن قیم فرماتے ہیں: جب حج کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تاخیر کے اس کی تیاری شروع کی۔ اور حج کا حکم ۹ھ یا ۱۰ھ میں نازل ہوا (ش) علامہ عینیؒ نے فرضیتِ حج کے سلسلہ میں ۵ھ سے ۱۰ھ تک متفرق اقوال ذکر کئے ہیں، اور اپنی جانب سے کسی قول کو ترجیح نہیں دی۔ البتہ امام قرطبی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ۹ھ کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ملا علی قاری نے سن فرضیت میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا: "اس میں کل گیارہ اقوال ہیں۔" ان میں سے آٹھ قول، ہر قائل کی تعیین کے ساتھ اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ شیخ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ ۶ھ سے پہلے حج فرض نہیں ہوا۔" مگر میں کہتا ہوں کہ اوجز میں ایک قول ۵ھ کا بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ رافعی نے کتاب الحج میں اسی پر جزم کیا ہے، اور یہی المنتقی میں ہے۔ اور صاحب "الخمیس" نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ "صحیح قول کے مطابق ۵ھ ہی میں حج فرض ہوا۔" قسطلانیؒ "المواہب" میں فرماتے ہیں: "جمہور کا قول یہ ہے کہ حج ۶ھ میں فرض ہوا کیونکہ آیت "واتموا الحج" اسی سال نازل ہوئی۔" اسکے علاوہ دوسرے اقوال بھی انہوں نے ذکر کئے ہیں۔ شافعیہ میں سے صاحب "الروضہ" نے بھی ۶ھ کا قول جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔ شامیؒ نے ۹ھ پر جزم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو شخص اس سے قبل کا دعویٰ کرے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں"۔ قاضی عیاض نے بھی۔ جیسا کہ طحطاوی میں ہے۔ اسی کو صحیح کہا ہے۔ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سال حج نہ کرنے میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔" اور انہوں نے اس احتمال کو ترجیح دی ہے کہ شاید وقتِ حج گزرنے کے بعد حج فرض ہوا ہوگا۔ لیکن مظاہر حق میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور دوسرے سال خود بنفس نفیس تشریف لے گئے۔" مگر شیخ ابن قیمؒ نے حضرت ابوبکر کے بھیجے جانے کو حج کے لئے نہیں بلکہ اطلاع و اعلان کے لئے بتلایا ہے۔

(کہ آئندہ سال کوئی مشرک حج کو نہ آئے، اور کوئی شخص برہنہ طواف نہ کرے الخ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادۂ حج کا اعلان

(ق) اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے ارادہ فرمایا تو لوگوں کو عام اطلاع فرمائی کہ آپ حج پر جا رہے ہیں

فتجهزوا للخروج معه وسمع بذالك من حول المدينة فقدموا يريدون الحج مع رسول الله صلى الله عليه وسلم (قلت) ومعه صلے الله عليه وسلم نساءهٗ ووافاه فى الطريق خلائق لا يحصون - فكانوا من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله مد البصر۔

ترجمه: چنانچہ لوگوں نے آپ کے ساتھ حج کو جانے کی تیاری کی، اور مدینہ کے گردو پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (ش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات بھی تھیں۔ اور بے شمار مخلوق آپؐ سے راستے میں آکر ملتی رہی۔ چنانچہ آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے

———— اور آپؐ نے اس وقت ان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے، جیسا کہ ابن حزم کو وہم ہوا ہے۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: "یہ کھلا وہم ہے، کیونکہ یہ بات آپؐ نے حج سے مدینہ طیبہ واپس آکر ارشاد فرمائی تھی" اور یہی صحیح ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں متعدد روایات ام سنانؓ وغیرہ کے قصہ میں وارد ہیں جیسا کہ رسالہ کے آخر میں آئے گا۔

۔ ان دنوں مدینہ شریف میں چیچک یا گرمی دانوں کے مرض کی وجہ سے بہت سے لوگ حج کیلئے نہیں جا سکے تھے اس لئے ان کی دلجوئی کی خاطر، آپؐ نے فرمایا کہ "رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے" یہ بات ابن عربی نے "المحاضرہ" میں کہی ہے۔ اور ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ یہ وہم ہے۔ کیونکہ آپؐ نے یہ ارشاد حج سے واپسی پر فرمایا تھا کہ "رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے"

شرکائے حجۃ الوداع کی تعداد

چنانچہ لوگوں نے آپکے ساتھ حج کی تیاری کی۔ اور مدینہ کے گردو پیش کے لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے ارادے سے جمع ہو گئے (ش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواج مطہرات بھی تھیں۔ جو کجاووں میں سوار تھیں۔ جیسا کہ "طبقات" میں ہے۔ اور بے شمار مخلوق آپؐ سے راستے میں آکر ملتی رہی۔ امام نسائیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا، جو سوار یا پیدل آنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ آیا ہو الخ چنانچہ آپکے آگے پیچھے دائیں بائیں حد نظر تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ شرح سفر السعادہ میں بھی اسی طرح

وخرج من المدينة نهارًا

اور آپ دن کے وقت

ہے، ان کی تعداد میں اختلاف ہے حاشیہ مشکوٰۃ میں "لمعات" سے نقل کیا ہے۔ کہ بعض روایات میں ہے
کہ ان کی تعداد حساب و شمار سے زیادہ تھی۔ اور ان کی تعداد معین نہیں ہوسکی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
آخری غزوہ، غزوۂ تبوک کے شرکا کی تعداد ایک لاکھ کو پہنچی تھی۔ حجۃ الوداع کا سفر اس کے بعد ہوا یقیناً اس
سفر میں مزید تعداد کا اضافہ ہوا ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چودہ (۱۱۴۰۰۰) ہزار افراد تھے۔ اور ایک روایت
میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس (۱۲۴۰۰۰) ہزار تھے۔ واللہ اعلم"۔ ملا علی قاری نے اس پر اضافہ کیا ہے کہ ایک قول کے
مطابق ایک لاکھ تیس (۱۳۰۰۰۰) ہزار تھے۔ اور اوجز میں اسی طرح ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز سفر سے پہلے مواقیت کی تعلیم فرمائی۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت
جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیا، اس میں فرمایا کہ "ہم اہل مدینہ
ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے" الخ اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک
شخص نے مسجد میں کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ آپ ہمیں کہاں سے احرام باندھنے کا حکم فرماتے ہیں؟
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے۔

مدینہ سے روانگی کی تاریخ، دن اور وقت

اور آپ نے ابودجانہؓ کو اور بقول بعض سباع بن عرفطہؓ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا جیسا کہ سیرت ابن ہشام اور
البدایہ والنہایہ میں ہے۔ اور خود دن کے وقت الشجرہ کے راستے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جیسا کہ "الخمیس" اور
"محاضرۃ الابرار" میں ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں باب باندھا ہے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
براہ شجرہ نکلنے کا بیان" اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے حموی "معجم البلدان"
میں لکھتے ہیں: "الشجرہ ذوالحلیفہ میں وہی درخت ہے جہاں (حضرت ابوبکر کی بیوی) حضرت اسماء رضی
اللہ عنہا کے بطن سے محمد بن ابی بکر کی ولادت ہوئی۔ یہ ببول کا درخت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول
تھا کہ وہاں نزول فرماتے اور وہاں سے احرام باندھتے تھے۔ یہ مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے"۔ اور
"بذل المجہود" میں ہے: "یہ درخت ذوالحلیفہ میں مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے الخ" اور "الخمیس" میں ہے کہ "یہ
مدینہ سے چھ میل ہے بقول بعض چار میل اور بقول بعض سات میل"

بعد الظهر لخمس بقين من ذی القعدۃ یوم السبت۔
ظہر کے بعد ۲۵ ذی القعدہ کو بروز شنبہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

مدینہ سے مکہ جانے کے راستے واضح رہے کہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جانے کے چار راستے مشہور ہیں۔ جن کی تفصیل میرے رسالہ "جزء طرق المدینہ" میں ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ "لامع الدراری" کے حاشیہ میں: "باب المساجد التی علیٰ طرق المدینۃ" کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ اوّل طریق سلطانی دوم الغائر، سوم الفرعی، چہارم الشرقی۔ طریق سلطانی یہی طریق الشجرہ ہے۔ میں جب پہلی بار ۱۳۳۸ھ میں مدینہ حاضر ہوا تھا تو طریق الغائر سے حاضر ہوا تھا۔ اور حاشیہ "لامع" میں "مرآۃ الحرمین" سے نقل کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو یہی راستہ اختیار فرمایا تھا۔

ظہر کے بعد ۲۴ ذیقعدہ کو بروز پنجشنبہ مدینہ سے روانگی ہوئی۔ یہ ابن حزم اور ابن عربی کا قول ہے۔ اور حافظ عینیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور یہی مشہور ہے۔ مگر ابن القیمؒ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ ذیقعدہ کو بروز شنبہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اور شیخ ابن قیمؒ نے ابن حزم کے قول کو وہم قرار دیتے ہوئے اس پر طویل بحث کی ہے۔ اور ابن حزم کے قول کی توجیہ وہی ہے۔ جو صاحب البدایہ والنہایہ نے ذکر کی ہے۔ ابن قیم کا قول میرے نزدیک راجح ہے۔ کیونکہ مکہ و مدینہ کی درمیانی منزلیں اس واقعہ میں، نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث المساجد میں کل آٹھ ہیں، یہ حدیث امام بخاری نے روایت کی ہے اور اس میں مکہ و مدینہ کی درمیانی مساجد کو شمار کیا گیا ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ روانگی ۲۵ ذیقعدہ کو بروز شنبہ ہوئی۔ یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا، اور ذوالحجہ کی پہلی تاریخ بالاتفاق پنجشنبہ کو تھی۔ اور آپ کا مکہ مکرمہ پہنچنا بھی بالاتفاق ۴ ذوالحجہ کو بروز یکشنبہ ہوا۔ اور "البدایہ والنہایہ" میں بروایت بخاری ۵ ذوالحجہ کا جو لفظ ہے یہ کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں "پس آپ ذوالحجہ کی چار راتیں گزرنے پر مکہ مکرمہ تشریف لائے"۔ اس تقریر سے تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں۔ صاحب "الخمیس" نے، نیز حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں زرقانی نے شرح مؤطا میں، ملا علی قاری نے مرقاۃ میں اور قسطلانی اور صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ اور ابن ہشام نے صرف اسی کو ذکر کیا ہے لیکن حافظ عینیؒ نے اس کو رد کیا ہے انہوں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آپکی روانگی ۲۴ ذیقعدہ پنجشنبہ کو ہوئی تھی اور صاحب سفر السعادہ کا میلان بھی اسی طرف ہے، اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کے اس قول سے ہوتی ہے

فصلی الظهر بالمدینۃ اربعًا وخطبھم قبل ذالک خطبۃ۔
ثم ترجّل وادّھن وارتدیٰ ثم ارتحل۔ واتاہ اٰتٍ بوادی العقیق

ترجمہ۔ پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا۔
پھر سر میں کنگھی کی، تیل لگایا، چادریں زیب تن کیں۔ پھر سفر کا آغاز فرمایا۔ اور وادی عقیق میں آپؐ کے پاس ایک آنے والا (فرشتہ) آیا۔

جو حافظ عینی نے بسند واقدی نقل کیا ہے کہ ذوالحجہ کا چاند پنجشنبہ کو رُوئتگی سے آٹھویں دن ہوا۔ تفصیل کے لئے عمدۃ القاری ملاحظہ فرمائیں۔

پس مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں۔ اور اس سے پہلے ایک خطبہ دیا۔ جس میں لوگوں کو احرام کا طریقہ اور اس کے سنن و واجبات کی تعلیم دی۔ ابن قیم نے طبری کے اس قول کو وہم قرار دیا ہے کہ آپ جمعہ کے بعد نکلے کیونکہ بہت سی روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپؐ نے مدینہ شریف میں ظہر کی چار رکعتیں ادا فرمائیں اور ذوالحلیفہ پہنچ کر دو رکعت نماز عصر ادا فرمائی، پھر سر میں کنگھی کی، تیل لگایا۔ چادریں زیب تن کیں پھر سفر کا آغاز فرمایا۔

وادی عقیق میں فرشتے کی آمد

اور وادی عقیق میں آپؐ کے پاس ایک آنیوالا (فرشتہ) آیا۔ [عقیق: بفتح اول، وکسر ثانی۔ دو قاف اور ان کے درمیان یاء۔ جیسا کہ معجم البلدان میں ہے] اور اس آنے والے فرشتے نے عرض کیا: کہئیے: "عمرہ حج میں" اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "آج رات میرے پاس ایک آنیوالا میرے رب کی جانب سے آیا۔ اس نے کہا: کہیئے: "عمرہ حج میں" اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ "ذوالحلیفہ ہی وادی عقیق ہے"۔ صاحب معجم نے "عقیق" پر مبسوط کلام کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عقیق چار ہیں۔ یہ دراصل وہ قدیم وادیاں ہیں جو سیلابوں کی وجہ سے بن گئی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک عقیق وہ ہے جس کے بارے میں یہ حدیث آئی ہے: "بے شک آپ وادی مبارک میں ہیں"۔ اور یہ وہی ہے جو وادیٔ ذوالحلیفہ کے اندر ہے"۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں: "العقیق وہ وادی ہے جہاں اہل مدینہ کے مویشی رہا کرتے تھے۔ اور یہ مدینہ سے دو تین میل پر اور بقول بعض چھ یا سات میل پر ہے۔ یہ عقیق اصغر کہلاتا ہے۔ اور یہیں بیر رومہ ہے۔ اس سے آگے عقیق اکبر ہے اور اس میں بیر عروہ ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک وادی عقیق اور ہے جو ان دونوں سے بڑی ہے۔ اس میں بیر علی ہے۔ پوری تفصیل معجم البلدان

وصلی العصر بذی الحلیفۃ رکعتین، وبات بہا، وطاف علی النسائ کلہا، واغتسل للاحرام غیر غسل الجنابۃ

ترجمہ:۔ اور ذی الحلیفہ میں آپؐ نے عصر کی دو رکعتیں پڑھیں، اور رات کو وہیں قیام کیا، اور آپؐ اپنی تمام ازواج سے فارغ ہوئے اور غسل جنابت کے علاوہ احرام کے لئے الگ غسل فرمایا۔

میں ہے۔ اور اسی میں ابو منصور کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ "پانی کی ہر ایسی گزرگاہ جو سیلابوں کی وجہ سے زمین میں کشادہ نہر جیسی بن گئی ہو عرب اسے عقیق کہتے ہیں" آپ کے پاس وحی آئی کہ احرام میں آپؐ کو کس چیز پر اعتماد کرنا ہے (یعنی اقسام حج میں کس قسم کا احرام باندھنا ہے) اور ایک روایت میں ہے جیسا کہ کنز العمال میں ہے کہ "ذیقعدہ کے تین دن رہتے تھے کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ قیامت تک کے لئے عمرہ حج میں داخل ہوگیا" اور آپؐ نے ذوالحلیفہ میں جو مدینہ سے چھ میل اور ایک قول کے مطابق چار یا سات میل ہے جیسا کہ الخمیس اور شرح سفر السعادہ میں ہے۔ ——— عزیز محمد رابع ندوی نے ایک جلسہ میں "حرمین و حجاز کے مشہور مقامات" پر ایک مقالہ ۱۳۸۹ھ میں پڑھا تھا۔ اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ ذوالحلیفہ کو آج کل ابیار علی کہا جاتا ہے۔ اور یہ مدینہ شریف سے ۹ کلومیٹر ہے۔ عصر کی دو رکعتیں پڑھیں اور پھر رات کو وہیں قیام کیا۔ اور آپ (اس رات) اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس سے فارغ ہوئے۔ جیسا کہ شرح سفر السعادہ اور المحاضرہ میں ہے اور امام مسلم نے اسے کئی سندوں سے روایت کیا ہے۔ تمام ازواج مطہرات اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں۔

غسل احرام اور اس کا حکم

اور غسل جنابت کے علاوہ احرام کیلئے الگ غسل فرمایا۔ شارح سفر السعادہ فرماتے ہیں: "صبح کو غسل جنابت کیا اور ظہر کے بعد احرام کیلئے غسل کیا" دردیر کی شرح کبیر میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہی غسل کر لیا تھا۔ جب ذوالحلیفہ پہنچے تو دوگانۂ احرام ادا کرکے احرام باندھ لیا" یہ معروف روایات کے خلاف ہے۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ "ابن حزم نے غسل جنابت کے علاوہ دوسرے غسل کا تذکرہ نہیں کیا" المحاضرہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے غسل جنابت کے علاوہ اور کوئی غسل نہیں کیا تھا۔ ابن قیم فرماتے ہیں: "بعض نے اس غسل کو ذکر نہیں کیا۔ یا تو بھول گئے، یا اس وجہ سے کہ ان کے نزدیک یہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا ہوگا" یہ غسل شافعیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ شرح مہذب

---

[۱] پہلے گذر چکا ہے کہ آپ کی روانگی ۲۵ ذی قعدہ کو ہوئی تھی۔ مگر اسمیں اشکال کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ تاویل کی گنجائش ہے۔ شیخ مدظلہ

ثم طیبته عائشة بیدھا بذریرة وطیب - ولم یغسله بعده

ترجمہ: پھر حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے ذریرہ اور خوشبو لگائی۔ اور بعد میں آپؐ نے اسے دھویا نہیں۔

میں ہے۔ اور مالکیہ و حنفیہ کے نزدیک بھی جیسا کہ اوجز میں ہے اور اسی میں ہے کہ ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ "جو شخص احرام کا ارادہ کرے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پہلے غسل کرے" اہل ظاہر نے اس غسل کو واجب کہا ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ہے۔

احرام کیلئے خوشبو لگانا

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے سر اور بدن پر ذریرہ نامی خوشبو لگائی، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "ذریرہ بروزن عظیمہ ذال معجمہ اور دو راؤں کے ساتھ، خوشبو کی ایک خاص قسم ہے۔ جو اہل حجاز وغیرہ کے یہاں معروف ہے۔ امام نوویؒ اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ ایک خوشبودار جڑی بوٹی کا برادہ ہے۔ جو ہندوستان سے آتی ہے" "صاحب تحیط اعظم" نے قصب الذریرہ کے اقسام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندی میں اسے جرائتہ کہتے ہیں۔ اور اس کا برادہ خوشبودار ہوتا ہے۔ اور زیر بغل لگانا یا سینہ کی خوشبو کے لئے مفید ہے۔ اور ایسی خوشبو جس میں مشک ملا ہوا تھا، لگائی۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ اور ریش مبارک میں مشک کی چمک نظر آتی تھی۔ اور بعد میں آپؐ نے اسے دھویا نہیں مسلم شریف کی ایک حدیث سے غسل سے پہلے خوشبو لگانا مفہوم ہوتا ہے۔ اس سے قاضی عیاض کو یہ وہم ہوا ہے کہ آپؐ نے خوشبو لگا کر اسے دھو دیا تھا۔ حالانکہ تکرار اور تعدد سے کوئی چیز مانع نہیں (یعنی اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ غسل سے پہلے بھی خوشبو لگائی گئی اور بعد میں بھی) (ش) قاضی عیاض کو تاویل کی ضرورت اس واسطے ہوئی کہ وہ مالکی مذہب کے ہیں، اسی بنا پر اُبّی نے بھی شرح مسلم میں اس کی متعدد توجیہات کی ہیں لیکن احرام کے بعد آپ کی ناصیۂ مبارک میں مشک کے چمکنے کی احادیث، جنہیں صاحب البدایہ والنہایہ نے ذکر کیا ہے، ان توجیہات کی نفی کرتی ہیں۔ ہدایہ میں ہے" اور خوشبو لگائے اگر اس کے پاس موجود ہو، امام محمد کے نزدیک ایسی خوشبو لگانا مکروہ ہے جو احرام کے بعد بھی باقی رہے[۱]۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ہمارے مشہور مذہب کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی۔ الحدیث، اور جو خوشبو احرام کے بعد باقی رہے وہ اتصال کی وجہ سے گویا محرم کے تابع ہے۔ بخلاف کپڑے کے، کہ محرم سے جدا ہوتا

---

[۱] جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں فرمایا ہے یشیخ مدظلہ۔

ثم لبس ازارہٗ ورداءہٗ۔ فصلی الظہر رکعتین

ترجمہ: پھر آپؐ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں۔ پھر دوگانہ ظہر ادا کیا

ہے۔" مختصراً۔ ابن عابدین کہتے ہیں: (محرم) اپنے بدن کو خوشبو لگائے خواہ ایسی خوشبو ہو جو باقی رہے۔ مگر کپڑے کو ایسی خوشبو نہیں لگا سکتا۔ جس کا جسم باقی رہے۔ یہی صحیح تر ہے۔" قسطلانی "المواہب" میں فرماتے ہیں۔ کہ امام شافعیؒ و احمدؒ، امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ ہیں۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا۔" شرح سفر میں بھی یہی لکھا ہے۔

میں کہتا ہوں، "مسئلہ خوشبو میں" ائمہ کا مسلک بیان کرنے میں ناقلین کا اختلاف ہے، صحیح وہ ہے جو اوجز میں مذاہب اربعہ کی فقہی کتابوں سے نقل کیا ہے اور اس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں یہ ہے کہ "محرم کیلئے ایسی خوشبو لگانا جس کا جسم، احرام کے بعد تک باقی رہے امام مالک اور امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً ممنوع ہے، خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر۔ اور امام شافعیؒ و احمد کے نزدیک مطلقاً مباح ہے خواہ بدن پر ہو یا کپڑے پر، اور امام ابو حنیفہؒ و ابو یوسفؒ کے نزدیک بدن پر مباح ہے اور کپڑے پر مباح نہیں" ائمہ کے مذاہب میں یہی تفصیل صحیح ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "حدیث یعلیٰ سے استدلال کیا گیا ہے کہ احرام کے بعد خوشبو کا باقی رہنا ممنوع ہے، جمہور کی طرف سے اسکا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حدیث یعلیٰ کا واقعہ جعرانہ کا ہے: جو بالاتفاق ۸ھ میں ہوا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ صحیح حدیث کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے وقت خوشبو لگائی تھی۔ بالاتفاق ۱۰ھ کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے آخری عمل ہی کو لیا جاتا ہے۔"

پھر آپؐ نے احرام کی دو چادریں زیب تن کیں "وفاء الوفا" میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے غسل فرما کر اور چادریں پہن کر نکلے تھے۔ اور صحیح بخاری کے لفظ بروایت ابن عباسؓ یہ ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیل لگا کر کنگھی کر کے اور دو چادریں پہن کر مدینہ سے چلے۔" پھر دوگانہ ظہر ادا کیا، جیسا کہ مسلم و نسائی کی روایت میں تصریح ہے اور بخاری شریف میں ہے۔ کہ "آپؐ نے صبح کی نماز پڑھی پھر سوار ہوئے۔" بخاری و مسلم کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے، کہ بخاری کی روایت میں "ثُمَّ" کا لفظ تراخی بعید کیلئے ہے۔"

دوگانہ احرام کا حکم

اس میں اختلاف ہے کہ یہ دو رکعتیں فرض ظہر کی تھیں۔ یا دوگانہ احرام کی؟ پوری بحث "اجزاء[۱]" میں "صلی بذی الحلیفۃ رکعتین" کے ذیل میں مذکور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

[۱] اجزاء حضرت شیخ مدظلہ کی ایک مستقل تالیف ہے، جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ مترجم

ثم اھل بالحج والعمرۃ۔

ترجمہ: پھر حج وعمرہ دونوں کا (احرام باندھ کر) تلبیہ پڑھا۔

یہ دو رکعتیں دوگانۂ احرام تھیں۔ ان میں سورۃ کافرون اور سورۃ اخلاص پڑھی جاتی ہے۔ جیسا کہ مرقات میں ہے۔ نووی فرماتے ہیں: "اس حدیث سے احرام کے وقت دو رکعتیں پڑھنے کا استحباب معلوم ہوا۔ یہ دو رکعتیں احرام سے قبل پڑھی جاتی ہیں۔ اور یہ ہمارے اور تمام علماء کے مذہب میں نفل ہیں۔ البتہ قاضی وغیرہ نے حسن بصری سے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ ان دونوں کا فرض نماز کے بعد ہونا مستحب ہے۔ کیونکہ مروی ہے کہ یہ دو رکعتیں نماز فجر کی تھیں۔ صحیح وہی ہے جو جمہور کا قول ہے اور یہی حدیث کا مفہوم بھی ہے۔" ابن قیمؒ فرماتے ہیں: "یہ کہیں منقول نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض ظہر کے علاوہ دوگانۂ احرام بھی ادا فرمایا تھا۔" پوری تفصیل اجزاء میں ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ "اور دو رکعتیں پڑھے۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دو رکعتیں پڑھنا روایت کیا ہے"۔ لیکن مجھے نفل نماز کا ذکر صراحۃً کہیں نہیں ملا۔ اوجز میں بہت ہی بسط وتفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ظہر سے ذرا پہلے احرام باندھا تھا مگر ابن قیمؒ نے اس کی تردید کی ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

تلبیہ کے حکم میں اختلاف

پھر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ (کے یک روزہ قیام) میں پانچ نمازیں پڑھ چکے تو حج وعمرہ دونوں کا (احرام باندھ کر) تلبیہ پڑھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ تلبیہ واجب ہے یا سنت یا رکن؟ اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ جس کا خلاصہ حاشیۂ لامع میں یہ ہے کہ: — حافظؒ کے قول کے مطابق تلبیہ میں دس مذہب ہیں۔ ان میں سے معروف مذہب چار ہیں۔ اوّل یہ کہ تلبیہ سنت ہے، اس کے ترک سے کچھ واجب نہیں ہوتا۔ یہ امام شافعیؒ واحمدؒ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ واجب ہے اور اس کے ترک پر دم واجب ہوگا۔ یہ مالکیہ کے اصحاب الفروع کا مختار قول ہے۔ اور بعض شافعیہ سے بھی منقول ہے۔ سوم یہ کہ واجب ہے مگر افعال حج میں سے کوئی فعل مثلاً راستے کی طرف متوجہ ہوجانا اس کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔ مالکیہ میں سے ابن شاش نے اپنا کلام اس سے شروع کیا ہے۔ اور حنفیہؒ میں سے صاحب ہدایہ نے اس کی مثل نقل کر کے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ کوئی دوسرا ذکر لسانی بھی تلبیہ کے قائم مقام ہوسکتا ہے۔ چہارم: یہ کہ رکن ہے اور یہ اہل ظاہر وغیرہ کا مذہب ہے"۔

---

[1] نووی کی اصل عبارت اسی طرح ہے۔ بظاہر اس کے بجائے یہ لفظ ہونا چاہیئے "اسکا یعنی احرام کا فرض نماز کے بعد ہونا" تاکہ استدلال صحیح ہو۔ شیخ مدظلہٗ

فی مصلاہ - وقلد قبل الاحرام بدنه

ترجمہ: اپنی نماز کی جگہ میں۔ اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو قلادہ پہنایا۔

میقات سے پہلے احرام باندھنے کا حکم یہاں ایک اور طویل فقہی بحث ہے وہ یہ کہ کیا احرام مواقیت ہی سے باندھنا واجب ہے اور میقات سے اس کی تقدیم جائز نہیں؟

جیسا کہ اہل ظاہر کا مذہب ہے۔ یا تقدیم بھی جائز ہے؟ جیسا کہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے؟ پھر ائمہ اربعہ کا اس امر میں اختلاف ہے کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا افضل ہے یا میقات سے؟ امام مالکؒ واحمدؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مواقیت ہی سے احرام باندھنا افضل ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل امت کی آسانی کیلئے تھا۔ مگر ان احادیث قولیہ کی بناپر، جو اوجز میں ذکر کی ہیں۔ تقدیم مستحب ہے۔ امام ابوداؤد نے حضرت ابوامامہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: "جو شخص اپنے گھر سے پاک ہو کر (وضو یا غسل کر کے) فرض نماز کے لئے نکلا اس کا ثواب ایسا ہے جیسے کوئی (گھر سے) احرام باندھ کر عمرہ کیلئے جائے الخ" اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی تقدیم افضل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ تلبیہ شروع کیا اپنی نماز گاہ میں (ہی آپؐ نے تلبیہ پڑھنا شروع کیا) اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ سے احرام باندھا؟ تعلیق ممجّد میں ہے کہ اس بارے میں تین روایتیں وارد ہیں: ۱- نماز کی جگہ سے ۲- جب سوار ہوئے ۳- جب بیداء کی بلندی پر چڑھے۔ ان روایات کے درمیان تطبیق ابن عباسؓ کی روایت میں آگے آرہی ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک تینوں کی گنجائش ہے۔ اور ہمارے نزدیک پہلی صورت راجح ہے۔ ابن قیم کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ شافعیہ و مالکیہ کے نزدیک دوسری صورت راجح ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "ان تینوں کے جواز پر ہر جگہ کے علماء متفق ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت میں ہے۔" صاحب البدایہ والنہایہ نے اس سلسلہ کی روایات بڑی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔

ہدی کو قلادہ پہنانے کا حکم اور احرام سے پہلے اپنی ہدی کے اونٹوں کو دو جوتوں کا قلادہ پہنایا، جیسا کہ شرح سفر اور المحاضرہ میں ہے۔ اور صحیح مسلم اور ابوداؤد میں بھی ہے۔

اور اوجز میں ہے کہ قلادہ پہنانا بالاجماع سنت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ایک جوتے کا ہو یا دو کا؟ ابن رشد کہتے ہیں: "ہدی، اونٹ یا گائے کی ہو تو اس میں اختلاف نہیں کہ ان کو قلادہ پہنایا جائے البتہ بکری کو قلادہ پہنانے میں اختلاف ہے۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نہ پہنایا جائے، اور امام

واشعرھا

ترجمہ: اور ان کا اشعار کیا۔

شافعیؒ احمد اور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ پہنایا جائے۔" اہ مختصراً۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹوں کی نگہداشت پر حضرت ناجیہ اسلمی مقرر تھے۔ جیسا کہ طبقات میں ہے۔ اور زیلعی نے واقدی کی مغازی سے بھی نقل کیا ہے ـــــ اور ذکر کیا گیا ہے کہ عمرۂ حدیبیہ اور عمرۃ القضاء میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایا پر حضرت ناجیہ رضی اللہ عنہ ہی مقرر تھے۔ جیسا کہ الخمیس" میں ہے۔

ہدی کے اشعار کا حکم

اور دائیں یا بائیں جانب میں ان کا اشعار کیا۔ اس سلسلہ میں روایات و مذاہب مختلف ہیں کہ اشعار دائیں جانب کیا گیا یا بائیں جانب؟ جیسا کہ آگے مفصل آتا ہے۔ (ش) مسئلہ اشعار مشہور اختلافی مسئلہ ہے، جو اوجز میں اس تفصیل سے مذکور ہے کہ اشعار میں تین بحثیں ہیں ۱۔ اس کی تشریح ۲۔ اس کا حکم ۳۔ کن جانوروں کا اشعار کیا جائے؟..... (پہلی بحث ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ) رہی دوسری بحث تو اس کے حکم میں اختلاف ہے، جمہور علماء بشمول ائمۂ ثلاثہ اس کو سنت کہتے ہیں، امام ابو یوسف اور امام احمدؒ فرماتے ہیں یہ بہتر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ بدائع میں ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ "اشعار امام ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ ـــــ صاحبینؒ کے نزدیک افضل اور امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین سے مروی ہے۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ قلادہ پہنانے سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہدی کا جانور گھاس پانی پر جائے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے اور اگر گم ہو جائے تو واپس کر دیا جائے۔ اور یہ مقصود اشعار سے بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قلادہ کی بہ نسبت زیادہ لازم ہے۔ اس اعتبار سے یہ سنت ہے۔ مگر اس کے معارض اشعار میں شکل بگاڑنے (مثلہ) کی جہت بھی ہے اس بنا پر ہم اسے حسن کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ مُثلہ ہے جو ممنوع ہے اور جب جواز و عدم جواز میں تعارض ہو جائے تو عدم جواز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشعار کرنا ہدی کے جانوروں کی حفاظت کی غرض سے تھا۔ کیونکہ مشرکین اس کے بغیر تعرض سے باز نہیں آتے تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ امام صاحبؒ نے اشعار کو مطلقاً مکروہ نہیں کہا۔ بلکہ اپنے زمانہ کے اشعار کو مکروہ کہا ہے کیونکہ لوگ اس میں حدود سے تجاوز کرنے جاتے تھے۔" اھ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور کوکب میں مسئلہ اشعار پر مختصر مگر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔

وسلت عنها الدم وساق الهدایا معه

ترجمہ:- اور ان سے خون صاف کیا۔ اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔

محل اشعار میں اختلاف پھر اشعار دائیں جانب ہو یا بائیں جانب؟ اس میں روایات اور مذاہب میں اختلاف ہے۔ جن کی تفصیل اوجز میں ہے، ہدایہ میں بائیں جانب کو ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ بائیں جانب نیزہ مارنا مقصود تھا اور دائیں جانب اتفاقاً تھا۔ شیخ ابن ہمام نے نیز ہمارے شیخ (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ثم مدنی) نے بذل میں دونوں قسم کی روایات ذکر کی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل الاوجز میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس میں امام مالکؒ سے چار روایتیں منقول ہیں، ان میں سے راجح بائیں جانب کی روایت ہے۔ دردیر اور ان کے علاوہ عام ناقلین مذاہب نے صرف اسی کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے جیسا کہ المغنی میں ہے۔ ان کی دوسری مشہور روایت؛ جو امام شافعیؒ کا قول اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت ہے۔ جیسا کہ شرح لُباب میں ہے۔ یہ ہے کہ دائیں جانب اشعار کیا جائے، باجی کہتے ہیں کہ بائیں جانب اشعار کرنا آپ کی سنت ہے، صاحبین بھی اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ عینی وغیرہ میں ہے۔ اور امام محمدؒ نے مؤطا میں اسی کو لیا ہے۔

اور ان سے خون صاف کیا۔ جیسا کہ "الہدی" میں ہے۔ اور صحیح مسلم اور ابو داؤد وغیرہ کی متعدد روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ ترمذی کے الفاظ یہ ہیں: "واماط عنہ الدم"۔ اور اس سے خون صاف کیا" کو کتب میں ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس جگہ سے خون بالکل صاف کر دیا تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہتے خون سے کوہان کی اس جانب کو رنگ دیا۔ اور اگر ہٹا دینے کے لفظ کے متبادر معنی لئے جائیں۔ تو اشعار کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اشعار کی جتنی خراش مسنون ہے۔ دیکھنے والوں کو عموماً نظر نہیں آسکتی، بالخصوص جب کہ وہاں خون کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔

میقات سے ہدی کے جانور ساتھ لے جانا اور ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ ابن قیمؒ نے ابن حزم کے اس قول کو وہم قرار دیا ہے۔ کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے جانور اپنے ساتھ لئے۔ اور یہ ہدی نفل تھی"۔ یہ وہم صرف دوسرے جز میں ہے یعنی ان کا ہدی نفل ہونا، ورنہ پہلا جز یعنی ہدی کے جانوروں کو ساتھ لے جانا اس میں وہم نہیں، کیونکہ یہ ایک معروف

(قال) وانما قلنا انه علیه الصلوٰة والسلام احرم قارنًا لبضعة وعشرین حدیثا۔

ترجمہ: (ق) یہ جو ہم نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کا احرام باندھا تھا، یہ اس لئے کہ (اس کی تائید میں) بیس سے زائد احادیث موجود ہیں۔

حقیقت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے"۔ اور بہت سی روایات میں اس کی تصریح آئی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج کے ساتھ عمرہ کو ملا کر تمتع کیا۔ اور ہدی کے جانور بھی اپنے ساتھ ذوالحلیفہ سے ہنکائے تا الحدیث۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ "اگر یہ صورت مجھے پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں سامنے آئی تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا"۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی روایات مروی ہیں۔ ہدایہ میں ہے: "اور ہدی کا ساتھ لے جانا افضل ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور اپنے ساتھ لے گئے تھے" اھ میں کہتا ہوں کہ امام بخاریؒ نے بھی اپنی کتاب میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اسلئے کہ پہلے انہوں نے یہ باب ذکر کیا ہے "باب من ساق البدن یعنی جو شخص قربانی کے مویشی اپنے ساتھ لے جائے"۔ اس کے بعد باب باندھا ہے: "باب: من اشتری الھدی الخ یعنی جو شخص راستہ میں ہدی خریدلے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اسکے دلائل

(ق) یہ جو ہم نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کا احرام باندھا تھا یہ اس لئے کہ اس کی تائید میں بیس سے زائد صحیح اور صریح احادیث موجود ہیں۔ بعد ازاں شیخ ابن قیمؒ نے ان تمام احادیث کو ذکر کر کے ان پر مفصل کلام کیا ہے، اسی طرح صاحب "البدایہ والنہایہ" نے بھی نہایت تفصیل سے احادیث قران کو جمع کیا ہے۔ اور جو روایات اس کے خلاف ہیں ان کا جواب دیا ہے۔ اسی طرح صاحب "المحلی علی الموطا" نے بھی احادیث قران کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ عینیؒ فرماتے ہیں: "امام طحاویؒ نے دس صحابہ کرام سے قران کی افضلیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قارن ہونا نقل کیا ہے"۔

حج کی تین اقسام میں سے افضل کونسی قسم ہے

مخفی نہ رہے کہ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو اپنے مختار مذہب پر منطبق کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اس میں ائمہ اربعہ کے نزدیک احرام کی افضل صورت کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ: "مشائخ کی زبان پر بلکہ بہت سے فقہا اور شارحین حدیث کی تصانیف میں بھی

یہ بات مشہور ہے کہ یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی کیا صورت تھی؟ اور بعض نے اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ ائمہ کے نزدیک احرام کی جو افضل صورت محقق ہوئی ہے اس کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ سب کے نزدیک مطرد نہیں چنانچہ نوویؒ کہتے ہیں: "باقی رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج؟ تو اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ مفرد تھے یا متمتع یا قارن؟ علماء کے یہ تین قول ہیں جو ان کے سابقہ مذاہب کے مطابق ہیں۔ ہر فریق نے اپنے مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج ایسا ہی تھا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آپؐ اولاً مفرد تھے۔ پھر عمرہ کا احرام باندھ کر قارن ہوگئے" اھ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نوویؒ نے مذاہب کو بیان کرتے ہوئے افضلیتِ افراد کو صحیح کہا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بیان میں وہ لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ بالآخر قارن ہوگئے تھے۔ فقہ حنبلی کی کتاب "الروض المربع" میں ہے: "امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ لیکن میں تمتع کو پسند کرتا ہوں"۔ بہت سے اہل علم نے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: "امام احمدؒ سے جو چیز منصوص ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے، حتیٰ کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ اور یہی قول ائمہ حدیث مثلاً اسحاق بن راہویہ وغیرہ کا ہے۔ اور یہی صحیح ہے جس میں کسی ریب و تردد کی گنجائش نہیں اور ابن حزم نے اپنی تالیفات میں اسی کی تقریر کی ہے" اھ

یہاں یہ جاننا بھی مناسب ہوگا۔ کہ ائمہ اربعہ شکر اللہ سعیھم کا اس میں اختلاف ہے کہ اقسام حج میں سے افضل کون سی قسم ہے؟ حج کی تین قسمیں مشہور و معروف ہیں۔ یعنی اِفْرَاد۔ قِرَان۔ تمتُّع۔ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ یہ تینوں صورتیں جائز ہیں۔ اور ایک چوتھی قسم ہے یعنی حج فسخ کرکے عمرہ کا احرام باندھ لینا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے "تمتع، قران اور افراد کا بیان اور جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کے لئے فسخ کا حکم"۔ یہ آخری صورت حنابلہ کے نزدیک راجح ہے۔ جیسا کہ حاشیۂ لامع میں "باب من اھل فی زمن النبی صلے اللہ علیہ وسلم" کے ذیل میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن اوجز میں مذاہب کے بیان میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ تمتع افضل ہے، پھر افراد، پھر قران۔ اور دوسری یہ کہ اگر ساتھ ہدی لایا ہو تو قران افضل ہے ورنہ تمتع۔ اور مالکیہ کے نزدیک جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں ہے۔

افراد افضل ہے پھر قران پھر تمتع۔ اور شافعیہ کی اس میں تین روایتیں ہیں جو نوویؒ نے ذکر کی ہیں اور کہا ہے۔ کہ "صحیح یہ ہے کہ افراد افضل ہے پھر تمتع پھر قران" ان کی عام کتب فقہ میں بھی یہی ہے۔ لیکن افراد کی افضلیت کے لئے ان کے ہاں یہ شرط ہے کہ اسی سال عمرہ بھی کرے۔ ورنہ تمتع اور قران افضل ہونگے۔ جیسا کہ شارح اقناع اور شارح منہاج نے تصریح کی ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ قران افضل ہے، پھر تمتع، پھر افراد۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اختلاف

شیخ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت کے بارے میں پانچ جماعتوں کو وہم ہوا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آپؐ نے بغیر عمرہ کے صرف حج مفرد کیا تھا۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اس مضمون کی روایات کو ذکر کر کے ان کے رد و اثبات میں مفصل کلام کیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا تھا۔ یعنی عمرہ کے احرام سے فارغ ہو کر آپؐ نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اس کو بھی صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ اور زرقانی شرح مواہب میں بھی یہی ہے۔ تیسرا گروہ جو کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متمتع تھے۔ قارن نہیں تھے۔ مگر آپؐ نے احرام نہیں کھولا تھا۔ کیونکہ آپؐ اپنے ساتھ ہدی کے جانور لے کر گئے تھے۔ صاحب مغنی وغیرہ کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ "الہدیٰ" میں ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں حافظ کی تقلید میں کہتے ہیں کہ امام طحاوی اور ابن حبانؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ چوتھا گروہ جو اس کا قائل ہے کہ آپؐ نے قران کیا تھا۔ اور دو طواف اور دو سعیں کی تھیں (ش) حنفیہ اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے آتا ہے۔ اور پانچواں گروہ جو کہتا ہے کہ آپؐ نے حج مفرد کیا تھا اور بعد میں تنعیم سے عمرہ کیا تھا (ش)، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں یہ قول مالکیہ و شافعیہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قول غلط ہے۔ قسطلانی کہتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ کا قران کیا تھا۔ اور دونوں احرام اکٹھے کھولے تھے۔ اور دونوں کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کی تھی" اھ یہ چھٹا قول ہی شیخ ابن قیمؒ کے نزدیک راجح ہے۔ اسی وجہ سے اسے اوھام میں ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اوپر گذر چکا ہے کہ چوتھا قول حنفیہ کا ہے۔ ان کے قول اور شیخ ابن قیمؒ کے نزدیک جو قول راجح ہے اس کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ حنفیہ طواف و سعی کے تکرار کے قائل ہیں۔ اور مصنفؒ (ابن قیمؒ) قائل نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک قارن پر دو طواف اور دو سعیین لازم ہیں

شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں ان اقسام کو تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے حنفیہ کے قول کو ترجیح دی ہے نیز اوجز میں حضرت عائشہؓ کی حدیث "والذین جمعوا الحج والعمرۃ فانما طافوا طوافا واحدا" (اور جن لوگوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا انہوں نے بس ایک ہی طواف کیا) کے ذیل میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اور اس حدیث کا نیز اس مضمون کی دیگر احادیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ احادیث کسی کے نزدیک بھی اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں۔ کیونکہ تین طواف یعنی طواف قدوم، طواف زیارت اور طواف وداع تمام علماء کے نزدیک ثابت ہیں۔ اس لئے "بس ایک ہی طواف کیا" کی تاویل سب کے قول پر ضروری ہے۔ اس کی متعدد تاویلات اوجز میں تفصیل سے ذکر کی ہیں، سب سے اچھی توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے دونوں احراموں سے فارغ ہونے کیلئے ایک ہی طواف کیا۔ بخلاف اس کے جو کہا گیا ہے کہ دونوں احرام کھولنے کے لئے دو طواف اور دو سعیین کرے۔ اس کے بعد اوجز میں حنفیہ کے اس قول کے دلائل بیان کئے ہیں کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعیین ہیں۔ چنانچہ عینی کا قول نقل کیا ہے کہ مجاہد۔ قاضی شریح، شعبی، نخعی، اوزاعی، ثوری، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور ایک جماعت، جن کے نام اوجز میں مذکور ہیں۔ اس کے قائل ہیں کہ قارن کیلئے دو طواف اور دو سعیین ضروری ہیں، اور یہی قول حضرات عمرؓ، علیؓ، ان کے صاحبزادے، حسن، حسین اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے، یہی امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔ مجاہد نے حضرت ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا اور ان کے لئے دو طواف اور دو سعیین کیں اور فرمایا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جس طرح میں نے کیا" اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اوجز میں اس سلسلہ کی مرفوع روایات کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: امام طحاویؒ وغیرہ نے حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی سند میں "لاباس بہا" ہیں۔ (یعنی لائق قبول ہیں)

اور ہدایہ میں ہے کہ "امام شافعیؒ نے فرمایا: قارن ایک طواف اور ایک سعی کرے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت تک کیلئے عمرہ حج میں داخل ہوگیا" اور اس وجہ سے بھی کہ قران کا مبنیٰ تداخل پر ہے۔ چنانچہ اس میں (حج اور عمرہ دونوں کے لئے) ایک ہی تلبیہ ایک ہی سفر اور ایک ہی حلق

پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح ارکان میں بھی تداخل ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب صُبَیّ بن معبد نے دو طواف اور دو سعییں کیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تجھے تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کی طرف ہدایت کی گئی"۔ نیز اس لئے کہ قران ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ملا کر ادا کرنے کا نام ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہر ایک عبادت کو کامل طور پر ادا کیا جائے۔ نیز اس لئے کہ عبادتِ مقصودہ میں تداخل نہیں ہوا کرتا۔ اور سفر بیت اللہ تک پہنچنے کے لئے اور تلبیہ احرام باندھنے کے لئے اور حلق احرام کھولنے کے لئے ہے لہٰذا یہ چیزیں خود مقصود نہیں۔ بخلاف ارکان کے کہ وہ خود مقصود ہیں۔ دیکھئے نفل کے "دوگانے متداخل نہیں ہوتے مگر ایک تحریمہ سے ادا ہو جاتے ہیں۔ اور جو حدیث امام شافعی نے استدلال میں پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کا وقت حج کے وقت میں داخل ہو گیا"۔ اھ ابن کثیر "البدایہ والنہایہ" میں لکھتے ہیں کہ "عراقیین کی ایک جماعت۔ مثلاً ابو حنیفہؒ، انکے اصحاب اور امام ثوریؒ کا مذہب یہ ہے کہ قارن دو طواف اور دو سعییں کرے گا۔ حضرت علی، ابن مسعود۔ مجاہد۔ اور شعبی سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ حضرات اپنے مسلک پر حضرت جابر کی طویل حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ہے کہ آپؐ نے صفا و مروہ کی سعی پا پیادہ کی تھی اور اسی حدیث میں بروایت ابو الزبیر یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کی سعی سواری پر کی تھی، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سعی دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ پا پیادہ اور ایک مرتبہ سواری پر۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے احرام میں چھ قول

(ق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی نوعیت میں پانچ جماعتوں کو وہم ہوا ہے۔ [یہ پانچوں اقوال مع ذکر قائلین کے اوجز میں مذکور ہیں۔ اور اوجز میں ہے کہ اس اختلاف اور مذکورہ بالا اختلاف کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلا اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال حج کی کیفیت میں تھا اور یہ صرف احرام کی کیفیت کے متعلق ہے] پہلی وہ جماعت جو اس کی قائل ہے کہ آپؐ نے صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا اور اسی پر قائم رہے۔ دوسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپؐ نے صرف حج کا تلبیہ کہا اور پھر اسی پر مستمر رہے۔ امام مالک اسی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ "البدایہ والنہایہ" میں ہے۔ تیسری وہ جماعت جو کہتی ہے کہ آپؐ نے پہلے حج کا تلبیہ کہا پھر اس پر عمرہ کو داخل کر لیا۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ یہ (عمل یعنی حج پر عمرہ کا احرام باندھنا) آنحضرتؐ کی خصوصیت تھی (کسی اور کے لئے جائز نہیں)، یہ قول نوویؒ نے اختیار کیا ہے۔ ان سے صاحبؒ بحر نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ اور صاحب درمختار نے اس کو

ترجیح دی ہے۔ ابن منذر اور محب طبری نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ عام محقق شافعیہ اور مالکیہ نے اس پر جزم کیا ہے۔ اور اسی کو قاضی عیاض نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "بہت سی روایات میں وارد ہے کہ آپ مفرد تھے، اور تمتع کی روایات سے مراد یہ ہے کہ آپؐ نے اس کا حکم فرمایا تھا۔ اور روایات قران میں آپؐ کی آخری حالت کی خبر دی گئی ہے کیونکہ آپؐ نے حج کے اوپر عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا"۔ حافظ فرماتے ہیں کہ یہی تطبیق قابل اعتماد ہے۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے اور اسی میں یہ بھی ذکر ہے کہ ان حضرات پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک حج پر عمرہ کا داخل کرنا ممنوع ہے۔ جیسا کہ عینی کے حوالے سے آگے آتا ہے۔

اور چوتھی جماعت جس نے یہ کہا کہ آپؐ نے اولاً عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ پھر اس پر حج کا احرام بھی باندھ لیا تھا اور قارن ہو گئے۔ امام طحاویؒ شرح الآثار میں اسی کی طرف مائل ہیں۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں ان سے نقل کیا ہے، اور زیلعی میں ہے کہ صاحب تنقیح فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ اگرچہ دوسرے اقوال کی بنسبت اقرب ہے۔ اور اوجز میں یہ قول خطابی اور ابن حبان سے نقل کیا ہے۔

۶ اور پانچویں جماعت جس نے یہ کہا ہے کہ آپ نے پہلے بلا تعیین مطلق احرام باندھا تھا۔ پھر احرام کے بعد اس کی تعیین فرمائی۔ امام شافعیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے۔ اور علامہ قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں: "آپ کے احرام میں علماء کے چھ قول ہیں۔ مذکورہ پانچ اقوال کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "چھٹا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام بیک وقت باندھا"۔ ابن قیمؒ نے اس کو اوہام میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی قول مختار ہے۔ "الہدی" میں اس کو ثابت کیا ہے اور اس کے مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے جب احرام باندھا تو حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ اور جب احرام کھولا تو دونوں کا بیک وقت کھولا۔ چنانچہ اس کی دلیل وہ مشہور روایات ہیں جو اس مضمون میں متواتر ہیں۔ اور اس تواتر کو علماء حدیث جانتے ہیں۔ ابن حزم بھی اس کی طرف مائل ہیں۔ اور باقی احادیث میں تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوجز میں ہے۔ (ش)۔

۵ حافظ عینیؒ فرماتے ہیں کہ "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ عمرہ پر حج کا داخل کرنا جائز ہے اور اس کے عکس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور قول قدیم میں امام شافعیؒ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ اور دیگر علماء نے اس کو ممنوع کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ مگر

خصوصیت کا دعویٰ محتاج دلیل ہے"۔

حج پر عمرہ کا احرام باندھنے کا حکم حج پر عمرہ کا اور عمرہ پر حج کا احرام باندھنا، دو حجوں کا احرام باندھنا، یا دو عمروں کا احرام باندھنا ان چار مسائل میں ائمہ کے اختلاف پر اوجز میں مفصل کلام کیا ہے۔ تفصیل کا شوق ہو تو وہاں دیکھو۔ بحث کے آخر میں لکھا ہے:" محققین شافعیہ و مالکیہ مثلاً نوویؒ، قاضی عیاضؒ اور ان کے متبعین پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج پر عمرہ کا داخل کرنا جب ان کے نزدیک جائز نہیں تو انہوں نے اس قول کو کیسے راجح قرار دے دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً حج کا احرام باندھا اور اس کے بعد اس پر عمرہ داخل کر لیا الخ"۔

افراد و تمتع کی روایات کا جواب شیخ ابن قیمؒ نے روایاتِ افراد کا یہ جواب دیا ہے کہ جن حضرات سے افراد کی روایات مروی ہیں ان سے قران کی روایات بھی مروی ہیں۔ نیز یہ روایتِ افراد تین معانی کے لئے محتمل ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے حج مفرد کا احرام باندھا۔ دوم یہ کہ صرف حج کے افعال ادا کئے۔ سوم یہ کہ آپؐ نے صرف ایک حج کیا، اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور عمرے چار کئے۔ عمرہ حدیبیہ ۶ھ میں۔ عمرہ القضاء ۷ھ میں۔ عمرہ جعرانہ ۸ھ میں اور حج کے ساتھ ۱۰ھ میں۔ اس کے بعد قران کی روایات کو دس وجوہ سے بلکہ پندرہ وجوہ سے ترجیح دی ہے۔ میرے نزدیک سب سے عمدہ وجہ یہ ہے کہ افراد کی روایات میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے۔ مگر قران کی روایات ایسی صریح ہیں کہ ان میں قران کے سوا کوئی دوسری تاویل نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے بھی عمدہ وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قران ہی کا حکم ہوا تھا۔ اس لئے آپ اس سے عدول نہیں کر سکتے تھے۔ علامہ قسطلانی نے مواہب میں تمتع کی روایات کا یہ جواب دیا ہے کہ" اس سے مراد تمتع لغوی ہے یعنی ایام حج میں عمرہ کا نفع حاصل کرنا (اور یہ قران پر بھی صادق آتا ہے) یا آپ کی طرف نسبت مجازی ہے جیسا کہ رجم کی نسبت آپؐ کی طرف کی گئی"۔ اھ مختصراً روایات تمتع کے یہی دو جواب صاحب سفر السعادۃ نے دیئے ہیں۔ اور پہلا جواب نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے۔

(قال) ولبّد رسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه

ترجمہ۔ (ق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی (یعنی بالوں کو چپکا لیا)

تلبید کا حکم اور اس کا وقت

(ق) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر مبارک کی تلبید کی (یعنی بالوں کو چپکا لیا) "الہدیٰ" اور "مراۃ الحرمین" میں بھی اسی طرح ہے۔ ان دونوں کتابوں کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلبید احرام کے بعد ہوئی، میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ تلبید احرام سے پہلے تیل اور خوشبو استعمال کرتے وقت ہوئی، حافظ ابن حجر اور حافظ عینی کا میلان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات امام بخاری کے قول "باب من اھل ملبّدًا" کے تحت لکھتے ہیں "یعنی جس نے تلبید کی حالت میں احرام باندھا" اور امام بخاری کا میلان بھی اسی جانب ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس باب سے پہلے "باب الطیب عند الاحرام" ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعد "باب الاھلال عند مسجد ذی الحلیفہ" ذکر کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح نوویؒ کا قول ہے۔ چنانچہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث: "تلبید کی حالت میں احرام باندھتے تھے" کے ذیل میں لکھتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ احرام سے پہلے سر کی تلبید مستحب ہے، اور امام شافعیؒ اور ہمارے اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے"۔ بذل المجہود میں مجمع البحار سے نقل کیا ہے کہ تلبید کے معنی یہ ہیں کہ احرام کے وقت سر کے بالوں میں گوند جیسی کوئی چیز لگائی جائے تاکہ بال پراگندہ نہ ہوں اور ان میں جوئیں نہ پڑیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دیر تک احرام کی حالت میں رہنے کے باوجود محفوظ رہیں۔ اوجز میں دو جگہ تلبید اور اس کے احکام اور متعلقات پر مفصل کلام کیا ہے۔ ایک "باب الطیب" میں اور دوسرے "باب التلبیہ" میں۔ اس میں ہے کہ تلبید شافعیہ کے نزدیک سنت ہے جیسا کہ تمام شراح حدیث نے نقل کیا ہے۔ اور کتب شافعیہ میں بھی اس کی تصریح ہے۔ خواہ تلبید کسی جسم والی چیز سے ہو جس سے سر ڈھک جائے۔ اور جمہور نے تلبید کو مطلقاً مستحباتِ احرام میں شمار نہیں کیا، البتہ شیخ ابن ہمامؒ نے رشید الدین سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس کو بہتر کہا ہے۔ اور غنیہ میں ہے کہ خطمی وغیرہ کے ساتھ سر کے بالوں کو چپکا لینا اچھا ہے۔ لیکن تلبید ایسی معمولی ہو کہ اس سے سر نہ ڈھک جائے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبید کو اسی پر محمول کرنا چاہیئے"۔

میرے بذل المجہود کے حاشیہ میں ہے کہ "میں نے شافعیہ کے سوا کسی کو نہیں پایا کہ اس نے اس مسئلہ میں اختلاف ائمہ پر مبسوط کلام کیا ہو، مالکی و حنبلی کتابیں اس سے خاموش ہیں۔ البتہ صاحب کمال نے ذکر کیا ہے کہ

یہ سنت ہے، اور ابن قیمؒ نے "الہدیٰ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبید کا ذکر کیا ہے مگر اس کا حکم ذکر نہیں کیا۔ اور ہمارے احناف نے اس کو جنایات میں ذکر کیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، صاحب منہل فرماتے ہیں: "اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ محرم کے لئے بالوں کی تلبید مستحب ہے کیونکہ اس میں اس کے لئے آسانی ہے۔ بال پریشان نہیں ہوں گے اور دیگر تکلیفات سے محفوظ رہیں گے۔ خصوصاً جس کے احرام کی مدت لمبی ہو۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب اور امام احمدؒ اس کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح حنفیہ و مالکیہ بھی اس کے قائل ہیں جب کہ تلبید معمولی ہو جس سے سر نہ ڈھکے، لیکن ایسی زیادہ تلبید جس سے چوتھائی سر یا زیادہ ڈھک جائے وہ حرام ہے اگر اسے پورا دن یا اس سے زیادہ مدت رہنے دیا تو دم واجب ہوگا، اور ایک دن رات سے کم ہو تو اس میں صدقۂ فطر کی مقدار صدقہ واجب ہوگا۔ یہ مرد کا حکم ہے اور عورت کے لئے احرام میں سر ڈھانکنا ممنوع نہیں۔" اھ صاحب منہل نے ائمہ اربعہ کا جو مذہب نقل کیا ہے۔ وہ مجھے ان کے فروع فقہی کتابوں میں نہیں ملا۔

حدیث تلبید اور حدیث الشعث میں تطبیق

پھر تلبید پر یہ اشکال ہوگا، کہ حدیث میں آتا ہے کہ "حاجی تو وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے اور بدن میلا کچیلا ہو۔" شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ تلبید میں بظاہر اس حدیث کی مخالفت ہے جس میں فرمایا کہ حاجی وہ ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور بدن میلا کچیلا ہو۔ میں کہتا ہوں قطعاً کوئی منافات نہیں کیونکہ بالوں کے بکھرے ہونے سے مراد ترک زینت ہے اور تلبید زینت نہیں بلکہ بالوں کے بکھرنے سے جو اذیت ہو سکتی ہے اس کا دفع کرنا مقصود ہے۔" اھ میں کہتا ہوں کہ امام بیہقی نے اس طرف اشارہ کیا ہے، کہ حدیث شعث احرام کے بعد کی حالت پر محمول ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "اس بات کا بیان کہ حاجی پراگندہ سر اور غبار آلود ہوتا ہے پس احرام کے بعد سر اور ڈاڑھی کو تیل نہ لگائے۔" اس توجیہ کے مطابق احرام سے پہلے تلبید کرنا اس کے خلاف نہیں جیسا کہ احرام سے پہلے تیل لگانا اس کے خلاف نہیں۔ عارف گنگوہی قدس سرہٗ نے "الکوکب" میں اس پر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ یہ حدیث جس میں حاجی کے بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میلا کچیلا ہونے کا ذکر ہے اس سے مقصود مدت احرام کا لمبا ہونا ہے، ظاہر ہے کہ احرام کی مدت جس قدر طویل ہوگی بالوں کے بکھرنے اور بدن کے میل کچیل کی مدت بھی اتنی لمبی ہوگی۔ اور یہ دونوں چیزیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر ثواب میں اضافہ ہوگا۔

بالغسل ثم اهل رسول الله صلے الله علیه وسلم بمصلاه ثم لما رکب علی ناقته

ترجمہ: غسل کے ساتھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا پھر جب اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے۔

(آپ نے) غسل کے ساتھ تلبید کی تھی (غسل: بکسر غین وسکون سین۔ خطمی وغیرہ جس سے سر دھو کر بالوں کو چپکا لیا جائے تاکہ کھلنے سے محفوظ رہیں۔ ایک روایت میں "العسل" عین اور سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ جیساکہ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے۔ نیز حافظ ابن حجر اور حافظ عینی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ حافظ عینی نے ابن الصلاح سے نقل کیا ہے کہ روایت عین مہملہ کے ساتھ ضبط نہیں کی گئی۔ سفر السعادہ کی شرح میں ہے کہ "یہ تصحیف ہے اور نہایت بعید ہے" اور اگر یہ صحیح ہو تو اس کو عرفط کے گوند پر محمول کیا جائے گا۔" تفصیل بذل میں ہے۔ شیخ قدس سرہ بذل میں فرماتے ہیں۔ کہ "سر میں شہد (عسل) لگانا بعید بات ہے۔ خصوصاً حضرت سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تو لطافت و نظافت میں تمام انسانوں کے امام تھے، آپ کے حق میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" الخ

اوجز میں ہے کہ تلبید میں اگر خوشبو نہ ہو تو اس سے حنفیہ کے نزدیک ایک دم واجب ہوتا ہے۔ اور جب اس میں خوشبو بھی ہو تو دو دم واجب ہوں گے۔ ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا کہ حدیث تلبید لغوی پر محمول ہے یعنی بالوں کا سمیٹنا اور جمع کرنا۔ نیز وہ فرماتے ہیں، کہ شاید آپؐ کو کوئی عذر ہوگا۔ اور یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کے ساتھ سر کی تلبید کی۔" اسکے ذیل میں ملا علی قاری کہتے ہیں کہ: "اس میں اس امر پر کوئی دلالت نہیں کہ یہ تلبید احرام سے پہلے کی تھی" یعنی حدیث غسل میں احرام یا حج کا ذکر نہیں۔ اور مقدسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسی مناسب تلبید پر محمول کرنا چاہیئے۔ جس سے سر نہیں ڈھکتا۔ کذا فی الشامی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس وقت احرام باندھا

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز کی جگہ تلبیہ پڑھا یعنی نماز کے بعد جیساکہ اس سے پہلے مفصل گذر چکا ہے۔ پھر جب اپنی ناقہ قصوا پر سوار ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بزار کی یہ روایت کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے مدینہ سے مکہ تک پیدل حج کیا تھا" منکر اور ضعیف الاسناد

ثم لما استقلت به على البيداء۔ وكان يهل بالحج والعمرة تارةً وبالحج تارة

ترجمہ: پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر بیداء کی بلندی پر چڑھی، اور آپ کبھی تو حج و عمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا۔

ہے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قصوا عضباء اور جدعاء ایک ہی ناقہ تھی یا الگ الگ؟ نووی نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ان کا میلان اس طرف ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ناقہ کے مختلف نام ہیں۔ اور انہوں نے یہ قول محمد بن ابراہیم تیمی تابعی وغیرہ سے نقل کیا ہے، اور ابن قتیبہ سے نقل کیا ہے کہ یہ تین اونٹنیاں تھیں۔ امام بخاری کا میلان پہلے قول کی طرف ہے۔ جیسا کہ حاشیۂ لامع میں کتاب المغازی میں اس پر بہت ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر بیداء کی بلندی پر چڑھی (اس وقت بھی تلبیہ پڑھا) (ش) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پڑھنے کی جگہ کی تعیین میں جو مختلف روایات مروی ہیں ان میں یہی تطبیق ہے، اور یہ تطبیق حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے، جسے امام ابوداؤد، طحاوی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے، اور امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ آئمہ اربعہ بلکہ ائمہ ستہ اور ان کے اصحاب کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ حافظ عینیؒ نے نقل کیا ہے۔ لیکن ابی نے "الاکمال" میں امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سوار اس وقت تلبیہ کہے جب اس کی سواری اٹھے، اور پیدل اس وقت کہے جب چلنے لگے۔ سوار کے مسئلہ میں امام شافعیؒ ان کے موافق ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دونوں جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو تلبیہ پڑھیں۔ اوجز میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ اور اس میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ تینوں صورتوں کی گنجائش ہے کیونکہ تینوں صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ البتہ بہتر ہے کہ تلبیہ نماز کے فوراً بعد ہو۔

اور آپ کبھی تو حج و عمرہ دونوں کا تلبیہ کہتے تھے اور کبھی صرف حج کا "الہدی" میں صرف ان دونوں صورتوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اور صاحب مرآۃ نے اسی کی پیروی کی ہے۔ بظاہر اس کے بعد یہ بھی کہنا چاہیئے "اور کبھی صرف عمرہ کا" عجیب بات یہ ہے کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس صورت کو ذکر نہیں کیا۔ اور اوہام احرام میں اس شخص کا مذہب بھی ذکر کیا ہے جس کا قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عمرہ کا تلبیہ کہا اور اسی پر قائم رہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ موصوف نے اس صورت کا انکار کیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ کوکب میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک میں راویوں کا

وکان الاهلال بعد الظھر۔

ترجمہ: اور آپؐ نے ظہر کے بعد احرام باندھا تھا۔

جو اختلاف ہے کہ آپؐ نے صرف حج کا احرام باندھا تھا؟ یا حج و عمرہ دونوں؟ یا پہلے عمرہ کا احرام تھا پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا؟ ـــــــــــ اس اختلاف" کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ کے الفاظ مختلف تھے۔ کبھی صرف حج کا تلبیہ کہتے تھے، کبھی حج و عمرہ دونوں کا، اور کبھی صرف عمرہ کا۔ جس نے جیسا سنا ویسا نقل کر دیا" مگر الہدیٰ" کی عبارت سے اس پر اشکال ہو گا چنانچہ اس میں کہا ہے کہ "کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپؐ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا، یا صرف عمرہ کا تلبیہ پڑھا۔ یا صرف عمرہ ادا کیا" الخ" الہدیٰ" کی یہ عبارت بہت ہی مشکل ہے۔ جیسا کہ ابھی گذرا۔ نیز اوجز حاشیہ کی چوتھی قسم میں ان لوگوں کا قول ذکر کیا ہے" جو کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا، پھر اس پر حج کا احرام داخل کر لیا تھا، اور اس قول کی تائید میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث، جو صحیحین میں مروی ہے، ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا" اور ظاہر ہے کہ جو شخص عمرہ کا احرام باندھے وہ اس کا تلبیہ بھی پڑھے گا۔ شیخ قدس سرہ کے کلام کی تائید ملا علی قاری کے قول سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے مرقاۃ میں حدیث "فمنا من اہل بحج وعمرۃ" کے تحت ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں" احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قارن ہوں اور آپؐ کبھی حج کا تلبیہ کہتے ہوں، کبھی عمرہ کا اور کبھی حج و عمرہ دونوں کا' اور ہر ایک نے جو سنا بیان کر دیا" اور اوجز میں بحر سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، صاحب بحر فرماتے ہیں کہ" ہمارے ائمہ نے مختلف روایات میں یہی تطبیق ذکر کی ہے" اور یہی تطبیق ابن ہمام نے ذکر کی ہے۔ نیز اس کی تائید امام طحاویؒ کے اس قول سے ہوتی ہے جو حاشیۂ کوکب میں بذل سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ" ہو سکتا ہے کہ یہ حج مفرد (کا تلبیہ) عمرہ مفردہ (کے تلبیہ) کے بعد ہوا ہو، وہ اس طرح کہ آپؐ نے پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھا ہو جیسا کہ قاسم اور محمد بن عبدالرحمٰن عن عروہ کی حدیث میں ہے' بعد ازاں حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ یہ تاویل اس بنا پر ضروری ہے تاکہ یہ تمام روایات متحد و متفق ہو جائیں" انتہیٰ اور ان تمام دلائل میں قوی تر دلیل ابن عباسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا احرام باندھا، اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے حج کا" اور آپؐ نے ظہر سے قبل نہیں بلکہ ظہر کے بعد احرام باندھا۔

وکان حجہ علی رحل۔

اور آپ کا حج پالان پر ہوا

جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے اور ابن حزم کو وہم ہوا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے ظہر سے ذرا پہلے احرام باندھا تھا۔ الہدیٰ میں تو اسی طرح ہے اور ہمارے شیخ المشائخ حضرت گنگوہی قدس سرہ کوکب میں حدیث "اہل دبر الصلوٰۃ" کے تحت فرماتے ہیں "یہ نفل نماز ہے۔ اگر صرف فرض پر اکتفار کیا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن بہتر نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نفل نماز چاشت کے وقت پڑھی تھی۔ آپ نماز فجر پڑھ کر انتظار میں بیٹھے رہے، جب سورج طلوع ہوا تو غسل فرمایا اور احرام باندھا" میں کہتا ہوں اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو پہلے گذر چکی ہے۔ "کہ آپ نے صبح کی نماز ادا کی پھر سوار ہوئے"۔

اور آپ کا حج پالان پر ہوا۔ امام بخاری نے اس پر یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے" باب الحج علی الرحل" حافظ فرماتے ہیں "رَحل بفتح راء و سکون حائے مہملہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جس طرح کہ گھوڑے کیلئے زین ہوتی ہے، مصنف اس ترجمہ سے اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ حج میں سادگی تنعم سے افضل ہے۔ تنعم نہ محمل میں ہو نہ کجاوے میں، نہ عماریہ میں" میں کہتا ہوں کہ مرآۃ کے حاشیہ میں ہے کہ "محمل بروزن مجلس اونٹ کے کجاوے کی دونوں جانبوں کو کہتے ہیں۔ جن میں دونوں طرف آدمی سوار ہوں، اور ہودج: عورتوں کی سواری جس پر قبہ بنا ہوا ہو، اور عماریہ ہودج کو کہتے ہیں"۔

محرم کا ہودج میں سوار ہونا اور سائے میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

اور کیا محرم کے لئے ہودج وغیرہ میں سوار ہونا جائز ہے؟ اس میں امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جائز ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے، دوم یہ کہ جائز نہیں اور یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے۔ تفصیل اوجز میں ہے۔ نیز بذل کے "باب المحرم یظلل" میں بھی ہے۔ شیخ ابن قیمؒ اس محرم کے قصہ میں، جس کا عرفہ میں انتقال ہوا تھا فرماتے ہیں کہ محرم کے لئے سر ڈھانکنا ممنوع ہے۔ اور اس کے تین درجے ہیں، ایک بالاتفاق ممنوع ہے، دوسرا بالاتفاق جائز ہے اور تیسرا مختلف فیہ ہے، اول درجہ میں ہر وہ چیز ہے جو سر سے متصل اور ملابس ہو اور جو سر ڈھانکنے کے لئے مقصود ہو، جیسے عمامہ وغیرہ۔ دوسرے درجہ میں خیمہ، مکان اور درخت وغیرہ ہیں، البتہ امام مالکؒ کے نزدیک محرم کیلئے یہ ممنوع ہے کہ درخت پر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرے۔ اور اکثر علماء کو ان سے اتفاق نہیں۔ تیسرا درجہ محمل اور ہودج کا ہے، اس میں امام احمدؒ کے تین قول ہیں۔ اول:

(قلت) وقال اللهم اجعله حجا لا رياء فيه ولا سمعة (قال) وخيرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم بين الانساك الثلاثة عند الاحرام وولدت اسماء محمد بن ابی بكر (قلت) واتاه جبريل فامره ان يأمر اصحابه برفع الاصوات

ترجمہ: (ش) اور آپؐ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ نہ ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں جس قسم کا چاہیں احرام باندھ لیں۔ اور اسماء کے بطن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔

(ش) اور حضرت جبریل علیہ السلام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔

جواز۔ یہ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ ممنوع ہے۔ اور اگر اس نے اس کا ارتکاب کیا تو فدیہ دے۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔ سوم یہ کہ ممنوع ہے لیکن اگر اس کا ارتکاب کیا تو فدیہ واجب نہیں۔ اھ

(ش) اور آپؐ نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں ریا و سمعہ نہ ہو۔ جیسا کہ شمائل میں ہے۔ اور اسی کی مثل فتح اور البدایہ والنہایہ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو تینوں مناسک کا اختیار دیا

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے کے وقت صحابہ کو اختیار دیا کہ وہ حج کی تینوں اقسام میں سے جس قسم کا چاہیں احرام باندھ لیں۔ پھر مکہ کے قریب پہنچے تو جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں تھے آپؐ نے ان کو ترغیب دی کہ وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لیں، پھر مروہ کے پاس اس کا قطعی حکم فرمایا۔

محمدؓ بن ابی بکر کی ولادت

اور ذوالحلیفہ میں حضرت اسماء بنت عمیس زوجہ ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بطن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے پس (انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معرفت مسئلہ دریافت کیا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا کہ غسل کر کے احرام باندھ لیں۔ ان کے اس قصہ میں بہت سے مسائل ہیں۔ ان میں سے شیخ ابن قیمؒ نے تین مسائل ذکر کئے ہیں۔ اول: محرم کا غسل کرنا۔ دوم یہ کہ حائضہ بھی احرام کے لئے غسل کرے۔ سوم یہ کہ حائضہ کا احرام صحیح ہے۔

حائضہ کا احرام کیلئے غسل کرنا

حیض و نفاس والی عورت کا احرام کیلئے غسل کرنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے، مگر ابن حزم کے نزدیک فرض ہے کما فی العینی۔

بآواز بلند تلبیہ کہنے کا حکم

(ش) اور حضرت جبریل علیہ السلام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپؐ اپنے صحابہ کو آوازیں بلند کرنے کا حکم فرمائیں۔ یہ بات ابن

(قال) ثم سار يلبي

ترجمہ (ق) پھر تلبیہ کہتے ہوئے چلے۔

عربی نے کہی ہے اور اس سلسلہ میں روایت مشہور ہے امام مالک خلاد بن سائب سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے پس انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے صحابہ کو ۔۔۔ یا فرمایا اپنے ساتھیوں کو ۔۔۔ حکم کروں کہ وہ تلبیہ میں اپنی آوازیں بلند کریں۔" اوجز میں اس حدیث پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس میں آپ کے ارشاد کہ "میں اپنے صحابہ کو حکم کروں" کے تحت ذکر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ حکم استحباب کے لئے ہے اور ظاہریہ کے نزدیک یہ حکم وجوب کے لئے ہے۔ اور بآواز بلند تلبیہ کہنے میں ائمہ کے اختلاف کی تفصیل بھی اوجز میں مذکور ہے۔ خلاصہ یہ کہ امام ابو حنیفہ اور قول جدید میں امام شافعی کے نزدیک بلند آواز سے تلبیہ کہنا مستحب ہے۔ اور ان کا قول قدیم یہ ہے کہ مسجد جماعت میں بلند آواز سے تلبیہ نہ کہا جائے، البتہ مسجد حرام، مسجد منیٰ اور مسجد عرفہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور امام مالک سے اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں۔ ابن قاسم کی روایت ہے کہ مسجد حرام اور مسجد منیٰ کے سوا آواز بلند نہ کی جائے۔ ابن رشد فرماتے ہیں: "اہل علم کا اجماع ہے کہ عورت کا تلبیہ یہ ہے کہ اس کی آواز صرف اپنے آپ کو سنائی دے۔" اسی طرح ظاہریہ کے نزدیک بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے وجوب کو بہت سے ناقلین مذاہب نے ذکر کیا ہے۔

تلبیہ کے الفاظ زبان سے کہنا ضروری ہے یا نہیں؟

حنفیہ نے اس حدیث سے ایک اور اختلافی مسئلہ پر استدلال کیا ہے، وہ یہ کہ احرام کے وقت تلبیہ کے الفاظ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے، چنانچہ اوجز میں مغنی سے نقل کیا ہے کہ آدمی کے لئے احرام کے الفاظ کو زبان سے ادا کرنا مستحب ہے تاکہ التباس نہ رہے اگر زبان سے ادا نہیں کیا بلکہ صرف نیت پر کفایت کی تو بھی امام احمد، امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک کافی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں صرف نیت کافی نہیں جب تک کہ نیت کے ساتھ تلبیہ کے الفاظ زبان سے ادا نہ کئے جائیں یا اس کے بجائے ہدی کے جانوروں کو ہنکایا جائے الخ۔ اور تلبیہ کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوالحلیفہ میں احرام باندھنے کے بیان میں گزر چکا ہے۔

تلبیہ کے الفاظ اور ان میں کمی بیشی کا حکم

(ق) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ کہتے ہوئے چلے۔ آپ کا تلبیہ معروف ہے یعنی لبیک اللھم لبیک لبیک

(قلت) واحتجم علیٰ ظہر القدم بملل

ترجمہ: (ش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مَلَل میں اپنے قدم کی پشت پر پچھنے لگوائے۔

لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لا شریک لک۔ آپ کے تلبیہ کی روایات صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ اور صحابہؓ ان الفاظ سے کمی بیشی کرتے رہتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پر زیادتی جائز ہے یا مکروہ ہے؟ اور بعض روایات میں آپ کے معروف تلبیہ سے کچھ زائد الفاظ بھی مروی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ملل میں پچھنے لگوانا

(ش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملل میں اپنے قدم کی پشت پر پچھنے لگوائے، ملا علی قاری شرح شمائل میں فرماتے ہیں: مَلَل: بفتح میم ولام اولیٰ، مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ طیبہ سے سترہ میل ہے، جیسا کہ اوجز میں ہے اور مرقاۃ کے حاشیہ میں ہے کہ یہ مدینہ سے ایک رات کی مسافت پر ہے، عز بن محمد رابع نے اپنے مقالہ میں جس کا ذکر ذوالحلیفہ میں گزر چکا ہے ذکر کیا ہے کہ یہ مقام آجکل بھی اسی نام سے معروف ہے۔ مگر منزل نہیں۔ اھ اور معجم البلدان میں ہے "یہ مدینہ سے ۲۸ میل پر مکہ و مدینہ کے درمیان میں ایک منزل ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ملل اور مدینہ کے درمیان دو دن کی مسافت ہے۔ اس کو ملل اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ چلنے والا مدینہ سے چل کر وہاں مشقت اور تھکن کے بعد ہی پہنچ سکتا ہے"۔

اور ملا علی قاری کے قول اور صاحب معجم البلدان کے قول میں اختلاف کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف راستے ہوتے تھے، چنانچہ آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ پہاڑی راستوں میں اگر پہاڑ کے اوپر سے جائیں تو راستہ لانبا ہو جاتا ہے اور اگر پہاڑ کے دامن سے گذر جائیں تو راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سفر میں پچھنے لگوائے تھے یا کسی عمرہ کے سفر میں؟ دونوں کا احتمال ہے۔ جیسا کہ شرح شمائل میں پچھنے لگوانے کی جگہ اور حصہ بدن کے بارے میں جو مختلف روایات مروی ہیں ان کے مابین تطبیق کی یہی صورت اختیار کی ہے تفصیل اوجز میں ہے۔

محرم کیلئے پچھنے لگوانا جائز ہے یا نہیں

نیز اوجز میں ہے کہ امام ثوری اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ احرام کی حالت میں پچھنے لگوانا مطلقاً جائز ہے، امام

(قال) فلما كانوا بالروحاء

ترجمہ: (ق) پس جب روحا پہنچے

ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، اور امام اسحاق فرماتے ہیں۔ کہ اگر بال نہ کٹیں تو جائز ہے، اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ محرم کے لئے بلا ضرورت احتجام جائز نہیں۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں، موفق ابن قدامہ فرماتے ہیں: "رہی حجامت (یعنی پچھنے لگوانا) سو اگر بال نہ کٹیں تو جمہور کے قول میں بغیر فدیہ کے مباح ہے کیونکہ یہ ایک علاج ہے جس میں خون نکالا جاتا ہے۔ اس لئے فصد کے مشابہ ہے، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بلا ضرورت پچھنے نہ لگوائے" نیز اوجز میں ہے کہ اگر سینگیاں لگانے کیلئے بال کاٹنے کی ضرورت ہو تو کاٹنا جائز ہے۔ چنانچہ عبداللہ ابن بُحَینہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے درمیان سینگیاں لگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی جگہ سے بال صاف کرنے پڑے ہونگے۔ امام مالکؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ کچھ صدقہ کر دے۔ تفصیل اوجز میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری منزل روحاء

پھر جب روحا پہنچے "روحاء" دوسری منزل ہے، اور یہ مدینہ سے دو دن کے فاصلے پر ہے، جیسا کہ حاشیۂ لامع میں ہے۔ بخاری کی حدیث میں اس کا ذکر اُن مساجد کے ضمن میں آیا ہے جو مکہ و مدینہ کے مابین واقع ہیں، حاشیۂ لامع میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اس میں ہے کہ زمخشری کی کتاب الجبال میں ہے کہ مدینہ اور روحاء کے درمیان تین میل کم چار برید کا فاصلہ ہے اور صحیح مسلم میں ۳۶ میل کا فاصلہ مذکور ہے، اس کا نام روحاء اس بنا پر ہے کہ یہ بہت عمدہ اور پُر فضا جگہ ہے، عزیز محمد رابع لکھتے ہیں کہ "یہ آج کل بھی اسی نام سے معروف ہے۔ مگر اس زمانے میں منزل نہیں۔ اور یہ مدینہ سے ۷۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے" اھ۔

ترمذی شریف میں عمرو بن عوف کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادیٔ روحاء میں نماز پڑھی اور فرمایا کہ اس مسجد میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔ کذا فی الفتح۔ وفاء الوفاء میں "مسجد عرق الظبیۃ" کے بیان میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بدر سے جہاد کا مشورہ اسی مسجد میں فرمایا تھا۔ یہ روحاء سے دو میل اِدھر ہے۔ اسی کتاب میں اس کے بعد مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے پہلے یہاں ستر انبیاء نے نماز پڑھی ہے۔ صلوات اللہ وسلامہ

رأى حمار وحش عقيرًا - ثم مضى حتى اذا كان بالاثاية

ترجمہ: تو ایک حمار وحشی دیکھا، جو زخمی تھا، پھر آپ چلے یہاں تک کہ جب "اثایہ" پہنچے

علیھم اجمعین" اس مسجد اور موضع کو اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

تو ایک حمار وحشی دیکھا۔ یہاں طبری کو وہم ہوا ہے کہ یہ حمار وحشی حضرت ابو قتادہؓ نے شکار کیا تھا۔ حالانکہ ابو قتادہؓ کے شکار کا واقعہ عمرۂ حدیبیہ کا ہے۔ کذا فی الهدی۔ غالباً وہم کا منشاد بخاری کی روایت ہے جس میں "حاجًا" کا لفظ ہے۔ حافظؒ نے اس کو ذکر کر کے یہ جواب دیا ہے کہ یہ مجاز ہے اور عینیؒ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ شیخ ابن ہمامؒ اس طرف مائل ہیں کہ یہ سفر حج کا واقعہ ہے۔ صاحب "وفا" نے حمار کا قصہ مقام عرج میں ذکر کیا ہے۔ جو زخمی تھا۔ آپؐ نے فرمایا اسے رہنے دو عنقریب اس کا مالک آئے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد قبیلہ بہز کا ایک شخص آیا جس نے اسے زخمی کیا تھا۔ اس نے عرض یا رسول اللہ! اس حمار کو آپ جو چاہیں کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اور انہوں نے وہ تقسیم کر دیا۔ بہزی کی یہ حدیث امام مالکؒ نے مؤطا میں انہی الفاظ میں۔ اور امام مالک کی سند سے نسائیؒ نے بھی روایت کی ہے، امام طحاوی نے اس کو کئی سندوں سے روایت کیا ہے، ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: بہزی آیا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ میرا شکار ہے اسے کھاؤ، پس آپؐ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا الخ" اور وفاء الوفاء میں جو ہے کہ "ایک بہز کا آدمی آیا" غالباً یہ تحریف ناقل ہے، اس حدیث کے مختلف طرق اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ اور ایک حمار وحشی کا قصہ صعب بن جثامہؓ کی حدیث میں عنقریب آتا ہے۔ نیز محرم کو شکار کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف بھی آگے آتا ہے۔

تیسری منزل اثایہ

پھر آپؐ چلے یہاں تک کہ جب "اثایہ" پہنچے۔ "اثایہ" تیسری منزل ہے۔ اور بخاری کی حدیث المساجد سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تیسری منزل رویثہ ہے۔ صاحب وفاء نے "اثایہ" کو "رویثہ" کے بعد ذکر کیا ہے، اور "الهدی" میں ہے کہ "اثایہ"، رویثہ اور "عرج" کے درمیان ہے، اور مؤطا کی روایت میں بھی اسی طرح ہے، حموی نے اس کا ضبط خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں اختلاف نقل کیا ہے کہ یہ یاءٔ کیساتھ (اثایہ) ہے یا ثا کیساتھ (اثاثہ) ہے یا نون کے ساتھ اثانہ ہے؟ نون کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ صحیح اول ہے یعنی یا کے ساتھ اثایہ۔ مرآۃ میں ہے

اذا ظبی حاقف۔

ترجمہ: "تو دیکھا کہ ایک ہرن ریت کے ٹیلے میں بیٹھا ہے۔"

کہ ہمزہ پر تینوں حرکتیں صحیح ہیں۔ اور معجم البلدان سے نقل کیا ہے کہ یہ جحفہ کے راستے میں ایک جگہ ہے، مدینہ سے اس کا فاصلہ ۱۵ فرسخ (۴۵ میل) ہے لیکن معجم کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں ۲۵ فرسخ (۷۵ میل) مذکور ہے۔ اس کی تائید محلی کی عبارت سے بھی ہوتی ہے جو اوجز میں نقل کی ہے کہ "یہ ایک جگہ کا نام ہے جو جحفہ کے راستے میں مدینہ سے ۷۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے" اھ اور حاشیۂ بخاری میں ہے کہ رویثہ اور روحاء کے درمیان ۱۴ میل کا فاصلہ ہے۔ عزیز محمد رابع نے لکھا ہے کہ "یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ آجکل اس کا نام کیا ہے" اھ

زخمی ہرن کا واقعہ تو دیکھا کہ ایک ہرن ریت کے ٹیلے کے سائے میں بیٹھا ہے۔ اور اس میں تیر پیوست ہے، آپ نے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ اس کے پاس کھڑا رہے تاکہ کوئی شخص اس سے تعرض نہ کرے یہاں تک کہ تمام رفقاء یہاں سے گذر جائیں۔ اس ہرن کے اور گذشتہ بالا حمار وحشی کے درمیان فرق یہ ہے، کہ حمار وحشی کا شکار کرنے والا احرام میں نہیں تھا۔ اس لئے اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا۔ اور اس ہرن کے شکار کنندہ کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ بغیر احرام کے ہے یا نہیں؟ اس لئے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ایک شخص کو وہاں کھڑا کر دیا تاکہ کوئی اس کو پکڑے نہیں۔ کذا فی الہدی۔ اوجز میں ان دونوں کے درمیان وجوہ فرق تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ایک ان میں سے یہی جو الہدی سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں یہ بھی کہ "میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے وہ یہ کہ ہرن زندہ تھا جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے، اور یہ وجہ فرق سب سے بہتر ہے۔ بلکہ یہی متعین ہے۔ باجی نے دونوں کے درمیان دو وجہ سے فرق بیان کیا ہے۔ ایک یہی جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جس شخص نے تیر سے اس ہرن کا شکار کیا تھا وہ اس کا مالک ہو گیا تھا لہذا اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا حق نہیں تھا" اھ

محرم کا شکار حرام ہے اس قصہ میں اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ محرم نے جس شکار کو قتل کیا ہو وہ مردار کی طرح ہے، کیونکہ اگر حلال ہوتا تو اس کی مالیت ساقط نہ ہوتی۔ کذا فی الہدی۔ اوجز میں حق تعالیٰ کے ارشاد "ولا تقتلوا الصید وانتم حرم" سے متعلقہ ابحاث کے ضمن

(قلت) واحتجم على راسه بلحيي جمل۔

ترجمہ (ش) اور اپنے سر پر "لحیی جمل" نامی جگہ میں سینگی لگوائی۔

میں ذکر کیا ہے کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے تعمیم کی خاطر ذبح کے بجائے قتل کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ شکار جس کو محرم قتل کر دے وہ حلال نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو "قتل" کہا ہے اور مقتول کا کھانا جائز نہیں۔ صرف مذبوح کا کھانا حلال ہے۔ اور جس کو ذبح کیا جائے اسے مقتول نہیں کہتے"۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھئے۔

لحیی جمل میں سینگی لگوانا

(ش) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر اور ابن بحینہ کی حدیث میں ہے: "سر کے درمیان" یہ سینگی لگانے کی جگہ کا بیان ہے کیونکہ وہ مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی ہے اور سر میں سب سے سخت ہوتی ہے۔ لحیی جمل نامی جگہ میں سینگی لگوائی۔ لحیی: بفتح لام وسکون حائے مہملہ ویائے مفتوحہ ویائے ساکنہ بلفظ تثنیہ اور جمل: بفتح جیم و میم یہ مکہ کے راستے میں ایک جگہ کا نام ہے، جیسا کہ موطا امام مالک کی روایت میں ہے۔ موطا امام محمد کے لفظ یہ ہیں کہ "مکہ کے راستے میں ایک جگہ میں جس کو لحیی جمل کہا جاتا ہے"۔ میرک فرماتے ہیں: "لحیی جمل" بعض روایات میں بلفظ تثنیہ ہے، اور بعض میں بلفظ مفرد۔ لام مفتوح ہے۔ اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے۔ اور حا ساکن ہے۔ بغوی نے اس کو اپنی معجم میں اسم عقیق کے ذیل میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ وہ بئر جمل ہے جس کا تذکرہ ابوجہیم کی تیمم والی حدیث میں آیا ہے۔ ابن وضاح وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ جحفہ کے بعد سقیا سے سات میل کے فاصلہ پر ایک معروف جگہ ہے۔ کذا فی الاوجز۔ اور معجم میں ہے کہ لحیی جمل کئی جگہوں کا نام ہے پھر ان کی تفصیل ذکر کی ہے۔ یہ جگہ مکہ مدینہ کے درمیان ہے اور مدینہ سے قریب تر ہے۔ کذا فی المعجم والفتح والعینی۔

بعض کا خیال ہے کہ لحیی جمل سے مراد وہ آلہ ہے جس سے سینگی لگائی جاتی ہے۔ یعنی اونٹ کے دونوں جبڑوں کی ہڈی سے احتجام کیا۔ معجم میں ہے: لحیی جمل ہر جبڑے والے جانور کی دو ہڈیاں جن میں دانت ہوتے ہیں۔ جمع لحی" اھ اوجز میں ہے: یہاں آلہ مراد لینا وہم ہے اور پہلے معنی ہی متعین ہیں۔ یعنی یہ جگہ کا نام ہے۔ جیسا کہ موطا مالک، موطا محمد، بخاری شریف اور دیگر کتابوں میں اس کی

(قال) ثم سار حتی نزل بالعرج - وكانت زاملته وزاملة ابی بكر واحدة

ترجمہ: (ق) پھر چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش ہوئے - اور آپؐ کی اور ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی -

---

تصریح موجود ہے - حازمی فرماتے ہیں کہ وسط سر میں احتجام کا واقعہ حجۃ الوداع کا ہے - کذا فی الاوجز
اور محرم کے سینگی لگوانے کا حکم قریب ہی گذرا ہے - جہاں "ملل" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کی پشت پر سینگی لگوانے کا ذکر ہوا -

چوتھی منزل العرج

(ق) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ "عرج" میں فروکش ہوئے - "عرج" کا ذکر بخاری شریف کے باب المساجد میں ہے، بخاری کے حاشیہ میں عینی سے نقل کیا ہے کہ یہ بفتح عین و بسکون را ہے اس کے بعد جیم ہے - مکہ اور مدینہ کے راستے میں ایک بڑی بستی ہے" انتہی - یہ چوتھی منزل ہے - اس کے اور رویثہ کے درمیان ۱۴ میل کا فاصلہ ہے، یہ اس عرج کے علاوہ ہے جو طائف کے پاس ہے - کذا فی معجم البلدان - پوری بحث تلخیص بذل میں ہے - یاقوت حموی نے اس نام کی کئی جگہیں ذکر کی ہیں منجملہ ان کے ایک یہی ہے جو حرمین کے درمیان ہے - اور ایک طائف کے علاقہ میں ہے - نیز ایک یمن کے شہر کا نام ہے - اور اسکی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا سامان ایک ہی اونٹنی پر تھا

اور آپؐ کی اور ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی حاشیہ مرآۃ میں ہے کہ "زاملہ" وہ اونٹ کہلاتا ہے جس پر غلہ اور سامان لادا جائے - یہ زمل سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں لادنا - اور زمیل وہ شخص کہلاتا ہے جس کا سامان تمہارے سامان کے ساتھ ایک ہی اونٹ پر ہو" اس حدیث پر یہ اشکال ہوگا کہ امام بخاری نے "باب الحج علی الرحل" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر حج کیا، اور وہی آپ کی زاملہ (سامان بردار) تھی، شارحین میں سے کسی نے اس اختلاف سے تعرض نہیں کیا - میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے - کہ یہ مختلف اوقات پر محمول ہے، چنانچہ ابوداؤد کی روایت (جو یہاں متن میں ذکر کی گئی ہے اس) میں تصریح ہے کہ یہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے راستہ کا واقعہ ہے - اور حدیث بخاری سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ سے

فاضلّها غلامہ فطفق ابو بکر یضربہ وقال بعیر واحد تضلہ،

ترجمہ: حضرت ابو بکرؓ کے غلام نے اس کو گم کر دیا۔ پس ابو بکرؓ اسے مارنے لگے۔ اور فرمایا: ایک ہی تو اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا؟

عرفات کے راستہ کا قصہ ہے۔ پہلا سفر چونکہ طویل تھا۔ اس بنا پر بہت سا سامان اور بہت سی ضروریات توشہ وغیرہ ساتھ ہونگی۔ لہٰذا وہ ایک مستقل سواری پر ہونگی۔ اس لئے تمام سامان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامان والی اونٹنی پر تھا۔ لیکن مکہ سے عرفات کا سفر مختصر تھا، اس میں بستر اور سامان وغیرہ کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ اس لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کی اونٹنی پر ہوگا۔ اس کی تائید حضرت جابرؓ کی حدیث طویل سے بھی ہوتی ہے، اس میں مقام عرفہ کے بارے میں یہ لفظ ہیں: "پس جب سورج ڈھلا تو آپ نے قصواء کی تیاری کا حکم دیا چنانچہ اس پر کجاوہ رکھا گیا۔" اور ظاہر یہ ہے کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سامان بھی ہوگا۔ اور اس پر حدیث ابن ماجہ سے اشکال نہیں ہوتا، جو حضرت اسماء سے بایں الفاظ مروی ہے کہ "ہمارے اور ابو بکرؓ کے سامان کے لئے ایک ہی اونٹنی تھی۔ جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے غلام کے پاس تھی" کیونکہ ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی منافات نہیں کہ آنحضرتؐ کا سامان بھی اس پر ہو اور حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سامان بھی، اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ البدایہ والنہایہ میں مسند احمد سے حدیث ابن ماجہ کی مثل روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت ابو بکرؓ کی سامان بردار اونٹنی ایک ہی تھی۔"

حضرت ابو بکرؓ کا غلام کو مارنا

حضرت ابو بکرؓ کے غلام نے اس اونٹنی کو گم کر دیا۔ ابو داؤد کے لفظ یہ ہیں: "ابو بکرؓ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی حضرت ابو بکرؓ کے غلام کے پاس تھی۔ ابو بکرؓ بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ غلام اونٹنی کو لے کر نکلے گا۔ وہ آیا تو اس کے پاس اونٹنی نہیں تھی۔ فرمایا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ عرض کیا کہ وہ تو گذشتہ رات سے گم ہو گیا ہے۔ پس ابو بکرؓ اسے مارنے لگے"۔ شیخ بذل فرماتے ہیں: "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خادم کی گوشمالی، حق تعالیٰ کے ارشاد "ولاجدال فی الحج" کے ضمن میں نہیں آتی، ورنہ ابو بکرؓ کبھی اسکی جرأت نہ کرتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو اس سے منع کر دیتے۔ لیکن آپ کا ارشاد کہ: "ان محرم صاحب کو دیکھو یہ کیا کر رہے ہیں؟" اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ محرم کے لئے یہ بھی مناسب نہیں۔"

اور فرمایا: ایک ہی تو اونٹ تھا تو نے وہ بھی گم کر دیا؟ زرقانی میں ہے کہ فضالہ اسلمیؓ کی آل کو

ثم مضى حتى اذا كان بالابواء

پھر آپؐ چلے یہاں تک کہ جب ابواء پہنچے۔

جب خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے تو حلوے کا ایک ڈبہ لائے اور خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: "آؤ ابوبکرؓ! اللہ تعالیٰ نے عمدہ غذا مہیا فرمادی ہے"۔ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ غلام پر غیظ و غضب کا اظہار فرما رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوبکر بس تسلی پکڑو، کیونکہ معاملہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ ہمارے"۔ اتنے میں حضرت سعد اور ابو قیس ایک سامان بردار اونٹنی، جس پر توشہ تھا، لے کر حاضر ہوئے۔ سعد نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں خبر ملی ہے کہ آپؐ کی سامان بردار اونٹنی گم گئی ہے (لہٰذا اس کے بدلے میں یہ اونٹنی پیش خدمت ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہماری اونٹنی واپس بھیج دی ہے۔ اب تم اپنی اونٹنی لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے"۔

پانچویں منزل ابواء

پھر آپؐ چلے یہاں تک کہ جب ابواء پہنچے۔ ابواء: بفتح الف وسکون با۔ اسکے بعد واؤ اور الف ممدودہ۔ کذا فی المعجم۔ یہ پانچویں منزل ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں: اس کے اور جحفہ کے درمیان ۲۳ میل کا فاصلہ ہے۔" مرآۃ میں بھی اسی طرح ہے، اور اس میں اتنا اور اضافہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان رابغ ہے۔ ابواء مدینہ کی طرف ہے اور جحفہ مکہ کی طرف۔ اور کہا گیا ہے کہ وہاں ایک بلند پہاڑ ہے۔ اسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات ہوئی۔ اور ابواء مدینہ کی جانب سے رابغ سے پہلے ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں: اس کو ابواء اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہاں سیلاب ٹھکانا پکڑتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہاں وبا بہت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا نام اَوْباء ہونا چاہیئے تھا، یا یہ کہا جائے کہ ابواء اوباء سے مقلوب ہے۔" حموی نے اور بھی وجوہ تسمیہ ذکر کی ہیں۔ اور اس بستی کے بارے میں مفصل کلام کیا ہے۔

ابواء، حضورؐ کی والدہ ماجدہ کا مدفن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے یہاں دفن ہونے کی وجہ یہ ذکر کی ہے کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے ان کا یہاں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے یہیں دفن ہوئیں۔ عزیز محمد رابع لکھتے ہیں: کہ "ابواء ایک وادی کا نام ہے جس میں وَدّان ہے" جیسا کہ ابھی آتا ہے۔ وَدّان: بفتح واؤ تشدید دال مہملہ جحفہ کے قریب میں ایک جگہ کا نام ہے۔ جو ابواء

اهدی لہ الصعب بن جثامۃ عجز حمار وحشی فردہ علیہ۔

ترجمہ: تو صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا جسے آپ نے واپس فرمادیا۔

کی بنسبت جحفہ سے قریب تر ہے، ان دونوں کے درمیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ زیر بحث واقعہ ابواء میں پیش آیا یا ودّان میں؟ اس میں راوی کو شک ہے بعض راویوں نے ابواء ذکر کیا ہے اور بعض نے ودّان۔ کذا فی الزرقانی۔ اوجز میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد حافظ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بظاہر یہ شک ابن عباس کی جانب سے ہے۔ نیز اوجز میں ایک اور اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ قدید میں پیش آیا یا جحفہ میں؟ یہ تمام مقامات قریب قریب ہیں۔ اور اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ ودّان تین جگہوں کا نام ہے۔ جن کو انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، نیز حموی لکھتے ہیں کہ موضع ودّان کی طرف صعب بن جثامہ کی نسبت کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ یہاں قیام کیا کرتے تھے اس لئے اسی کی طرف منسوب ہوئے۔ نیز محمد رابع لکھتے ہیں کہ "ابواء ایک وادی کا نام ہے جس میں ودّان ہے۔ نیز اس وادی میں ایک خاص موضع کا نام بھی ابواء ہے۔ شام کے راستہ میں مشرق کی طرف واقع ہے۔ البتہ ودان آجکل "مستورہ" کے نام سے معروف ہے جو مدینہ سے ۲۲۸ کیلومیٹر پر واقع ہے۔" میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ ان دنوں بہت بڑی منزل ہے۔ یہاں تلی ہوئی مچھلیوں کی فروخت خوب ہوتی ہے، حجاج کرام یہاں سے گزرتے ہیں تو مچھلی کھائے بغیر آگے نہیں جاتے کہ یہاں کی مچھلیاں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔

صعب بن جثامہ کے گورخر ہدیہ کرنے کا واقعہ تو صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں حمار وحشی کی ران کا ہدیہ پیش کیا۔ روایات اور کتب تاریخ میں معروف یہی ہے کہ صعب بن جثامہؓ کا واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آیا۔ مگر شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ صعب بن جثامہ کی حدیث کا واقعہ حجۃ الوداع میں پیش آنا ہمارے نزدیک ثابت نہیں۔ الیٰ آخر ما بحث فیہ جسے آپ نے واپس فرمادیا۔ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ سالم نیل گائے کا ہدیہ پیش کیا گیا تھا یا اس کے ایک ٹکڑے کا؟ اور یہ کہ آپ نے اسے قبول فرمالیا تھا یا رد کر دیا تھا؟ اور یہ کہ یہ واقعہ ابواء کا ہے یا ودّان کا یا جحفہ کا؟ ان مباحث میں وسیع اختلاف ہے۔ جو فتح وغیرہ مطولات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اوجز میں ان کے کلام کا خلاصہ دیا ہے، اور لامع کے حاشیہ میں اس پر اجمالی کلام کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان روایات کو یوں جمع کیا ہے کہ زندہ نیل گائے کو واپس کر دیا گیا، اور اس کے ٹکڑے کو قبول فرمالیا، جیسا کہ فتح، مواہب

(قلت) واعتل بعير لصفية نامر زينب ان تعطيها بعيرا۔ فقالت انا افقر يهوديتك؟ فغضب۔

ترجمہ: (ش) اور حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپؐ نے حضرت زینبؓ کو حکم فرمایا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ اس پر آپؐ ناراض ہو گئے۔

اور شرح مواہب میں ہے، مگر نسائی کی روایت جس میں ٹکڑے کا واپس فرمانا مذکور ہے اس تطبیق کے خلاف ہے، الا یہ کہ اس میں تاویل کی جائے۔ علامہ زرقانیؒ نے حافظؒ کی متابعت میں کہا ہے کہ قبول کرنے کی روایت کو مکہ سے واپسی پر محمول کرنا چاہیئے۔ اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یہ قصہ جحفہ میں پیش آیا۔ امام بیہقی کی ذکر کردہ تطبیق کو حافظ کا رد کرنا قابل اعتماد نہیں کیونکہ یہ ان کے فقہی مسلک کے خلاف ہے۔

محرم کے شکار میں اختلاف محرم کے شکار کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کر چکا ہوں۔ شیخ قدس سرہٗ نے الکوکب الدری میں اس پر بہت عمدہ کلام کیا ہے: فرماتے ہیں: "جاننا چاہیئے کہ اس مسئلہ میں ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلاف ہے۔ اگر محرم نے خود شکار کیا یا شکار کو ذبح کیا تو بالاتفاق حرام ہے، اور اگر غیر محرم نے محرم کے حکم سے شکار کیا تب بھی بالاتفاق حرام ہے۔ اور اگر غیر محرم نے شکار کیا اور اس کی نیت یہ تھی کہ محرم کو کھلائیگا مگر محرم نے اس کا حکم نہیں کیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک حرام ہے اور ہمارے نزدیک حرام نہیں۔" الی آخر ما افاد۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں۔ اول یہ کہ مطلقاً ممنوع ہے، یہ قول حافظ عینیؒ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے۔ دوم یہ کہ اگر محرم کی خاطر شکار کیا گیا ہو تو ممنوع ہے، ائمہ ثلاثہ اسی کے قائل ہیں۔ سوم یہ کہ اگر محرم نے خود شکار کیا ہے یا اس کی اجازت یا دلالت سے شکار ہوا ہو تو بالاتفاق حرام ہے، یہ اجمالی بات ہے، ورنہ امام مالکؒ وغیرہ کے مختلف اقوال مروی ہیں۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔

حضرت صفیہؓ کے اونٹ کا بیمار ہونا (ش) اور اثناء راہ میں ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ انہیں ایک اونٹ دے دیں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ کیا میں آپ کی یہودن کو دے دوں؟ یہ اس لیئے کہا کہ حضرت صفیہؓ حضرت ہارون علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد سے تھیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے۔ چنانچہ اثناء سفر اور ایام منیٰ میں ان

سے گفتگو نہیں فرمائی یہاں تک کہ مدینہ واپسی ہوئی، مدینہ آکر بھی محرم اور صفر میں نہ ان سے بات کی نہ ان کی
باری پر ان کے گھر گئے۔ جب ربیع الاول کا مہینہ آیا تو آپؐ انکے ہاں تشریف لے گئے، جیسا کہ مسند احمد کی
روایت سے ابھی آتا ہے۔ مجھے ابھی تک اس کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا تھا۔ حافظ
ابن قیمؒ اور ان کے متبعین صاحب مرآۃ وغیرہ نیز قسطلانی اور ان کے شارح زرقانی پر تعجب ہے کہ کسی نے
بھی حجۃ الوداع کے واقعہ میں اس قصہ کا ذکر نہیں کیا۔ ابوداؤد نے یہ قصہ حضرت عائشہؓ سے مختصرًا نقل کیا
ہے کہ حضرت صفیہؓ بنت حیّیؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا۔ اور حضرت زینبؓ کے پاس زائد سواری تھی۔ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ انہیں (صفیہؓ کو) ایک اونٹ دے دو، حضرت زینب نے کہا: میں اس یہودن
کو دے دوں؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے، اور ذوالحجہ، محرم اور صفر کے کچھ حصہ میں اور
مجمع الزوائد میں ہے کہ صفر میں ان سے قطع تعلق کئے رکھا، ربیع الاول میں ان کے پاس تشریف لے گئے"۔

اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے جس میں خود حضرت صفیہؓ سے اس قصہ کو مفصل روایت کیا
ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے ہمراہ حج کیا۔ سفر کے دوران ایک شخص ان کی سواریوں
کو تیز ہنکانے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آبگینوں۔ یعنی عورتوں۔ (کی سواریوں) کو یوں ہنکایا
کرتے ہیں؟ دریں اثنا کہ سفر جاری تھا صفیہ بنت حیّیؓ کا اونٹ (بیمار ہو کر) اچانک بیٹھ گیا — حالانکہ
انہی کی سواری سب سے عمدہ تھی۔ وہ رونے لگیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی۔ تو انکے
پاس تشریف لائے، اور اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو صاف کرنے لگے، مگر ان کے گریہ میں اور
اضافہ ہو گیا۔ آپؐ نے ان کو رونے سے منع فرمایا۔ تاہم جب انہوں نے زیادہ رونا شروع کیا تو آپؐ نے
ڈانٹا۔ اور مجبورًا لوگوں کو اترنے کا حکم فرمایا۔ حالانکہ آپؐ کا ارادہ وہاں اترنے کا نہیں تھا۔ بہر حال
لوگ اتر گئے، اور یہ میری باری کا دن تھا۔ جب لوگ اترے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ
نصب کیا گیا۔ اور آپؐ اس میں فروکش ہوئے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے
میرے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں آپ کے دل میں کوئی ناگواری نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ
کے پاس گئی، اور ان سے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ میں کسی بھی چیز کے بدلے اپنی باری کے دن کا سودا کبھی
نہیں کر سکتی۔ مگر آج میں اپنا دن تمہیں اس شرط پر ہبہ کرتی ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے
راضی کر دو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، بہت اچھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اپنے سر کا کپڑا لیا اسے زعفران

وایضاً علم من حدیث المسند ان قصۃ انجشۃ المشہورۃ وقولہ صلے اللہ علیہ وسلم یا انجش رویدك سوقك بالقوارير ایضاً وقع فے ھذا السفر

ترجمہ: نیز مسند کی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہ کا مشہور قصہ بھی جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ آبگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ۔ اسی سفر میں پیش آیا تھا۔

سے ملا، پھر اسپر پانی چھڑکا تاکہ اس کی خوشبو مہک جائے۔ پھر اپنے کپڑے پہنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ خیمے کا کنارہ اٹھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عائشہ کیا بات ہے؟ آج تمہاری باری کا دن نہیں" انہوں نے عرض کیا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتے ہیں عطا کر دیتے ہیں۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ قیلولہ فرمایا۔ جب چلنے کا وقت ہوا، تو حضرت زینب سے فرمایا کہ اپنی بہن کو ایک اونٹ دے دو۔ ازواج مطہرات میں انہی کے پاس سب سے زیادہ سواریاں تھیں۔ حضرت زینب نے کہا: میں آپ کی یہودن کو دوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر ناراض ہوئے۔ ان سے گفتگو ترک کر دی، مکہ مکرمہ جانے تک ایام منیٰ میں۔ اور مدینہ کی واپسی تک، نیز مدینہ طیبہ میں محرم اور صفر گزرنے تک نہ آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے، نہ انہیں باری کا حصہ دیا۔ اور وہ آپؐ سے بالکل ہی مایوس ہوگئیں۔ جب ربیع الاول شروع ہوا تو آنحضرتؐ انکے پاس تشریف لیگئے جب انہوں نے آپکا سایہ دیکھا تو دل میں کہنے لگیں کہ یہ کسی آدمی کا سایہ ہے۔ اور نبی کریمؐ تو میرے پاس تشریف لائے نہیں۔ پھر یہ شخص کون ہوگا؟ جب انہوں نے آپؐ کو دیکھا تو کہنے لگیں: یا رسول اللہ: جب آپؐ میرے پاس تشریف لائے تو میں حیرت میں ہوں کہ کیا کروں۔ راور کس طرح آپؐ کی ناراضگی کی تلافی کروں) ان کے پاس ایک باندی تھی۔ جسے وہ آنحضرتؐ سے پردہ میں رکھتی تھیں، اس کے بارے میں عرض کیا کہ فلاں باندی آپؐ کو ہبہ کرتی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کی چارپائی کے پاس گئے وہ اٹھا کر رکھی ہوئی تھی۔ اپنے دست مبارک سے اسے بچھایا۔ پھر اپنی اہلیہ محترمہ سے ملے اور ان سے راضی ہوگئے۔

انجشہ کیلئے حکم نبوی

نیز مسند کی اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ انجشہؓ کا مشہور قصہ بھی جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ اے انجشہ! آبگینوں کو ذرا آہستہ چلاؤ، اسی سفر میں پیش آیا

تھا۔ مگر تعجب ہے کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس کو بھی قصۂ حجۃ الوداع میں ذکر نہیں کیا۔ یہ قصہ معروف ہے۔ بخاری وغیرہ کتب صحاح میں مروی ہے۔ امام بخاری نے چند مواضع میں اس کی تخریج کی ہے۔ منجملہ ان کے

(قال) فلمّا مرّ بوادی عُسفان

ترجمہ: (ق) پھر جب آپؐ وادی عسفان سے گزرے۔

"باب مایجوز من الشعر والرجز" میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اور حافظؒ نے اس باب میں احادیث کے الفاظ اور طرق کو خوب بسط سے ذکر کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض بیویوں کے پاس تشریف لے گئے ان کے ساتھ ام سُلیم بھی تھیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ اپنی فرودگاہ میں تھے کہ حدی خواں نے حدی پڑھی۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ ایک اونٹوں کو ہنکانے والا تھا اور ایک حدی خواں تھا، ابوداؤد طیالسی کی روایت میں ہے کہ انجشہ مستورات کے حدی خواں تھے۔ اور براء بن مالک مردوں کے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ کسی سفر میں تھے۔ ان روایات کی پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔ مگر حافظؒ نے کسی روایت سے سفر کی تعیین نہیں کی۔ تعجب ہے کہ انہوں نے مسند احمد کی مذکورہ بالا روایت ذکر نہیں کی جس میں تصریح ہے کہ یہ قصہ سفرِ حج کا ہے۔ تا حال مجھے یہ تحقیق نہیں کہ یہ دونوں واقعے کس منزل میں پیش آئے۔ اس کی تفتیش کر لی جائے۔

یہ آٹھ منزلیں جو شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کی ہیں۔ بیشتر ان مساجد کے مطابق ہیں جو حضرت ابن عمرؓ نے بتائی ہیں۔ اور امام بخاری نے "باب المساجد التی علی طرق المدینۃ" میں۔ نیز صاحب البدایہ والنہایہ نے انہیں ذکر کیا ہے۔ اور صاحب البدایہ والنہایہ فرماتے ہیں، کہ ان میں سے بیشتر مواضع کے نام تبدیل ہو چکے ہیں اور بہت سے مقامات آج کل غیر معروف ہیں۔ پہلی چار منزلوں کے نام تو بخاری کی روایت کے موافق ہیں۔ اور یہ پانچویں منزل اور اسی طرح آئندہ منازل کے نام ان ناموں سے مختلف ہیں۔ جو بخاری شریف میں ذکر کئے گئے ہیں۔

موضع ہرشیٰ

بخاری کی روایت میں "عرج" کے بعد پانچویں منزل موضع "ہرشیٰ" مذکور ہے۔ بفتح اول وسکون را۔ اور اس کے بعد شین منقوطہ اور اس کے بعد الف مقصورہ ہے۔ کذا فی الفتح۔ اور معجم میں ہے کہ یہ شام اور مدینہ سے مکہ کے راستوں کے سنگھم پر ہے۔ اس سے نیچے مغربی جانب موضع ودّان دو میل کی مسافت پر واقع ہے۔

چھٹی منزل عسفان

(ق) پھر جب آپؐ وادی عسفان سے گذرے۔ عسفان: بروزن عثمان مکہ سے دو مرحلے پر ہے۔ کذا فی القاموس۔ اور مرآۃ کے حاشیہ میں ہے کہ "یہ جگہ

قال یا ابا بکرؓ ای وادٍ ھذا ؟ قال وادی عسفان، قال لقد مر بہ ھود و صالح

۔ تو آپؐ نے فرمایا: اے ابو بکرؓ! یہ کونسی وادی ہے؟

جحفہ اور مکّہ کے درمیان واقع ہے، مکّہ سے دو مرحلے یا ۳۰ میل۔ اور جحفہ سے تین مرحلوں پر واقع ہے۔ اور عسفان سے ملل تک کو ساحل کہا جاتا ہے۔ اور ملل مدینہ شریف سے ایک دن کی مسافت پر ہے'' اور معجم میں ہے کہ ''کہا جاتا ہے کہ عسفان ایک قریہ جامعہ ہے جہاں منبر ہے اور کھجوروں کے باغات اور کھیت ہیں۔ مکہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور یہ تہامہ کی آخری حد ہے'' میں کہتا ہوں کہ یہ ان منازل میں سے چھٹی منزل ہے۔ جنہیں حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کی حدیث المساجد میں چھٹی منزل عسفان کے بجائے مرالظہران مذکور ہے۔ حافظ فرماتے ہیں۔ یہ میم کے فتح، را کی تشدید، ظاء کے فتح اور ہا کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ وہی وادی ہے جس کو عام لوگ ''بطن مروہ'' را کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد واؤ کہتے ہیں۔ البکریؒ کہتے ہیں کہ اس کے اور مکّہ کے مابین ۱۶ میل کا فاصلہ ہے۔ اور معجم میں ہے کہ مرالظہران مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ عزیز محمد رابع لکھتے ہیں کہ ''مرالظہران کو آج کل'' وادی فاطمہؓ کہا جاتا ہے۔ اور یہ نام کوئی دو سو سال سے پڑا ہے۔ فاطمہ ایک مشہور ترکی خاتون کا نام ہے۔ اس جگہ اس کے باغات اور زمینیں تھیں۔ یہ مکہ سے ۲۵ کلو میٹر پر واقع ہے''

تو آپؐ نے فرمایا: اے ابو بکرؓ! یہ کونسی وادی ہے۔ عرض کیا: وادی عسفان: زرقانی فرماتے ہیں۔ ''دریافت فرمانے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ وادی عسفان ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سے کہلوانا مقصود ہو۔ اور یہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ ایسے موقعوں پر تو صحابہ کرام کی عادت اللہ و رسولہ اعلم کہنے کی تھی۔ کیونکہ یہ عادت علمی امور میں تھی اور یہاں ایک محسوس کی خبر ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب آپؐ نے خطبہ منیٰ میں فرمایا تھا'' ای بلد ہذا'' یہ کونسا شہر ہے'' ای شہر ہذا'' یہ کون سا مہینہ ہے؟ باوجودیکہ یہ دونوں محسوس تھے۔ پھر صحابہ رضؓ نے'' اللہ و رسولہ اعلم'' کیوں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقعہ پر صحابہ کرامؓ کا'' اللہ و رسولہ اعلم'' کہنا اس بنا پر تھا کہ شاید آپؐ ایسی خبر دیں جس کا انہیں علم نہ ہو۔ ابی وغیرہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے''

وادی عسفان سے حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کا تلبیہ کہتے ہوئے گزرنا

آپؐ نے فرمایا: اس وادی سے حضرت ہود اور حضرت صالح علیٰ نبیّنا و علیہما الصلوٰۃ والسلام گذرے ہیں۔ درمنثور میں ہے۔ کہ عسفان میں حضرت

علی بکرین احمرین خطا مہا اللیف یلبّون یحجون۔

دونوں موجوان سرخ اونٹوں پر سوار تھے جنکی مہار کھجور کی چھال کی تھی تلبیہ کہتے ہوئے حج بیت اللہ کو جارہے تھے۔

ہود اور حضرت صالح علی نبیّنا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کی قبریں ہیں۔ دونوں دو جوان اور سرخ اونٹوں پر سوار تھے یعنی ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں سرخ اور جوان اونٹ پر سوار تھے۔ کیونکہ حضرت ہود کا زمانہ حضرت صالح علی نبیّنا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام سے پہلے کا ہے۔ جن کی مہار۔ خِطام: بکسر خائے معجمہ و فتح طائے مہملہ۔ وہ رسی جو اونٹ کے منہ اور ناک میں ڈالی جاتی ہے۔ کھجور کی چھال کی تھی۔ یہ ان حضرات کی تواضع مع اللہ تھی اور یہ تواضع اور سادگی انبیاء کرام علیہم السّلام کی فطری جبلت ہے۔ کذا فی الزرقانی تلبیہ کہتے ہوئے حج بیت اللہ کو جارہے تھے۔ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں ذکر فرمائی ہے۔ اور وہاں سے قسطلانی نے مواہب میں لی ہے۔

میں کہتا ہوں اس پر دُرِّ منثور کی روایت سے اشکال ہوتا ہے۔ جس میں ہے کہ "ہر نبی نے حج کیا بجز ہود اور صالح علیہما السلام کے۔ کیونکہ یہ دونوں اپنی قوم کی مشغولی کی وجہ سے حج نہیں کر سکے" جواب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ دُرِّ منثور کی روایت، مسند احمد کی روایت کے مقابل نہیں ہو سکتی کیونکہ سیوطیؒ نے اس کو دو طریقوں سے ذکر کیا ہے۔ اوّل بیہقی فی الدلائل، ازرقی اور ابن اسحاق کے حوالے سے عروہ کا قول نقل کیا ہے۔ دوم تخریج ازرقی، عروہ سے مرسلاً نقل کی ہے اوجز میں کتاب الحج کے آغاز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اس میں ہے کہ "عروہ بن الزبیر کے قول پر یہ اعتراض ہے کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے حج کیا ہے۔ نیز ایک جماعت کا قول ہے کہ تمام انبیاء نے حج کیا" نیز اس میں روضۃ المحتاجین کے حاشیہ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ کا یہ ارشاد کہ "ہر نبی نے حج کیا" اس میں قول معتمد کے مطابق ہود اور صالح علیہما السلام بھی داخل ہیں۔ نیز اس میں ہے کہ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عسفان پہنچے تو آپؐ نے فرمایا: "یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام گذرے ہیں" یہاں انہوں نے مسند احمد کی حدیث ذکر کی ہے۔

(قلت: وهناك سأل سراقة بيانا واضحًا في الحج (قال) فلما كان بسرف

ترجمہ: (ش) اسی جگہ حضرت سراقہؓ نے آپؐ سے حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔

(ق) پس جب کہ آپ موضع سرف پہنچے

سراقہ کی جانب سے واضح بیان کی درخواست

(ش) اسی جگہ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم (جیم اور شین کے ضمہ کے ساتھ ان دونوں کے درمیان عین مہملہ۔ یہ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے ہجرت مدینہ کے راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تھا۔ اس کا قصہ مشہور ہے۔ کذا فی البذل۔ میں کہتا ہوں اس واقعہ کو امام بخاریؒ نے باب الہجرت میں ذکر کیا ہے۔ اس میں ہے کہ سراقہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس کفار قریش کے قاصد آئے۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری پر سو سو اونٹ کا انعام رکھا تھا۔ یہ حدیث طویل ہے۔ اور اس میں سراقہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کرنے ان کے گھوڑے کے دھنس جانے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے امان طلب کرنے کے واقعات مذکور ہیں۔ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے مسائل میں واضح بیان کی درخواست کی۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے "باب الاقران" میں یہ الفاظ ذکر کئے ہیں کہ جب ہم عسفان پہنچے تو سراقہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے لئے مسائل حج کو ایسا بیان کر دیجئے، جیسا کہ ان لوگوں کے سامنے کیا جاتا ہے جو گویا آج پیدا ہوئے۔

منزل سرف

پس جب کہ آپ موضع سرف پہنچے، سرف، سین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ مکہ سے چھ میل یا سترہ میل یا بارہ میل پر ایک جگہ کا نام ہے۔ آخری دو قول صحیح نہیں۔ کذا فی المرقاۃ۔ صاحب خمیس نے ۹ میل ہونا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ایک معروف جگہ ہے۔ اس مقام کے عجائب میں سے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضا میں اسی جگہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ واپسی پر اسی جگہ ان کی رخصتی ہوئی۔ اور جس درخت کے نیچے رخصتی ہوئی وہیں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی تدفین ہوئی ان کی وفات صحیح قول کے مطابق تمام ازواج مطہرات کے بعد ۵۱ھ میں ہوئی۔ جیسا کہ میرے رسالہ "حکایات صحابہ" میں ہے۔ وہاں ان کی قبر مشہور زیارت گاہ ہے۔

حاضت عائشۃ رضی اللہ عنہا
توحضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماہواری شروع ہوئی۔

توحضرت عائشہؓ کو ماہواری شروع ہوئی۔ طبقات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے۔ مگر یہ واضح طور پر غلط ہے۔ کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اتوار کے دن داخل ہوئے۔ نووی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ حیض کا آغاز ۳ ذی الحجہ کو بروز ہفتہ ہوا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے حج میں اختلاف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعۂ حج واحرام میں علماء کا نزاع ہے کہ آیا ان کا احرام حج مفرد کا تھا یا قران کا؟ اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "توجاننا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام اور کیفیت حج میں روایات مختلف ہیں۔ اسی بنا پر اس میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس میں ہے کہ شیخ ابن قیمؒ "الہدیٰ" میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے قصہ میں علماء کا نزاع ہے کہ ان کا احرام تمتع کا تھا یا صرف حج مفرد کا؟ اور اگر تمتع کا تھا تو کیا انہوں نے عمرہ فسخ کر دیا تھا اور حج مفرد کا احرام باندھ لیا تھا یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا؟ اور جو عمرہ انہوں نے تنعیم سے کیا وہ ان پر واجب تھا یا نہیں؟ اور حضرت عائشہؓ کے قصہ پر جو مسئلہ مبنی ہے۔ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب عورت نے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور اسے حیض آجائے اور عرفات میں جانے سے پہلے طواف نہ کرسکتی ہو تو کیا اسے عمرہ کا احرام فسخ کرکے حج مفرد کا احرام باندھنا چاہیئے۔ یا عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کرلے؟ چنانچہ فقہاء کوفہ جن میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب بھی شامل ہیں رحمہم اللہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اور فقہاء حجاز امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ۔ دوسرے قول کے قائل ہیں اور یہی مذہب اہل حدیث مثلاً امام احمد اور ان کے متبعین کا ہے۔"

اوجز میں حضرت عائشہؓ کے احرام کی روایات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں ہے کہ:

شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: صحیح بات جس سے عدول نہیں کیا جاسکتا، یہ ہے کہ ابتداءً ان کا عمرہ کا احرام تھا۔ جیسا کہ جمہور اس کے قائل ہیں اگرچہ ان میں اختلاف ہے کہ انہوں نے عمرہ کو فسخ کر دیا تھا؟ یا اس پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا۔ اھ میں کہتا ہوں کہ پہلا قول حنفیہ کا ہے، اور دوسرا ائمہ ثلاثہ کا جیسا کہ ابھی گزرا۔

اور یہ اختلاف ایک دوسرے اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ حنفیہ کے نزدیک قارن، عمرہ اور حج ــــ

دونوں کے افعال الگ الگ اور مستقل ادا کرتا ہے۔ چونکہ حضرت عائشہؓ کے لیئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وقت حج سے پہلے عمرہ کے افعال ادا کرسکیں لامحالہ انہیں عمرہ فسخ کرکے حج کا احرام باندھنا پڑا۔ اور آئمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں گے۔ چونکہ حج سے پہلے وہ عمرہ کے افعال ادا نہیں کرسکتی تھیں اس بنا پر ان کے لیئے گنجائش تھی کہ عمرہ کے احرام پر حج کا احرام باندھ لیں۔ تاکہ عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو جائیں۔

حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کردیا تھا اس پر حنفیہ کے دلائل

حنفیہ نے اپنے اس مدعا پر کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کردیا تھا کئی وجہ سے استدلال کیا ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: "اپنے عمرہ کو چھوڑ دو"۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا: "اپنا سر کھول کر کنگھی کرلو"۔ ظاہر ہے کہ احرام میں کنگھی کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ بالوں کے جھڑنے کا اندیشہ ہے۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "یہ تیرا عمرہ ہے اس عمرہ کی جگہ"۔ چہارم یہ کہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا تھا: "تم لوگوں نے عمرہ کرلیا میں نے نہیں کیا"۔ پنجم یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں: "تم تو حج و عمرہ کرکے واپس جاؤ اور میں صرف حج لے کر جاؤں؟"۔ مسند احمد کے لفظ جیسا کہ فتح میں ہے، یہ ہیں: "اور میں صرف حج لے کر جاؤں جس کے ساتھ عمرہ نہ ہو"۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ: "عائشہؓ میں بھی تیری مثل ہوں"۔ کیونکہ آپ بھی قارن تھے۔ اور بقول ائمہ ثلاثہ کے حضرت عائشہؓ نے بھی آپ کی طرح قران کیا تھا تو پھر حضرت عائشہؓ نے کیوں فرمایا کہ تم حج و عمرہ لے کر جاؤ اور میں صرف حج لے کر جاؤں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ فرمایا کہ جس طرح میرا قران ہے اسی طرح تیرا بھی قران ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ فسخ کردیا تھا۔ ان روایات کی تفصیل اوجز میں ہے۔ لامع الداری میں ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات پر مختصر مگر بہت عمدہ کلام کیا ہے۔

حضرت عائشہؓ کے عمرہ تنعیم میں چار مسلک

پھر شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے کہ "حضرت عائشہؓ نے تنعیم سے جو عمرہ کیا تھا اس میں چار مسلک ہیں، اول یہ کہ محض ان کی دلجوئی کے لیئے تھا۔ یہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول ہے۔ دوم یہ کہ یہ فسخ شدہ عمرہ کی قضا تھی۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ سوم یہ کہ جب انہوں نے قران کرلیا تو ایک مستقل عمرہ کا ادا کرنا ضروری تھا کیونکہ

(قال) اما موضع حیضها فهو بسرف بلاریب۔ واختلف فی موضع طهرها
ترجمہ: (ق) ان کے حیض کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف تھی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کب پاک ہوئیں۔

قران کا عمرہ، عمرۃ الاسلام کی جگہ کافی نہیں ہوتا۔ یہ امام احمدؒ سے ایک روایت ہے۔ چہارم یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شروع ہی سے حج مفرد کا احرام باندھا تھا۔ اور وہ اسی احرام پر قائم رہیں۔ اس لئے یہ عمرہ، عمرۃ الاسلام تھا۔ یہ قاضی اسماعیل وغیرہ مالکیہ کی رائے ہے، اور یہ سب سے ضعیف قول ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے احرام کی تعیین بھی شدید مشکل مسئلہ ہے۔ زرقانی نے شرح موطا میں اکمال کی پیروی کرتے ہوئے نیز حافظؒ نے فتح میں اور قاضی عیاضؒ، نوویؒ اور ابن قیمؒ نے اس پر بحث کی ہے۔ امام محمدؒ موطا میں فرماتے ہیں اگر حائضہ نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا ہو اور فوتِ حج کا اندیشہ ہو تو اسے چاہیئے کہ عمرہ فسخ کردے، حج کا احرام باندھ کر وقوف عرفہ کرے اور اس عمرہ کی قضا کرے جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا الخ"۔

ان کے طُہر کی جگہ میں اختلاف

(ق) ان کے حیض کے آغاز کی جگہ تو بلاشبہ موضع سرف ہی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماہواری کی شکایت موضع سرف میں کی تھی؛ جیسا کہ شیخ ابن قیمؒ نے اس پر جزم کیا ہے۔ یا یوم الترویہ میں؛ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کا مقتضیٰ ہے اور اسی طرف زرقانی کا میلان ہے۔ یا کسی اور دن؛ جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں اور کب پاک ہوئیں؛ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ عرفہ کے دن اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ان کو اسی حالت میں عرفہ کا دن آگیا تھا۔ اور قاسم نے ذکر کیا ہے کہ یہ یوم النحر تھا؛ جیسا کہ الہدیٰ میں ہے اسی طرح نووی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ان کا طہر یوم النحر کو بروز ہفتہ ہوا تھا، حافظؒ نے مختلف روایتوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ عرفہ میں انہوں نے طہر دیکھا لیکن منیٰ آنے سے پہلے غسل کا موقعہ نہ ہوا۔ یا یہ کہ خون عرفہ میں منقطع ہو چکا تھا۔ مگر طہر منیٰ میں آکر دیکھا۔ اور یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے۔ اور شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ وہ بطحاء کی رات پاک ہوئیں۔ اور اس کی سند صحیح ہے۔ لیکن ابن حزمؒ نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس میں ناقل سے تصحیف ہوئی ہے۔ صحیح

وقال لاصحابہ من لم یکن معہ ھدی فاحبّ ان یجعلھا عُمرۃً فلیفعل و من کان معہٗ ھدیٌ فلا

ترجمہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں اگر وہ اس کو عمرہ بنانا چاہتا ہے تو بنالے اور جس کے ساتھ ہدی ہے وہ نہیں۔

واؤ حالیہ کے اضافہ کے ساتھ ہے یعنی بطحاء کی رات آئی درآنحالیکہ حضرت عائشہؓ پاک ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ابوداؤد ہی کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: فلما کانت لیلۃ بطحاء و طھرت عائشۃ قالت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ

موضع سرف میں صحابہ کرام کو فسخ حج کا اختیار دینا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موضع سرف میں اپنے صحابہؓ سے فرمایا: جس کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں وہ اگر اس کو عمرہ بنانا چاہتا ہے تو بنالے اور جس کے ساتھ ہدی ہے، وہ نہیں۔ کذا فی البذل اور صحیحین کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ اور سیرت ابن ہشام کے لفظ یہ ہیں: "آپؐ جب موضع سرف پہنچے تو لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ عمرہ کرکے احرام کھول دیں۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ ہدی کے جانور ہیں" اور یہ تخییر مرتبہ میں بالاتر تھی اُس تخییر سے جو میقات میں دی گئی، کیونکہ میقات کی تخییر یہ تھی کہ احرام کی تینوں صورتوں میں سے کوئی سی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ مگر یہاں فسخ حج کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ بعد ازاں صفا پر پہنچ کر فسخ حج کا قطعی حکم فرمایا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔

حج کا احرام فسخ کرکے عمرہ بنالینے کا حکم

یہاں شیخ ابن قیمؒ نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کہ حج کو فسخ کرکے عمرہ بنالینا قیامت تک کیلئے جائز ہے اور اس کے منسوخ نہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کے دلائل دیئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں تھا۔ اس کا موقع وہ تھا جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر پہنچ کر فسخ حج کا حکم فرمایا تھا۔ اور حضرت سراقہ نے آپؐ سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ مگر مصنف شیخ ابن قیمؒ نے یہ مسئلہ چونکہ یہاں چھیڑا ہے اس لئے ان کی متابعت میں میں بھی اس کو یہیں ذکر کرتا ہوں۔ لامع کے حاشیہ میں "باب من اہل فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے ذیل میں اوجز سے نقل کیا ہے کہ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس فسخ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ اسی سال کیلئے مخصوص تھا؟ یا ان کے لئے

اور دوسروں کے لئے قیامت تک باقی ہے؟ امام احمد اور اہل ظاہر کے ایک گروہ نے دوسرے قول کو لیا ہے۔ اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہ اور جمہور سلف وخلف نے پہلا قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحابہؓ کے ساتھ اسی سال کے لئے مخصوص تھا۔ جاہلیت میں خیال کیا جاتا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ حرام ہے، جاہلیت کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے صحابہ کرامؓ کو فسخ حج کا حکم فرمایا۔ جمہور کی دلیل مسلم شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ متعہ فی الحج صرف اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ یعنی حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لینا۔ اور نسائی میں ہے کہ حارث بن هلال اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ: فسخ حج صرف ہمارے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کیلئے عام ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "نہیں بلکہ ہمارے لئے خاص ہے" اور حدیث سراقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک لأبد كا مطلب یہ ہے کہ اشہر حج میں عمرہ جائز ہے۔

ابن رشد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بعد کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ حج کا احرام باندھ کر اسے فسخ کر دے اور اسے عمرہ میں تبدیل کر دے۔ انتہیٰ مختصراً۔ حضرت سراقہ کی اس حدیث پر رمی عقبہ میں کچھ مفصل بحث ہوگی۔ نیز حاشیۂ لامع میں "باب عمرة التنعیم" کے ذیل میں بھی حدیث سراقہ کا جواب دیا گیا ہے۔ اور زرقانی نے بھی شرح مواہب میں اس پر خوب مفصل کلام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ حنفیہ پر خصوصیت سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ حج کے احرام کو فسخ کر کے عمرہ میں تبدیل کرنے سے جو مقصود تھا وہ ان کے مذہب کے مطابق یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ حج پر عمرہ کے احرام کا اضافہ کر کے قران کر لیا جائے۔ دوسرے ائمہ پر یہ اشکال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انکے نزدیک حج کے احرام پر عمرہ کا اضافہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے ذیل میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ حنفیہ کی طرف سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ فسخ الی العمرہ سے مقصود زعم جاہلیت کو باطل کرنا اور اس پر شدید رد و نکیر کرنا تھا۔ ورنہ نفس جواز تو اسی سے ثابت تھا کہ بعض صحابہ کرامؓ نے میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا، اور اس سے بھی واضح تر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے پہلے تینوں عمرے زمانہ حج میں ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فسخ حج کا حکم فرمایا تاکہ جاہلیت کے رواج کا پوری طرح قلع قمع ہو جائے۔

(قال) ثم نهض الی ان نزل بذی طوٰی - فبات بها لیلة الاحد لاربع خلون من ذی الحجة وصلی بها الصبح ثم اغتسل من یومہ -

ترجمہ: (ق) پھر آپ چلے یہاں تک کہ ذی طوٰی میں نزول فرمایا ۔ پس وہاں رات کو قیام فرمایا - یہ چار ذی الحجہ اتوار کی رات تھی - اور وہاں نماز صبح ادا کی - پھر اسی دن غسل فرمایا -

ذی طوٰی میں آپکا غسل کرنا اور مکہ مکرمہ میں داخلہ کی تفصیل

(ق) پھر آپؐ چلے یہاں تک کہ ذی طوٰی میں نزول فرمایا۔ یہ منزل بخاری شریف کی حدیث مساجد میں بھی مذکور ہے - اور اب "آبار زاہر" کے نام سے معروف ہے - کذا فی الہدی - اس کے ضبط میں چند اقوال ہیں جو فتح میں مفصل مذکور ہیں - لامع کے حاشیہ میں ہے کہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ ذی طوٰی، محصب، ابطح، بطحاء اور خیف، بنی کنانہ یہ سب ایک ہی جگہ کے نام ہیں یا متعدد مقامات کے؟ نیز اس میں ہے کہ ذی طوٰی اسفل مکہ میں عمرہ کے معتاد راستہ کی جانب ایک جگہ ہے ۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ مکہ اور تنعیم کے مابین ہے - اھ - امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصحیح میں "النزول بذی طوٰی" کا باب باندھا ہے، اور حاشیۂ بخاری میں ہے کہ "طوی، طاء کی تینوں حرکتوں کے ساتھ ایک جگہ ہے جو باب مکہ کے پاس ہے - منصرف بھی ہے اور غیر منصرف بھی - کذا فی المجمع - ملا علی قاریؒ شرح موطا میں فرماتے ہیں: "یہ تنعیم کے راستہ میں ایک وادی ہے - یہاں امیر الحج کا قیام ہوتا ہے" اور المرآۃ کے حاشیہ میں ہے: "مکہ کی غربی جانب ایک جگہ ہے" پس وہاں دونوں گھاٹیوں کے درمیان رات کو قیام فرمایا ۔ کما فی المواہب - اور بخاری کی حدیث المساجد کے الفاظ یہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوٰی میں نزول فرماتے تھے اور وہاں صبح تک قیام کرتے تھے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز گاہ ایک بڑے ٹیلے پر ہے، وہاں جو مسجد بنی ہے، اس میں نہیں، بلکہ اس سے نیچے ہے" یہ چار ذوالحجہ اتوار کی تھی - اور یہ مجمع علیہ ہے - اور وہاں نماز صبح ادا کی - پھر اسی دن غسل فرمایا - اور اوجز میں بروایت بخاری ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: "یہاں تک کہ جب وہ (ابن عمر) ذی طوٰی آتے تو صبح تک وہاں رات بسر کرتے، پھر جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو غسل کرتے، اور فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا" یہ غسل مالکیہ کے نزدیک طواف کیلئے ہے - اس لئے حائضہ نہیں کرے گی - اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دخولِ مکہ کیلئے ہے - جیسا کہ اوجز میں ان کی فقہی کتابوں سے

ونهض الیٰ مکۃ (قلت) ما رًّا علی وادی الازرق وقال کانی انظر الیٰ موسی

ترجمہ: اور مکہ کی طرف چلے (ش) وادی ازرق سے گذرتے ہوئے اور فرمایا: گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔

بالتفصیل نقل کیا ہے۔ اسی طرح حاشیہ کوکب میں بھی۔ اور یہ غسل دخول مکہ کیلئے مستحب ہے۔ ابن منذر فرماتے ہیں کہ دخول مکہ کے وقت غسل کرنا تمام علماء کرام کے نزدیک مستحب ہے۔ اور ان کے نزدیک اس کے ترک سے فدیہ نہیں۔ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کی بجائے وضو بھی کافی ہے۔ کذا فی الفتح۔

ارشاد نبوی: گویا میں موسیٰؑ کو دیکھ رہا ہوں

اور مکہ کی طرف چلے (ش) وادی ازرق سے گذرتے ہوئے۔ جو مکہ سے ایک میل ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: یہ اَمَج سے پیچھے ہے۔ اور امج: ہمزہ اور میم کے فتحہ اور جیم کے ساتھ۔ وہاں ایک کھیتوں والی بستی ہے۔ اور فرمایا گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ کما فی المواہب۔ یہ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ اور بخاری میں بھی قریبًا یہی مضمون ہے (یعنی اما موسیٰ فکانی انظر الیہ اذا انحدر فی الوادی یلبی) حافظ فرماتے ہیں کہ "مہلب نے کہا ہے کہ "اس روایت میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کسی راوی کا وہم ہے۔ کیونکہ کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اور یہ کہ وہ حج کریں گے، البتہ یہ مضمون عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں وارد ہوا ہے اس لئے راوی کو اشتباہ ہو گیا" حافظ فرماتے ہیں: یہ ثقہ راویوں کی روایت کو محض وہم کی بنا پر غلط ٹھہرانا ہے۔ اسی مذکورہ سند سے یہ روایت کتاب اللباس میں آرہی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا اضافہ ہے۔ کیا یہاں بھی یہی کہا جائیگا کہ راوی نے غلطی سے اس نام کا اضافہ کر دیا؟ ۔ اور امام مسلم نے یہ حدیث بطریق ابو العالیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں موسیٰ علیہ کے علاوہ حضرت یونس علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے راوی نے غلطی سے یونس علیہ السلام کے نام کا اضافہ کر دیا؟ اور اہل تحقیق نے ارشاد نبوی: "گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں" کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ اول یہ کہ یہ ارشاد حقیقت پر محمول ہے۔ انبیاء علیہ السلام اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی مانع نہیں۔ کہ وہ اس حالت میں حج بھی کرتے ہوں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰؑ کو دیکھا۔ کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ مگر اس توجیہ کا تتمہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ آپ

ولہ جؤار الی اللّٰہ بالتلبیۃ (قال)، فدخل نہاراً

ترجمہ: درانحالیکہ وہ تلبیہ کہتے ہوئے بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔

(ق) پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے

کو انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا مشاہدہ ہوا۔ غالباً وہ دنیا میں آپ کے سامنے اسی طرح متمثل ہوئی ہوں گی، جس طرح شب معراج میں ہوئی تھیں۔ مگر ان کے اجسام قبروں میں تھے۔ دوم یہ کہ ان حضرات کے دنیوی حالات آپ کے سامنے متمثل ہوئے یعنی دنیا میں جس طرح انہوں نے عبادت کی تھی، حج کیا تھا، تلبیہ پڑھا تھا۔ اس کا کشف آپ کو ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں"۔ سوم یہ کہ بذریعہ وحی آپ کو ان امور کی اطلاع دی گئی اور وحی کی قطعیت کی بنا پر فرمایا: "گویا میں دیکھ رہا ہوں"۔ چہارم یہ کہ یہ رؤیت شاید آپ کو کسی گذشتہ خواب میں ہوئی ہوگی۔ پھر جب آپ نے حج کیا تو وہ خواب کا واقعہ یاد آیا اور اس کا تذکرہ آپ نے فرمایا۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہی توجیہ معتمد ہے"۔ حافظ کا کلام مختصراً ختم ہوا۔ یہ توجیہات نووی نے شرح مسلم میں قاضی عیاض سے بھی نقل کی ہیں۔

درانحالیکہ وہ تلبیہ کہتے ہوئے بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں: "جؤار" بضم جیم اور ہمزہ مفتوحہ ممدودہ اور راء کے ساتھ یعنی بلند آواز۔ ابو نعیم کہتے ہیں "جؤار" ایسی آواز کو کہتے ہیں جس میں فریاد طلبی اور گڑگڑانا پایا جائے"۔ اور بخاری کی "حدیث مساجد" میں ذی طوی میں رات کے قیام کے بعد مذکور ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہاڑ کے دو کونوں کی طرف رخ کیا جو آپ کے اور طویل پہاڑ کے درمیان کعبہ کی جانب تھا پس اس مسجد کو، جو وہاں بنائی گئی ہے، اس مسجد کے، جو ٹیلے کے کنارے پر ہے، بائیں جانب کیا"۔

پس آپ مکہ میں دن کو داخل ہوئے جمہور کے نزدیک

مکہ میں دن کو داخل ہونا بہتر ہے یا رات کو؟ اولیٰ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں دن کے وقت داخل ہو۔ اور اس میں چار مذاہب جو اوجز میں دو جگہ یعنی باب غسل المحرم اور باب الحلاق میں ذکر کیے ہیں۔ اس میں ہے کہ امام مالکؒ اور حنفیہ کے نزدیک مکہ میں دن کو داخل ہونا مستحب ہے۔ شافعیہ سے بھی صحیح تر روایت یہی ہے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دن رات برابر ہیں۔ علامہ موفق اسی طرف مائل ہیں۔

من اعلاها ــــــــــــ ترجمہ: بالائی جانب سے۔

اور نووی نے بعض تابعین سے رات کی افضلیت نقل کی ہے۔ اور بعض نے امام اور غیر امام کے مابین فرق کیا ہے۔ یعنی جو شخص امام اور مقتدیٰ ہو اس کے لئے دن کو داخل ہونا مستحب ہے۔ تاکہ لوگ اسکے عمل کو دیکھیں۔ امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح میں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:" باب دخول مکہ نہارًا او لیلاً" اور اس کے تحت ابن عمرؓ کی حدیث ذکر کی ہے جس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دن کو داخل ہوئے، اور اس میں رات کو داخل ہونے کی حدیث ذکر نہیں کی۔ میرے" تراجم بخاری" میں اس ترجمہ کے ثبوت کی متعدد توجیہات مذکور ہیں۔

آنحضرتؐ کا اعلیٰ مکہ سے داخل ہونا

بالائی جانب سے یعنی ثنیۂ عُلیا سے، عزیز محمد رابع ندوی لکھتے ہیں: "یہ جگہ آجکل" معابدہ" کے نام سے معروف ہے، یہاں شاہی محل بنے اور وہ آج کل رابطۂ عالم اسلامی کا صدر دفتر ہے:" اور یہی گھاٹی جبل حجون پر چڑھتی ہے۔ الہدیٰ میں اسی طرح ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ ثنیۂ علیا وہ گھاٹی ہے جو اعلیٰ مکہ میں واقع ہے اور وہاں سے معلیٰ اور مقابر مکہ کی طرف اترتے ہیں۔ یہ محصب کے پہلو میں ہے۔ اور اسی کو حجون۔ حائے مہملہ کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے:" اھ اور معجم میں ہے کہ:" حجون: مکہ کی بالائی جانب ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس قبرستان ہے، بکری کہتے ہیں یہ جگہ بیت اللہ سے ڈیڑھ میل ہے:" حافظ فرماتے ہیں، حجون کی چڑھائی دشوار تھی۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد دیگر سلاطین نے اسے آسان بنایا حافظؒ نے اس سلسلہ میں اپنے زمانے تک ان سلاطین کے نام بھی ذکر کئے ہیں۔ اعلیٰ مکہ سے داخل ہونا جمہور کے نزدیک مطلقًا مندوب ہے۔ اور مالکیہ کے نزدیک صرف ایسے شخص کے لئے مندوب ہے جو راہ مدینہ سے آئے، خواہ وہاں کا باشندہ ہو یا نہ ہو۔ اور جو شخص کسی اور راستے آئے اس کے لئے یہاں سے داخل ہونا مستحب نہیں، خواہ وہ مدینہ طیبہ کا ہی باشندہ کیوں نہ ہو۔ کذا فی الاوجز۔

آنحضرتؐ عمرہ میں اعلیٰ مکہ سے داخل ہوئے یا اسفل مکہ سے؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ میں اسفل مکہ سے داخل ہوتے تھے کذا فی الہدیٰ۔ اور تلخیص بذل میں ہے کہ اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ کا استدلال غالبًا ابو داؤد کی اس روایت سے ہے جو بطریق ہشام بن عروہ عن عائشہؓ مروی ہے اور جس میں یہ لفظ ہے کہ عمرہ میں آپؐ کدیٰ سے داخل ہوئے۔ مگر شیخ قدس سرہٗ نے بذل میں تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ روایت مضطرب ہے۔ اور علامہ عینی نے اس حدیث

(قلت) وهل رفع يديه الكريمتين لما
ترجمہ: (ش) اور جب بیت اللہ شریف پر آنحضرت صلی اللہ

پر جس میں یہ ہے کہ آپ کداء یعنی اعلیٰ مکہ سے داخل ہوئے تھے' بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس سے معلوم ہوا کہ مکہ میں ثنیۂ علیاء سے داخل ہونا مستحب ہے۔ اور خروج بائیں جانب سے بہتر ہے۔ حج وعمرہ کرنے والے اس میں یکساں ہیں" اھ تفصیل بذل میں ہے۔

آپ کس دن مکہ میں داخل ہوئے

شیخ ابن قیم فرماتے ہیں "جن لوگوں نے کہا کہ آپ منگل کو مکہ میں داخل ہوئے یہ ان کا وہم ہے' طبری نے یہ قول نقل کیا ہے" آھ

میں کہتا ہوں کہ ابن سعد کی جو روایت ابھی گذری کہ حضرت عائشہؓ مقام سرف میں سوموار کے دن حائضہ ہوئیں' اس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے لہذا یہ بھی صریح غلط ہے' جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ کیونکہ تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ آپ مکہ مکرمہ میں ۴ ذی الحجہ کو بروز اتوار داخل ہوئے۔ منجملہ ان کے بخاری کی طویل حدیث ہے جو بروایت کریب عن ابن عباسؓ مروی ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ "پس آپ مکہ میں تشریف لائے جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گذر چکی تھی" نیز بخاری میں ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ابن عباسؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں "آپ ۴ ذی الحجہ کی صبح کو حج کا تلبیہ پڑھتے ہوئے تشریف لائے"۔ یہ روایت امام مسلم نے بھی ذکر کی ہے۔ اور نسائی میں بطریق ابی العالیہ ابن عباس کی روایت کے لفظ یہ ہیں "جب کہ ذی الحجہ کی چار راتیں گذر چکی تھیں" نیز اسی میں حضرت جابر کی حدیث میں ہے: "آپ مکہ میں ذی الحجہ کی چوتھی رات کی صبح کو تشریف لائے" حضرت جابر کی یہ حدیث ابوداؤد نے بھی دو طریقوں سے روایت کی ہے' اور صاحب مشکوٰۃ نے بروایت مسلم اس کو ذکر کیا ہے۔ اور امام بخاری نے بھی احکام میں اس کو روایت کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسفل مکہ سے نکلنے کے بیان میں آئے گا کہ آپ نے داخل ہونے اور نکلنے کے راستے کس مقصد کے لئے تبدیل فرمائے۔

نیز اس کا کچھ حصہ اس بحث میں آئیگا کہ آپ عرفات کو "ضب" کے راستے سے تشریف لے گئے۔ اور "مازمین" کے راستے سے مراجعت فرمائی۔

بیت اللہ کو دیکھنے کے وقت ہاتھ اٹھانا

(ش) اور جب بیت اللہ شریف پر آنحضرت صلی اللہ

و قع بصره على البيت؟ اختلف فيه الروايات، قال، ثم سار حتى دخل المسجد

ترجمہ: سلم کی نظر پڑی تو آپ نے ہاتھ مبارک روایات مختلف ہیں دق، پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوئے

علیہ وسلم کی نظر پڑی، تو آپ نے ہاتھ مبارک اٹھائے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ جن کی تفصیل بذل۔ اس کی تلخیص نیز البدایہ والنہایہ میں ہے، یہ رفع یدین ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحب اور امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں رفع کو اور شرح لباب میں عدم رفع کو ترجیح دی ہے۔ مختلف روایات میں تطبیق شیخ نے بذل میں ملا علی قاریؒ سے اس طرح نقل کی ہے کہ اثبات کو اول روئیت پر اور نفی کو ہر مرتبہ کی روئیت پر محمول کیا جائے۔ شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں: "یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ اثبات کی روایات سے مراد یہ ہے کہ دعا کے لئے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ان کو سینے تک اٹھایا۔ اور ترک رفع سے مراد ہے کہ جس طرح تحریمہ میں کانوں تک ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اس طرح تعظیم بیت اللہ کی خاطر نہیں اٹھائے۔"

دق، پھر آپ چلے یہاں تک کہ مسجد میں باب السلام سے داخل ہوئے۔ مشکوٰۃ میں بحوالہ صحیحین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "آپ جب مکہ میں تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وضو فرمایا۔" ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: "یعنی وضو کی تجدید کی۔ کیونکہ پہلے گذر چکا ہے کہ آپ دخول مکہ کے لئے غسل فرماتے تھے۔ یا معنی لغوی مراد ہیں۔" اھ امام بخاریؒ نے اس پر "الطواف علی وضوء" کا باب باندھا ہے۔ گویا امام بخاریؒ کے نزدیک حدیث کا محمل یہ ہے کہ آپ نے طواف کی خاطر وضو پر وضو کیا تھا۔

طواف کے لئے طہارت کا حکم طواف کے لئے طہارت ضروری ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ موفق کہتے ہیں: "امام احمدؒ کی مشہور روایت یہ ہے کہ طواف کے لئے حدث اور نجاست سے پاک ہونا شرط ہے۔ یہی امام مالکؒ اور شافعیؒ کا قول ہے۔ اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں طہارت شرط نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ طہارت شرط نہیں۔ ان کے اصحاب میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت۔" اھ مختصراً۔ اور صاحب لباب نے حدث سے پاک ہونے کو مطلقاً طواف کے واجبات میں شمار کیا ہے۔

وذالك ضحى واستقبل ودعا۔ فلما دخل عمد الى البيت ولم يركع تحية المسجد فلما حاذى الحجر الاسود استلمہٗ۔

ترجمہ: اور یہ چاشت کا وقت تھا اور آپؐ نے بیت اللہ کا استقبال کیا اور دعا فرمائی پس داخل ہوتے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد نہیں پڑھی اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا۔

باب السلام کی جانب سے مسجد میں داخل ہونا ملا علی قاریؒ نے ذکر کیا ہے، اور الہدی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے داخل ہوئے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ اور مرآۃ میں ہے کہ "طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدمناف کے دروازے سے داخل ہوئے۔ جسے آجکل باب بنی شیبہ یا باب السلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ چاشت کا وقت تھا۔ اور آپ نے بیت اللہ کا استقبال کیا۔ اور دعا فرمائی۔ اور طبرانی نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلعم جب بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللّٰهم زد بيتك هذا تشريفا وتعظيما وتكريما ومهابةً۔ اے اللہ! اپنے اس گھر کی شرافت و عظمت اور تکریم وہیبت میں اضافہ فرما۔

بیت اللہ کو دیکھنے کے وقت کی مختلف دعائیں روایات میں آئی ہیں۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔

مسجد حرام میں تحیۃ المسجد کا حکم

پس داخل ہوتے ہی بیت اللہ کا قصد کیا اور تحیۃ المسجد نہیں پڑھی۔ کیونکہ کعبہ کا سلام طواف ہے، جیسا کہ الہدی اور بذل میں ہے۔ موفق فرماتے ہیں: "جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو اس کے لئے مستحب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے طواف سے ابتدا کرے جیسا کہ حضرت جابرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے۔ اور یہی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ اور اس لئے کہ طواف مسجد حرام کا سلام ہے۔ پس جس طرح دوسری مساجد میں داخل ہو کر سب سے پہلے تحیۃ المسجد پڑھنا مستحب ہے اسی طرح یہاں طواف مستحب ہے۔"

حجر اسود کا استلام اور اس کے آداب

اور جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اس کا استلام کیا اور اسے بوسہ دیا۔ استلام کے معنیٰ ہیں ہاتھ سے چھونا اور حجر اسود کو بوسہ دینے کی روایات البدایہ والنہایہ میں مذکور ہیں اور ایک روایت میں سجدے کا بھی ذکر ہے، اوجز میں اس پر بڑی مفصل بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ "گذشتہ بحث سے معلوم ہوا کہ یہاں چند مسائل میں اختلاف ہوا ہے، اوّل یہ کہ جمہور علماء مسئلۂ استلام میں طواف واجب اور نفل کے درمیان

فرق نہیں کرتے۔ مالکیہ کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ مگر المدونہ میں اسے طواف واجب کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ دوم تقبیل بالصوت (یعنی اس طرح بوسہ لینا کہ اس کی آواز آئے اس کے جواز وعدم جواز) میں اختلاف ہے، بہت سے مالکیہ کے نزدیک یہ مباح ہے اور جمہور علماء کے نزدیک نہیں سوم: حجر اسود پر سجدہ کرنا امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے۔ حنفیہ کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ راجح یہ ہے کہ مندوب ہے۔ چہارم: ہاتھ وغیرہ سے حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد اس کا چومنا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مندوب ہے۔ اور امام مالک کے نزدیک یہ مندوب نہیں۔ بلکہ بغیر تقبیل کے ہاتھ چھوڑ دے۔ پنجم: اگر استلام ممکن نہ ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک بغیر اشارے کے تکبیر کہے، اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف اشارہ کردے مگر جس چیز سے اشارہ کیا ہے اسے چومے نہیں۔ اور امام شافعیؒ اور حنفیہ کے نزدیک اس چیز کو چوم لے"۔ اھ

شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: استلام کے وقت ہاتھ نہ اٹھائے۔ نہ اسے تکبیر کے ساتھ شروع کرے۔ جیسا کہ نماز کیلئے تکبیر کہی جاتی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا بدعت ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بدعت نہیں بلکہ تکبیر جمہور علماء کے نزدیک ثابت ہے۔ بلکہ بالاجماع ثابت ہے۔ اور تقبیل کے وقت ہاتھ اٹھانا حنفیہ اور بعض شافعیہ کے نزدیک ثابت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے: "پھر حجر اسود سے ابتدا کرے، پس اس کا استقبال کرے اور تکبیر وتہلیل کہے: کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو حجر اسود سے ابتدا کی، پس اس کا استقبال کیا اور تکبیر وتہلیل کہی۔ اور اپنے ہاتھوں کو اٹھائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صرف سات موقعوں پر ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ من جملہ ان کے استلام کو ذکر فرمایا"۔ اور مفکرۃ العالم (مطبوعہ حلب ۱۳۸۹ھ) میں ہے کہ: "استلام کے وقت ہاتھ اٹھانا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت ہے۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مستحب نہیں"۔ اھ اور المدونہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں: "امام شافعیؒ، حنابلہ اور ابن حبیب مالکی کے نزدیک یہ مستحب ہے کہ ابتدائے طواف اور استلام حجر کے وقت یہ دعا پڑھے، بسم اللہ واللہ اکبر الخ (یہاں پوری دعا نقل کی ہے) اور دردیر فرماتے ہیں کہ تقبیل کے ساتھ تکبیر کہنا معتمد ہے۔ مگر دردیر اور شارح اقناع نے رفع یدین کا ذکر نہیں کیا۔ اور نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: "استلام حجر سے پہلے نیز طواف شروع کرنے کے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہنا مستحب ہے"۔ ابن حجر اس کے حاشیہ

ورمل فی طوافه هذا۔

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طواف میں رَمل کیا۔

یں لکھتے ہیں: "محب طبری نے کہا ہے کہ طواف کو تکبیر سے شروع کرنا واجب ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ مگر یہ قول ضعیف ہے، غالباً انہوں نے یہ قول دلیل کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ اور شیخ ابو حامد کا یہ قول بھی کہ "ابتدائے طواف میں نماز کی طرح کندھوں تک اٹھانا مسنون ہے" ضعیف ہے۔ مگر یہ قول نقل کے اعتبار سے ضعیف ہے دلیل کے اعتبار سے ضعیف نہیں۔ اگرچہ ابن جماعہ نے اسے بدعت کہا ہے، کیونکہ مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں۔ مگر استقبال حجر کے وقت ہاتھ اٹھانا حنفیہ کے نزدیک اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سلف کی ایک جماعت سے یہ عمل ثابت ہے۔ اور ابو ذر الہروی نے اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے اور ان کا طواف کو نماز پر قیاس کرنا، اس کے شروط اور اکثر سنن میں، اس کا مؤید ہے۔" اھ

رَمل کا حکم اور آپ نے اس طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا، البدایہ والنہایہ نے اس سلسلہ کی روایات کی تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ اور رمل کے مسئلہ پر اوجز میں نیز میرے حاشیہ بذل میں سات بحثیں ذکر کی گئی ہیں۔

اول: اس کے ضبط اور معنیٰ میں۔ پس رَمل (را) اور میم کے فتحہ کے ساتھ اور بقول بعض میم کے سکون کے ساتھ ہے کے معنیٰ یہ ہیں کہ چھوٹے چھوٹے قدم لے کر کندھے ہلاتے ہوئے تیز تیز چلے، مگر دوڑے نہیں۔ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف البحر العمیق میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

دوم: اس کی مشروعیت میں: جمہور کے نزدیک یہ مشروع ہے، البتہ ابن عباسؓ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ علامہ ابی فرماتے ہیں کہ "ابن عباسؓ کا مذہب یہ ہے کہ یہ سنت نہیں۔ مگر دیگر علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں" میں کہتا ہوں کہ امام ابوداؤد نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے طواف میں رَمل کیا تھا، اور یہ سنت ہے، فرمایا: انہوں نے ایک بات صحیح کہی اور ایک غلط، میں نے کہا صحیح کیا اور غلط کیا؟ فرمایا: یہ تو صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل کیا تھا، مگر یہ غلط ہے کہ یہ سنت ہے الخ ایک روایت میں ان سے ابتداءِ رَمل کا یہ سبب منقول ہے کہ قریش مسلمانوں کے بارے

واضطبع بردائہ،

ترجمہ: اور اپنی چادر کا اضطباع کیا۔

چھڑی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتے اور استلام کرتے اور اسے چوم لیتے۔

میں یہ کہتے تھے کہ یہ تو ہرنوں کی طرح لاغر ہیں، ابن عباسؓ نے فرمایا اس بنا پر رمل مسنون ہوا۔

سوم: اس کے حکم میں: جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے مگر اس کے ترک سے کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ البتہ امام مالکؒ سے ایک روایت ہے کہ جب تک مکہ میں رہے اس کا اعادہ کرے۔ بعد میں انہوں نے اس روایت سے رجوع کر لیا تھا۔ ابن الماجشون سے روایت ہے کہ اس کے تارک پر دم واجب ہے۔ اور ابن حزم اس کے وجوب کی طرف مائل ہیں۔

چہارم: رمل جمہور کے نزدیک چاروں طرف ہوگا: ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے البتہ تابعین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ رکنین کے درمیان رمل نہیں۔ یہی امام شافعیؒ کی ایک ضعیف روایت ہے۔

پنجم: آیا یہ صرف آفاقی کے ساتھ مخصوص ہے یا مکی بھی رمل کرے؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مکی اور غیر مکی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مگر امام احمد فرماتے ہیں کہ اہل مکہ کے ذمہ رمل نہیں۔

ششم: حنابلہ کے نزدیک رمل صرف طوافِ قدوم میں ہوسکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر ان کا صحیح قول یہ ہے اور ہمارا قول بھی یہی ہے کہ رمل ہر اس طواف میں ہوسکتا ہے، جسکے بعد سعی ہو۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ طواف قدوم میں کرے، اگر اس میں نہیں کیا تو طواف زیارۃ میں کرے۔

ہفتم: جس طرح پہلے تین چکروں کا وظیفہ رمل ہے۔ اسی طرح بقیہ چار چکروں کا وظیفہ سکون و وقار ہے۔

اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: "رمل کا تدارک مشروع نہیں، پس اگر پہلے تین چکروں میں رمل نہیں کیا تو باقی چار میں اس کی قضا نہ کرے، کیونکہ انکی ہیئت سکون ہے۔ اس میں تبدیلی نہ کی جائے" اھ

اضطباع کا حکم

اور اپنی چادر کا اضطباع کیا، بذل میں مجمع سے نقل کیا ہے کہ اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کا درمیانی حصہ داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں کنارے بائیں کندھے پر آگے پیچھے لٹکائے جائیں۔ اس کو اضطباع اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے فوق

وکلما حاذی الحجر الاسود اشار الیه واستلمہ بالمحجن وقبّلہ۔

ترجمہ: اور جب (طواف کرتے ہوئے) حجر اسود کے برابر آتے تو

پہلو ظاہر ہو جاتے ہیں:" اور حاشیۂ اوجز میں ہے کہ موفق لکھتے ہیں:" اضطباع طواف قدوم میں مستحب ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ سنت نہیں" حنفیہ بھی اس کی سنیت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اور جب (طواف کرتے ہوئے) حجر اسود کے برابر آتے تو چھڑی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر کے اس کا استلام کرتے اور اسے چوم لیتے۔ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف گذر چکا ہے۔

رکن یمانی کی تقبیل ثابت نہیں

(ق) ان لوگوں کو وہم ہوا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف میں رکن یمانی کی تقبیل فرماتے تھے، تقبیل تو حجر اسود ہی کی ہے، چونکہ حجر اسود کو اور اس کے پاس والے رکن کو ملا کر یمانیین کہا جاتا ہے، اس لئے بعض نے تنہا حجر اسود کو بھی یمانی سے تعبیر کیا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکن یمانی کا استلام کیا، مگر یہ ثابت نہیں کہ اس کو بوسہ بھی دیا۔

طواف پیدل کیا جائے یا سواری پر؟

(ش) بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر طواف کیا۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ شیخ ابن ہمامؒ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ آپؐ نے اس حج میں متعدد طواف کئے تھے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے یہی توجیہ امام شافعیؒ سے نقل کی ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

رہا یہ کہ طواف پیدل کرنا واجب ہے یا مستحب؟ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ پیدل چلنا مستحب ہے، اور ملا علی قاری کے مناسک میں ہے کہ واجب ہے۔ اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں:" اس میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ عذر کی حالت میں سواری پر طواف کرنا صحیح ہے۔ باقی رہا بغیر عذر کے سواری پر یا کسی کے کندھے پر سوار ہو کر طواف کرنا؛ سو خرقی کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں، یہ امام احمد کی ایک روایت ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ صحیح ہے۔ اور یہی امام مالکؒ کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ جب تک مکہ میں ہے اس کا اعادہ کرلے اور اگر اعادہ کئے بغیر واپس آگیا تو دم دے کر اس کی تلافی کرے۔ امام احمد کی تیسری روایت یہ ہے کہ صحیح ہے اور اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ اس میں اختلاف نہیں کہ پیدل طواف کرنا افضل ہے۔" اور میں کہتا ہوں کہ موفق نے

فلمّا فرغ من طوافه۔

ترجمہ: پس جب طواف سے فارغ ہوئے۔

امام ابوحنیفہؒ کا جو مذہب نقل کیا ہے امام مالک کے مذہب میں بھی یہی راجح ہے کہ جب تک مکہ میں ہو اعادہ کرے اور اگر یونہی لوٹ آیا تو دم واجب ہوگا۔ جیسا کہ دسوقی نے لکھا ہے، تفصیل اوجز میں ہے۔

شیخ قدس سرہٗ نے کوکب میں اس پر نہایت عمدہ کلام کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر طواف کیا، یہ ہمارے نزدیک عذر کی بنا پر جائز ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر یہ تھا کہ ہجوم کی وجہ سے لوگ آپ کے پیدل طواف کرنے میں تنگی محسوس کرتے تھے۔ نیز اسکی ضرورت بھی تھی تاکہ لوگ آپؐ کے افعال کو دیکھیں اور آپؐ ان کے سوالات کا جواب دیں، اور یہ ساری چیزیں سوار ہوئے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھا تھا، چنانچہ آپؐ کے بعد انہوں نے بلا عذر سواری پر طواف نہیں کیا۔"

حضرت شیخ قدس سرہٗ کے کلام کی تائید مندرجہ ذیل روایات سے ہوتی ہے۔ امام مسلم اور ابوداؤدؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اونٹنی پر طواف کیا۔ آپؐ چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دیکھ سکیں اور آپؐ اونچے رہیں اور لوگ آپؐ سے مسائل دریافت کرسکیں، کیونکہ آپؐ کے گرد انسانوں کا ہجوم تھا۔" اور ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ "آپؐ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ لوگوں کو مار مار کر آپؐ سے ہٹایا جائے۔" اور ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے درآنحالیکہ آپؐ علیل تھے۔ پس آپؐ نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا، الخ۔" اس حدیث کو بیہقیؒ نے ضعیف اور زیلعیؒ نے قوی کہا ہے۔ اس علت کی طرف امام بخاریؒ نے "باب المریض یطوف راکبًا" میں اشارہ کیا ہے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے کہا ہے، اور نوویؒ نے انکی پیروی کرتے ہوئے مزید کہا: "احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر طواف کرنا ان تمام اسباب کی وجہ سے ہوا ہو۔" اھ۔

طوافِ قدوم کا حکم

پس جب آپؐ طواف سے فارغ ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ طوافِ عمرہ تھا، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو فتح میں داؤدی سے نقل کیا ہے کہ "یہ طواف فرائض حج میں سے تھا۔" اور دیگر حضرات کے نزدیک یہ طوافِ قدوم تھا۔ طوافِ قدوم کے حکم

جاء الی خلف المقام

ترجمہ: تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے

میں اختلاف ہے جیساکہ اوجز اور میرے حاشیۂ بذل میں اس پر مختصر کلام کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ امام احمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ جیساکہ المغنی میں ہے۔ امام مالک کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعیؒ سے موفق نے وجوب نقل کیا ہے۔ مگر شافعیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ سنت ہے جیساکہ شرح مہذب اور مناسک نووی میں ہے۔ اور ہمارے (حنفیہ کے) نزدیک سنت ہے جیسا کہ تمام معتبر کتابوں میں ہے۔ البتہ خزانۃ المفتین میں اس کا وجوب نقل کیا ہے، جیساکہ شرح لباب میں ہے۔ رہی یہ بحث کہ آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف قدوم کیا تھا؟ طحاویؒ کا جواب بظاہر نفی میں ہے، اور جن حضرات نے یہ کہا ہے۔ جیساکہ آگے آتا ہے۔ کہ اس طوافِ مذکور کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے قریب نہیں گئے ان کے قول کا مفہوم بھی یہی نفی ہے۔ مگر حنفیہ کے مسلک کے مطابق یہ محل اشکال ہے کیونکہ ان کے نزدیک قارن کے لئے آتے ہی دو طواف ضروری ہیں۔ طواف عمرہ اور طوافِ قدوم۔ جیساکہ فقہ حنفی کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ان چار دنوں میں کئی طواف کئے ہوں گے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامتِ منیٰ کے دوران بھی طواف ترک نہیں کیا۔ جیساکہ آگے آتا ہے۔ لہذا یہ بعید از قیاس ہے کہ اقامتِ مکہ کے دوران چھوڑ دیا ہو۔ تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے۔ ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے مطابق مقام ابراہیم آج بھی اسی جگہ ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ اور سالم کی وہ روایت غریب ہے جس میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پیچھے ہٹا کر موجودہ جگہ رکھا تھا؛ اھ حافظ فرماتے ہیں کہ ازرقیؒ نے "اخبار مکہ" میں صحیح سندوں سے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اسی جگہ تھا جہاں آج ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سیلاب آیا تھا جو اس کو بہا کرلے گیا یہاں تک کہ اسفلِ مکہ سے؛ سیلاب ہوا۔ اور اسے لاکر کعبہ شریف کے غلاف سے باندھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ تشریف لائے۔ پس اس کے معاملہ میں تفتیش فرمائی، جب اس کی پہلی جگہ کی تحقیق ہوگئی تو اسے دوبارہ اسی جگہ رکھا اور اس کے گرد تعمیر بنوائی۔ پس جب سے اب تک اسی جگہ قائم ہے"؛ اھ میں کہتا ہوں کہ آج سنہ ۱۳۹۰ھ تک وہ اپنی جگہ موجود ہے۔

فقرأ "واتخذوا من مقام ابراهیم مصلّی" وصلی رکعتین فلما فرغ من صلوته استلم الحجر الاسود،

ترجمہ: پس یہ آیت پڑھی "اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ" اور دو رکعتیں ادا کیں، پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔

پس یہ آیت پڑھی: "اور بناؤ مقام (ابراہیم) کو نماز کی جگہ" اور دو رکعتیں بایں کیفیت ادا کیں کہ مقام ابراہیم آپ کے اور بیت اللہ شریف کے درمیان تھا۔ اور ان دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھی، جیسا کہ مسلم اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔

دوگانہ طواف کا حکم

دوگانۂ طواف کے حکم میں اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک واجب اور امام احمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ شافعیہ کے دو قول تو یہی ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ طواف واجب ہو تو یہ بھی واجب ہے ورنہ سنت۔ مالکیہ کے تین قول تو یہی ہیں۔ اور ان کا چوتھا قول یہ ہے طواف واجب کے بعد ہو تو واجب ہے ورنہ تردد ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض نماز دوگانۂ طواف کے قائم مقام ہوسکتی ہے، امام ابوحنیفہؒ اور مالکؒ کے نزدیک نہیں ہوسکتی۔ اور امام احمدؒ سے دونوں روایتیں ہیں۔

طواف سے فارغ ہوکر حجر اسود کا استلام کرنا اور زمزم پینا

پس جب اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو حجر اسود کا استلام کیا۔ یہ استلام ائمہ اربعہ سب کے نزدیک مستحب ہے۔ موفق فرماتے ہیں کہ ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ جیسا کہ اوجز میں ہے، اور اوجز میں ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ "جس طواف کے بعد سعی ہو اس میں استلام مستحب ہے، کیونکہ جس طرح طواف استلام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح سعی بھی"۔ اھ۔ ملّا علی قاریؒ استلام کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: "بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کی طرف لوٹنے کے بعد زمزم پر آئے اور پانی پیا اور اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔ پھر لوٹ کر حجر اسود کا استلام کیا"۔ اھ میں کہتا ہوں کہ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم پینے کی روایت مناسک حج کی کتابوں میں تو ابھی تک مجھے نہیں ملی۔ البتہ الدر دیرؒ نے سنن سعی میں دوگانۂ طواف کے بعد تقبیل حجر کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: "اور مندوب ہے کہ زمزم پر جائے اور اس سے پانی پئے، پھر سعی کے لئے نکلے"۔

ثم خرج الی الصفا۔ فلما دنا منه قرأ: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" ابدأ بما بدأ الله به۔ فرقی علیه

ترجمہ: پھر صفا کی طرف نکلے۔ پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" اور فرمایا: میں اسی سے ابتدا کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے، پس صفا پر چڑھے

یہ سطور زیر قلم تھیں کہ مسند احمد میں حضرت جابرؓ کی حدیث دیکھی جس میں طواف کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزم شریف پینے کا ذکر ہے، جس سے ملا علی قاریؒ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ طواف افاضہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمزم شریف پینا معروف ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور وہیں یہ بات بھی آئے گی کہ زمزم شریف کوثر سے افضل ہے اور زمزم شریف ساتھ لانے کا بیان آخر رسالہ میں آئیگا۔

باب صفا سے صفا کی طرف نکلنا

پھر صفا کی طرف باب صفا سے نکلے، چنانچہ طَبرانی کی معجم صغیر میں حدیث جابرؓ کے لفظ یہ ہیں "پھر نکلے باب صفا سے" اور نسائی میں ابن عمرؓ سے مروی ہے: "پھر نکلے صفا کی طرف اس دروازے سے جس سے صفا کی طرف نکلا جاتا ہے"۔ نوویؒ اپنے مناسک میں فرماتے ہیں کہ اس دروازے سے نکلنا سنت ہے۔ مگر صاحب ہدایہ نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "اور جس دروازے سے چاہے نکلے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باب صفا سے اس لئے نکلے تھے کہ صفا کو جانے کا قریب تر دروازہ یہی تھا، نہ اسلئے کہ یہ سنت ہے۔" اور صاحب لُباب نے بدائع وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ مستحب ہے، اسی طرح الموفق نے بھی المغنی میں اس کا استحباب ذکر کیا ہے۔

صفا سے سعی کی ابتدا کرنا

پس جب اس کے قریب پہنچے تو یہ آیت پڑھی: "ان الصفا والمروة من شعائر الله" اور فرمایا: میں اسی سے ابتدا کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے۔ صفا سے سعی کی ابتدا کرنا جمہور کے نزدیک واجب ہے، ائمہ اربعہ بھی اس پر متفق ہیں۔ بلکہ اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے مروہ سے ابتدا کی تو اس پھیرے کا اعتبار نہیں ہوگا (بلکہ صفا سے مروہ تک پہلا پھیرا شمار ہوگا) اس میں بعض تابعین اور بعض عراقیوں کا اختلاف ہے، جیسا کہ اوجز میں مفصل مذکور ہے۔ پس صفا پر چڑھے۔ صفا پر اس قدر

ودعا، ثم نزل الی المروة یمشی فلما انصبت قدماہ فی بطن الوادی سعی۔
اور دعائیں کیں۔ پھر مروہ کی طرف اتر کر معتاد رفتار سے چلے۔ اور جب قدم مبارک وادی کے
اندر پہنچے تو تیز رفتاری سے چلے۔

چڑھنا کہ بیت اللہ شریف نظر آئے ائمہ اربعہ کے نزدیک سنت ہے، البتہ بعض شوافع کا اس میں اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ "پس اتنا چڑھے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے کیونکہ چڑھنے سے مقصود صرف بیت اللہ کا استقبال ہے" اھ اور مختلف دعائیں کیں۔ جو احادیث میں وارد ہیں، بیہقی کی روایت میں ہے کہ صفا میں جو شگاف ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جن پر سورۃ بقرہ نازل ہوئی اسی جگہ کھڑے تھے۔ پھر اتر کر مروہ کی طرف معتاد رفتار سے چلے اور جب قدم مبارک وادی کے اندر پہنچے تو تیز رفتاری سے چلے، جیسا کہ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں ہے۔ وادی کی ڈھلان سے مراد اس زمانہ میں میلین اخضرین کا درمیانی حصہ ہے۔ کیونکہ یہ ڈھلان ایک زمانے سے باقی نہیں رہی۔ اس حصہ کے اندر قدرے تیز رفتار سے دوڑنا سنت ہے

میلین اخضرین کے درمیان دوڑنا اور اس سے پہلے صفا کی جانب اور اس کے بعد مروہ کی طرف معتاد رفتار سے چلنا جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں اقوال مختلف ہیں، ان کی تفصیل بھی اوجز میں ہے۔ اوجز میں باجی سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی نے بطن وادی میں سعی نہیں کی تو اس کے بارے میں امام مالکؒ کے قول مختلف ہیں۔ ان سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دم واجب ہوگا۔ پھر اس قول سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے ذمہ کچھ نہیں، ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ "جو شخص سعی کے دوران دوڑا نہیں اس کے بارے میں امام مالکؒ کے قول مختلف ہیں، کبھی فرمایا کہ اعادہ کرے، کبھی فرمایا کہ اعادہ کی ضرورت نہیں کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ دم ہے۔ کبھی فرمایا کہ اس کے ذمہ کچھ نہیں" فقہ مالکی کی کتابوں میں تیز چلنے کو مسنون لکھا ہے۔ اور نوویؒ فرماتے ہیں کہ "اس مقام میں تیز چلنا ساتوں چکروں میں مستحب ہے، اور اس کے ماقبل و مابعد میں معتاد رفتار سے چلنا مستحب ہے۔ تاہم اگر تمام سعی آہستہ چل کر کی، یا تمام دوڑ کر کی تب بھی کفایت کریگی، مگر اس سے فضیلت فوت ہوگئی یہ امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا مذہب ہے" اھ موفق فرماتے ہیں "بطن وادی

کے اندر دوڑ کر چلنا سنت مستحبہ ہے اور اس کے تارک پر کچھ نہیں کیونکہ اگر بیت اللہ کے طواف میں رمل نہ کرے تو کچھ لازم نہیں آتا، پس صفا مروہ کے درمیان اگر رمل نہ کرے تو بدرجہ اولیٰ کوئی چیز واجب نہیں ہونی چاہیئے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہی حکم حنفیہ کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ ان کی فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ انتہی ملخصًا من الاوجز۔

آنحضرت کی سعی پیدل تھی یا سواری پر؟

اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طواف اور سعی دونوں پیدل تھے۔ اور مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ آپؐ نے طواف اور سعی سواری پر کی تھی۔ اور شیخ ابن عربی نے محاضرۃ الابرار میں اسی پر جزم کیا ہے، ابن حزمؒ نے ان دونوں کے درمیان یوں تطبیق دی ہے کہ جب اونٹ سوار کو لے کر وادی میں اترا تو گویا سوار خود اتر گیا (اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ آپؐ کے قدم بطن وادی میں اترے) اور حافظ ابن قیمؒ نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ آپؐ نے پہلے پیدل سعی شروع کی ہوگی۔ بعد میں سوار ہو گئے ہوں گے۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ اور اس کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو ابوالطفیل سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ مجھے یہ بتائیے کہ صفا مروہ کی سعی سوار ہو کر سنت ہے یا کہ نہیں، کیونکہ آپ کی قوم کا خیال ہے کہ سنت ہے، آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کچھ صحیح کہا اور کچھ غلط۔ میں نے کہا کچھ صحیح اور کچھ غلط کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لوگ زیادہ جمع ہو گئے تھے۔ جب لوگ زیادہ ہوئے تو آپؐ سوار ہو گئے الخ۔ میں کہتا ہوں کہ ابوالطفیل کی روایت کے الفاظ جو ابوداؤد میں مروی ہیں وہ اس تاویل کے منافی ہیں۔ اور وہ لفظ یہ ہیں: "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے اور چھڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کر کے اسے چوم لیتے تھے"۔ محمد بن رافع کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "پھر آپ صفا مروہ کی طرف نکلے۔ پس اپنی سواری پر صفا مروہ کے سات پھیرے کئے"۔ اور ملا علی قاری نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ سوار ہونے کی حدیث کو عمرۃ القضاء پر محمول کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلم و ابوداؤد کی حدیث جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ اس تاویل کی تصدیق نہیں کرتے اور وہ یہ ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا مروہ کی سعی کی"۔ میں کہتا ہوں

ولما وصل الی المروة استقبل البیت وکبر فلما اکمل سعیہٗ عند المروة

ترجمہ: اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی پس جب مروہ پر سعی پوری ہوئی۔

کہ حنفیہ کے مطابق جواب کی حاجت نہیں، کیونکہ ان کا یہ قول کہ آپ نے دو طواف اور دو مرتبہ سعی کی۔ ان تاویلات سے بے نیاز کردیتا ہے اور روایات میں قارن کیلئے دو مرتبہ سعی کی تصریح موجود ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس رسالہ کے شروع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں چھ قول گذرے ہیں، وہاں اس کو اجمالاً ذکر کیا جاچکا ہے۔

ابن حزم کا وہم

(ق) اور یہاں ابن حزم کو کھلا وہم ہوا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کے تین چکروں میں رمل کیا تھا اور چار چکروں میں معتاد رفتار سے چلے" اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اس قول پر جس کا کوئی ایک بھی قائل نہیں، علماء کا اتفاق نقل کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا طواف پیدل تھا یا سواری پر

(ق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ قدوم پیدل کیا تھا یا سواری پر؟ اس میں اختلاف ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ سواری طوافِ افاضہ میں تھی، طوافِ قدوم میں نہیں" اھ مختصراً۔ شیخ قدس سرہ نے بذل میں حدیث ابن عباسؓ کی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ "اس حدیث میں جس طواف کے سواری پر کرنے کا ذکر ہے یہ کونسا طواف تھا؟ طوافِ عمرہ، یا طوافِ قدوم، یا طوافِ زیارۃ؟ اس سلسلہ میں کسی کی تصریح میری نظر سے نہیں گذری، بظاہر یہ طواف جو سواری پر کیا گیا طوافِ زیارۃ تھا" اھ نوویؒ نے بھی اپنے مناسک میں اسی کو اختیار کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ افاضہ میں رمل نہیں کیا"

سعی کے متعلق تین بحثیں

اور جب مروہ پر پہنچے تو بیت اللہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی۔ اور وہی عمل کیا جو صفا پر کیا تھا۔ پس جب مروہ پر آکر سعی پوری ہوئی، یہاں تین بحثیں ہیں۔ اول یہ کہ صفا سے سعی شروع کرنا اور مروہ پر ختم کرنا جمہور کا مذہب ہے، وہ صفا سے مروہ تک کو ایک پھیرا اور مروہ سے صفا تک واپسی کو دوسرا پھیرا شمار کرتے ہیں، اس میں بعض شافعیہ کا اختلاف ہے اور حنفیہ میں سے امام طحاویؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے کہ صفا سے مروہ تک جانے اور مروہ سے صفا تک واپس آنے سے ایک پھیرا شمار ہوگا۔ موفق فرماتے ہیں:

"صفا سے مروہ تک جانا ایک پھیرا ہے اور مروہ سے صفا تک آنا دوسرا پھیرا ہے۔ ابن جریر اور بعض شافعیہ سے منقول ہے کہ جانے آنے سے ایک پھیرا مکمل ہوگا۔ مگر یہ غلط ہے الخ" پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

سعی کے بعد دوگانہ کا حکم

دوسری بحث یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کے بعد دو رکعتیں پڑھی تھیں؟ مطلب بن ابی وداعہ کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سعی سے فارغ ہوئے تو مطاف کے کنارے پر دو رکعتیں پڑھیں۔ یہ حدیث امام احمد اور ابن حبان نے روایت کی ہے اور شیخ ابن ہمام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سعی کے بعد دوگانہ مستحب ہے، صاحب لُباب صاحب بحر اور ابن عابدین نے بھی انہی کی پیروی کی ہے لیکن ابن حجر مکی نے شرح مناسکِ نووی میں اس پر تعقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حنفیہ سے حدیث کے لفظ میں غلطی (تصحیف) ہوئی، یہاں "سعیہ" کا لفظ نہیں بلکہ سبعہ ہے۔ (جس سے مراد طواف کے سات پھیرے ہیں) اھ میں کہتا ہوں کہ ابن حجر مکیؒ کے قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ابن ماجہ نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے "طواف کے بعد دو رکعتوں کا بیان" اور حدیث میں "سبعہ" کا لفظ با کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ امام نسائی نے یہی حدیث اس طرح روایت کی ہے۔ "طاف بالبیت سبعاً ثم صلّٰی رکعتین" (بیت اللہ کے گرد سات پھیرے کئے پھر دو رکعتیں پڑھی) مگر یہ تصحیف صرف حنفیہ کی کتابوں میں نہیں بلکہ یہ حدیث صاحبِ عون المعبود اور صاحب اُسد الغابہ نے بھی مسند ابو یعلیٰ سے اسی لفظ سعیہ یائے تحتانیہ کے ساتھ نقل کی ہے۔ تفصیل میرے حاشیہ بذل اور تلخیص بذل میں ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

سعی کا حکم

تیسری بحث یہ ہے کہ سعی کا حکم کیا ہے؟ اوجز میں دلائل کے ساتھ اس پر مفصل بحث ہوئی ہے۔ اور اس کا اجمال حاشیۂ لامع میں یہ ہے کہ "اس میں اہل علم کے تین قول ہیں۔ اوّل یہ رکن ہے اس کے بغیر حج صحیح نہیں ہوگا۔ امام شافعی اسی کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ کا مشہور قول اور امام احمد کی دو روایتوں میں سے صحیح روایت بھی یہی ہے۔ دوم: یہ واجب ہے اور دم کے ساتھ اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا اور عُتبیہ میں امام مالک کا قول ہے۔ سوم یہ سنت مستحبہ ہے۔ یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔" اھ

امر کل من لا ھدی معہ ان یحل حتما۔ وھناک قال لو استقبلت من امری ما استدبرت لما سقت الھدی۔

ترجمہ: تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ اور اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو ہدی ساتھ نہ لاتا۔

فسخ احرام کا قطعی حکم

تو قطعی حکم فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس ہدی کے جانور نہیں وہ احرام کھول دیں۔ خواہ وہ مفرد ہوں یا قارن — قِران والوں نے باوجودیکہ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھ رکھا تھا۔ مگر ان کو بھی فسخ احرام کا حکم فرمایا۔ اس کی وجہ قریب ہی گزر چکی ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ہدی کے جانور نہیں تھے اس لئے انہوں نے بھی احرام کھول دیئے، جیسا کہ بخاری، مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے اور عنقریب آگے آرہا ہے۔ اور جن کے ساتھ ہدی کے جانور تھے وہ بدستور احرام میں رہے۔ ان کے نام بھی آگے آرہے ہیں۔ موضع "سرف" میں احرام حج کو عمرہ میں تبدیل کرنے کا جو حکم فرمایا یہ اُس سے اوپر کے مرتبہ کا حکم تھا۔ اور اسی موقعہ پر فرمایا کہ جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا: چنانچہ شیخین نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ذی الحجہ کی صبح کو مکہ تشریف لائے، پس جب ہم مکہ پہنچے تو ہمیں حکم دیا کہ ہم احرام کھول دیں۔ اور فرمایا کہ بیویوں کے پاس جاؤ۔ عطاؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا۔ بلکہ عورتوں کو ان کے لئے حلال قرار دیا تھا۔ پس آپؐ کو یہ خبر پہنچی کہ ہم (صحابہ) یہ کہتے ہیں کہ اب جب کہ ہمارے اور عرفہ کے درمیان صرف پانچ راتیں باقی ہیں تو آپؐ نے یہ حکم فرمایا کہ ہم احرام کھول کر عورتوں کے پاس جائیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم عرفات میں ایسی حالت میں جائیں گے کہ ہماری شرمگاہوں سے منی ٹپک رہی ہوگی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا، تم سب سے زیادہ سچا، اور تم سب سے زیادہ نیکوکار ہوں۔ اگر ہدی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی تمہاری طرح احرام کھول دیتا، پس اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں معلوم ہوئی تو میں ہدی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔ پس ہم نے احرام کھول دیئے، اور سمع و طاعت بجا لائے"۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد کہ ان پر یہ حکم لازم نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب

یہ ہے، کہ عورتوں سے مقاربت کو ضروری قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس کی اجازت دی تھی، اس کو واجب نہیں کیا تھا، باقی احرام کھول دینا ان لوگوں کے لئے واجب اور قطعی تھا جنکے پاس ہدی نہیں تھی۔

ارشاد نبویؐ: لو استقبلت من امری الخ

اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس ارشاد سے کیا تھا؟ شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ "اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رائے جو میرے لئے اب ظاہر ہوئی ہے اگر پہلے سے ظاہر ہوئی ہوتی تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا، کہا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے لئے آپ کی اقتدار کا ترک کرنا گراں تھا، اس لئے صحابہ کرامؓ کی دلجوئی کے لئے فرمایا تاکہ انہیں اطمینان ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی ان کو دعوت دے رہے ہیں، وہی ان کے لئے افضل ہے" الخ، یہی بات ان سے پہلے نوویؒ نے لکھی ہے۔ اور شیخ المشائخؒ کوکب میں فرماتے ہیں کہ "یہ بات اس لئے ارشاد فرمائی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ جس طرح صحابہؓ نے احرام کھول دیا ہے، آپؐ خود بھی کھول دیں گے، اور تاکہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے احرام کھولنے پر نکیر نہ کریں۔ اور تاکہ حضرت علیؓ کو معلوم ہو جائے کہ جس کے ساتھ ہدی کے جانور ہوں اس کو احرام کھولنے کا حکم نہیں۔ اور جن کے ساتھ ہدی نہیں وہ احرام کھول دیں گے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اور بھی فوائد ہیں" اھ یہ ساری بحث جمہور کی رائے کے مطابق ہے۔ اور یہ حدیث اس مسئلہ میں حنابلہ کی دلیل ہے کہ تمتع افضل ہے۔ چنانچہ موفق لکھتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ اِفراد اور قِران کو چھوڑ کر تمتع کریں۔ ظاہر ہے کہ آپؐ نے انہیں افضل ہی کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیا، یہ ناممکن ہے کہ آپؐ انہیں اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیں۔ جب کہ آپؐ خیر کی طرف دعوت دینے والے اور اعلیٰ و افضل کی طرف راہنمائی کرنے والے تھے۔ پھر اس مضمون کو آپؐ نے یوں مؤکد فرمایا کہ خود اپنی ذات کے بارے میں اس کے فوت ہو جانے پر افسوس کا اظہار فرمایا کہ ہدی کی وجہ سے آپؐ احرام کھولنے اور قِران سے تمتع کی طرف منتقل ہونے پر قادر نہیں" موفق کے کلام پر یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قِران، آپؐ کی اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے نہیں تھا۔ کہ آپؐ کو اس پر افسوس کرنے کی ضرورت ہوتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ وادیٔ عقیق کی بحث میں گذر چکا ہے کہ آپؐ کے پاس ایک آنے والا (فرشتہ) آیا اور اس نے کہا: "کہیئے عمرہ حج میں" ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماضی و مستقبل کی خبر ہے۔

وهناك دعا للمحلقين ثلاثة وقد روى انه صلى الله عليه وسلم احل هو ايضًا وهو غلط قطعًا -

ترجمہ: اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار دعا فرمائی۔ اور روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احرام کھول لیا تھا یہ قطعاً غلط ہے

حلق کرانیوالوں کیلئے تین بار دعا فرمانا

اور اسی جگہ حلق کرانے والوں کیلئے تین بار اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک بار مغفرت کی دعا فرمائی۔ اوجز میں اس سلسلہ میں روایات کا اختلاف بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ یہ دعا عمرۂ حدیبیہ میں فرمائی تھی یا حجۃ الوداع میں؟ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ حدیبیہ میں دعا فرمانا ہی محفوظ ہے۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح اور مشہور یہ ہے کہ یہ دعا حجۃ الوداع میں فرمائی تھی۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بعید نہیں کہ دونوں جگہ یہ دعا کی ہو۔ عینی فرماتے ہیں کہ یہی صحیح اور صواب ہے۔ حافظؒ نے فتح میں اسی کو اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ یہی متعین ہے کیونکہ دونوں جگہ دعا کرنے کی روایات بکثرت ہیں۔ البتہ سبب دونوں جگہ مختلف ہیں۔ جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے وہ روایات ذکر کی گئی ہیں۔ اور یہی ظاہر ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ حجۃ الوداع میں آپؐ نے یہ دعا کس موقعہ پر فرمائی، مروہ پر یا منیٰ میں؟ صاحب الہدیٰ نے اس پر جزم کیا ہے کہ مروہ پر دعا فرمائی تھی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اسی جگہ حلق کرانے والوں کے لئے دعا کی۔ اور زرقانی وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منیٰ میں دعا فرمائی کیونکہ ان حضرات نے یہ دعا منیٰ کے حلق کے بعد ذکر کی ہے۔ میرے نزدیک اس دعا کا مروہ پر ہونا اوجہ ہے، کیونکہ وہاں احرام کھولنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا کمال اتباع تھا۔

حضرت معاویہؓ کی روایت کہ انہوں نے مروہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا

(ق) اور روایت ہے کہ آپؐ نے بھی احرام کھول دیا تھا۔ مگر یہ قطعاً غلط ہے۔ یہ وہم حضرت معاویہؓ کی اس روایت سے پیدا ہوا جو ابوداؤد میں ہے کہ حجۃ الوداع میں مروہ پر انہوں نے تیر کے پھالے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔

قسطلانی، المواہب میں کہتے ہیں کہ "علماء نے حضرت معاویہؓ کی اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا۔" پوری بحث بذل اور اوجز میں ہے، اور مشکوٰۃ کے حاشیہ میں لمعات سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں یہ اشکال ہے کہ اس کو حج پر محمول کرنا صحیح نہیں کیونکہ قارن کا حلق یا قصر مروہ پر نہیں، بلکہ منیٰ میں ہوتا ہے۔ نیز یہ طے شدہ بات ہے کہ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر نہیں بلکہ حلق ہوا تھا۔ لہٰذا یہ حدیث عمرہ پر محمول

وهناك سأله سراقة ألعامهم هذا أم للابد.

ترجمہ: اور حضرت سراقہؓ نے اسی موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟

ہو سکتی ہے۔ مگر یہ قصہ عمرۂ حدیبیہ کا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرایا تھا۔ اور اسے عمرۃ القضا پر محمول کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ باتفاق اہل سیر حضرت معاویہؓ فتح مکہ کے سال اسلام لائے، لہٰذا اس کو عمرۂ جعرانہ پر، جو ذی القعدہ ۸ھ میں ہوا، محمول کیا جا سکتا تھا، مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ "صحیح" کے بعض الفاظ میں آتا ہے کہ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے اور نسائی کی روایت میں بسند صحیح یہ لفظ ہیں: وذالك فی ایام العشر (اور یہ عشرہ ذی الحجہ کی بات ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ حجۃ الوداع ہی میں ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس دن نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام کھلا نہ ان لوگوں کا جن کے پاس ہدی کے جانور تھے۔ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے حضرت معاویہؓ کی اس بات سے انکار کیا تھا، اور اسے حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کا سہو قرار دیا تھا جس طرح انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات سے انکار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمرہ رجب میں ہوا۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ "اس میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس میں سہو ہوا کہ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے، اور یہ بات ایک ایسے شخص کے بارے میں کچھ بھی مستبعد نہیں، جس پر مشاغل کا ہجوم ہو اور جس کے کانوں، آنکھوں اور حافظے پر پیرانہ سالی اثر انداز ہو چکی ہو، ان کا سن مبارک اسی سے متجاوز تھا، اندریں صورت اسے عمرۂ جعرانہ پر محمول کیا جائے اور ذی الحجہ اور عشرۂ ذی الحجہ کے ذکر کو سہو قرار دیا جائے" اھ نوویؒ نے بھی اسے عمرۂ جعرانہ پر محمول کیا ہے، اور محب طبریؒ نے اسکی تصویب کی ہے، اور ابن قیمؒ نے اس کو بطور احتمال ذکر کیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اسی کو قطعی قرار دیا ہے۔

اور جب آپ نے فسخ احرام کا حکم فرمایا تو اس موقع پر حضرت سراقہؓ بن مالک بن جعشمؓ جنہوں نے مقام سرف میں آپؐ سے عرض کیا تھا کہ ہمیں ایسا صاف اور واضح حکم دیجئے جیسا ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو گویا آج پیدا ہوئے ہوں۔ انہوں نے اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ حکم یعنی حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا اسی سال کیلئے ہے یا ہمیشہ کیلئے ہے؟ یہ ائمہ ثلاثہ کی تعبیر ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک اس سے مراد حج کو فسخ کر کے عمرہ بنانا ہے۔

حج کو فسخ کر کے عمرہ بنالینے کی بحث اور حضرت سراقہ کی اس حدیث کا جواب منزل سرف کے بیان میں گذر چکا ہے۔ آنحضرتؐ نے سراقہؓ کے مندرجہ بالا سوال کے جواب میں فرمایا: "ہمیشہ کیلئے" الہدی میں اسی طرح ہے: اس کے برعکس بخاری کی روایت میں ہے کہ سراقہ نے یہ سوال رمی جمرۂ عقبہ کے وقت کیا تھا۔ اس کے لفظ "باب عمرۃ تنعیم" میں بروایت جابرؓ یہ ہیں: "سراقہ بن مالک بن جعشم جمرۂ عقبہ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے، جب کہ آپؐ اس کی رمی کر رہے تھے، پس عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ آپؐ لوگوں ہی سے مخصوص ہے؟ فرمایا: "نہیں! بلکہ ہمیشہ کے لئے"۔ حافظ فرماتے ہیں کہ کتاب التمنی میں یہ لفظ ہیں: "درآنحالیکہ آپؐ جمرۂ عقبہ کی رمی کر رہے تھے"۔ اس حدیث میں اس جگہ کی تصریح ہے جہاں حضرت سراقہ نے یہ سوال کیا تھا اور امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث جعفر بن محمد عن ابیہ کے طریق سے ذکر کی ہے اس کے سیاق کا مقتضی یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کیا گیا جب کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو حج کا احرام کھول کر عمرہ بنانے کا حکم فرمایا: اسی سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ سراقہ کا سوال فسخ حج الی العمرۃ سے متعلق تھا۔ ممکن ہے کہ سوال دونوں چیزوں کے متعلق ہوا ہو کیونکہ سوال متعدد جگہ ہوا تھا۔

ارشاد نبویؐ: "عمرہ حج میں داخل ہو گیا" کا مطلب

مسلم شریف میں جعفر بن محمد کی روایت میں ہے کہ حضرت سراقہؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ صرف اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کیلئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دو مرتبہ فرمایا: کہ عمرہ حج میں داخل ہو گیا (صرف اسی سال کے لئے نہیں) بلکہ ہمیشہ کے لئے"۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلی دستور کے برعکس حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز ہے اور بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قران جائز ہے یعنی عمرہ کے افعال حج کے افعال میں داخل ہو گئے اور بعض نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ عمرہ کا وجوب ساقط ہو گیا اور یہ قول ضعیف ہے کیونکہ یہ نسخ بلا دلیل کو مقتضی ہے اور بعض نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ:

کہ حج کے احرام کو فسخ کر کے اسے عمرہ بنالینا جائز ہے۔ مگر یہ بھی ضعیف ہے۔ نوویؒ کے قول پر تعقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سوال کا انداز و سیاق اس تیسری تاویل کے حق میں ہے۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ سوال تو فسخ حج ہی کے بارے میں تھا مگر جواب اس سے عام ہے جو باستثنا تیسری تاویل کے مذکورہ بالا تمام تاویلات کو شامل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ انتہیٰ کلام الحافظ۔

ان صحابہؓ کے نام جنہوں نے احرام نہیں کھولا

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہؓ

(قلت) وقدم علی من الیمن ببُدنہ ۔

ترجمہ (ش) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے تشریف لائے آپؐ کی ہدی کے اونٹ لے کر۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے احرام نہیں کھولا۔ کیونکہ ان کے ساتھ بدی کے جانور تھے کذا فی الہدی۔ امام طحاوی نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل ثروت کا اضافہ کیا ہے۔ اور اہل ثروت کے احرام نہ کھولنے کا ذکر امام مسلم نے بھی کیا ہے۔ شیخ ابن عربی نے "المحاضرہ" میں لکھا ہے کہ : بالا حضرات نے احرام نہیں کھولا (ق) ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی جن کا قران تھا احرام کھول دیا تھا۔ البتہ حضرت عائشہؓ نے عذر کی بناء پر احرام نہیں کھولا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں شیخ ابن قیمؒ کا یہ قول، ائمہ ثلاثہ کی رائے پر مبنی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک حضرت عائشہؓ نے عمرہ کا احرام کھول کر حج مفرد کا احرام باندھ لیا تھا۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

یمن سے حضرت علیؓ کی آمد

(ش) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیل صدقات کیلئے یمن بھیجا تھا۔ جیسا کہ بخاری شریف کی کتاب المغازی "باب بعث علی ابن ابی طالب وخالد بن الولید الی الیمن قبل حجۃ الوداع" میں اس کی تفصیل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مال سعایت" لے کر آئے اور مکہ مکرمہ میں آپؐ سے آکر ملے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کیسا احرام باندھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے یہ نیت کی تھی کہ جو احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی میرا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "ہدی تیار رکھو اور بدستور احرام کی حالت میں رہو" الی آخر الحدیث۔ اسی طرح حضرت ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا احرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر معلق رکھا تھا۔ مگر ان کے پاس چونکہ ہدی کا جانور نہیں تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم فرمایا کہ حج کا احرام فسخ کر کے عمرہ بنا لیں اور احرام کھولدیں۔

احرام مُبہم ومُعلّق

حاشیہ لامع میں "باب من اھلّ زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ" کے تحت ان دونوں حضرات کے احرام، نیز احرام مبہم اور معلق پر خوب بحث کی گئی ہے۔ احرام مبہم اور معلق کے مسئلہ میں جو مذاہب ہیں ان کے بیان میں شراح حدیث کے کلام میں الجھاؤ ہے۔ جس کی تفصیل حاشیہ لامع میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ احرام مبہم تو یہ ہے کہ حج یا عمرہ کی تعیین کئے بغیر احرام باندھے۔ اور معلق یہ ہے کہ یوں نیت کرے کہ جیسا احرام فلاں نے باندھا ہے ویسا ہی میرا ہوگا۔ ائمہ اربعہ کے اصح اقوال میں احرام کی یہ دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ اگرچہ بعض سے مختلف روایات بھی مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے اونٹ لے کر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے جانور جو آپ کے ساتھ تھے اور جو یمن

(قال) فاقام بظاھر مکة اربعة ایام یقصر الصلوٰة

ترجمہ: (ق) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر مکہ میں چار دن ٹھہرے۔ درآنحالیکہ آپ قصر کی نماز پڑھتے تھے۔

سے آئے تھے، ان سب کی مجموعی تعداد ایک سو تھی۔ جیسا کہ الخمیس میں ہے اور صحیح مسلم اور ابوداؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے۔ زرقانی نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ جو اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے لائے تھے اور جن کی تعداد ترسٹھ ۶۳ تھی، بظاہر ان ہی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے نحر (ذبح) کیا۔ جیسا کہ امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور جو اونٹ یمن سے آئے تھے وہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو عطا فرما دیئے تھے۔

حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کو بغیر احرام کے دیکھا تو ناراض ہوئے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ ترمذی، نسائی اور ابوداؤد میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے پاس گئے تو دیکھا کہ انہوں نے نضوح (ایک خاص قسم کی خوشبو) لگا رکھی ہے جس کی خوشبو مہک رہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا: آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو حکم فرمایا ہے اس لئے وہ احرام کھول چکے ہیں۔

حضرت علیؓ کی آمد اس وقت ہوئی جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "البطح" میں فروکش تھے، اس سے اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (جحفہ) میں آکر ملے تھے۔ کذا فی البدایہ والنہایہ۔

آنحضرتؐ کا مکہ سے باہر قیام کرنا

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر مکہ یعنی البطح میں جو مکہ سے مشرقی جانب ہے چار دن ٹھہرے، درآنحالیکہ آپ اسی جگہ قصر کی نماز پڑھتے تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وہ اذان اسی جگہ ہوئی تھی جس پر امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے: "باب المؤذن یتتبع فاہ ہہنا وہہنا" اور اس کے تحت حضرت ابوجحیفہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ وہ اذان دے رہے تھے۔ پس اذان میں منہ ادھر ادھر کر رہے تھے۔ اور البدایہ والنہایہ میں بروایت احمد ابوجحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ اذان کہہ رہے تھے اور گھوم رہے تھے۔ اور منہ ادھر ادھر کر رہے تھے۔ اور ان کی انگلیاں کانوں میں تھیں، اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سرخ خیمے میں فروکش تھے جو میرا خیال ہے کہ چمڑے کا تھا۔ پس حضرت بلالؓ آپ کے آگے آگے برچھی نما عصا (عنزہ) لے کر نکلے اور اس کو زمین میں گاڑ دیا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔" عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں نے ان سے (یعنی اپنے شیخ سے) مکہ میں سنا۔ فرماتے تھے کہ یہ قصہ بطحاء کا ہے۔" صاحب ہدایہ نے اس مضمون کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابوجحیفہ سے مروی ہے کہ ظہر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطحاء کی طرف نکلے پس وضو کیا" الخ اور اسی روایت میں ہے کہ پھر لوگ کھڑے ہوئے پس انہوں نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہروں پر ملنا شروع کیا" اھ یہ حدیث امام بخاری نے بھی ذکر کی ہے۔

حضرت سعدؓ کی عیادت اور ان کے سارے مال کی وصیت کے بارے میں دریافت کرنے کا قصہ

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام بطحاء کے دوران ہی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی عیادت کرنے اور ان کے اپنے سارے مال کی وصیت کے بارے میں دریافت کرنے کا واقعہ پیش آیا، جو روایات میں معروف ہے، اور یہ تو جب ہے جب کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہو۔ جیسا کہ راجح یہی ہے، البتہ بعض روایات میں ہے کہ یہ قصہ فتح مکہ کا ہے، مگر اول ہی راجح ہے کیونکہ وہ صحیحین کی روایت ہے، اور فتح مکہ والی روایت ترمذی کی ہے۔ اگرچہ حافظؒ نے ایک اور حدیث بھی اس کی مؤید نقل کی ہے، اور ان دونوں کے مابین تطبیق بھی دی ہے۔ جیسا کہ لامع کے حاشیہ میں "کتاب الوصایا" میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

حدیث طبطبیہ کا قصہ

غالباً اسی مقام میں حدیث طَبْطَبِیَہ کا وہ واقعہ بھی پیش آیا جو امام ابوداؤدؒ نے "باب تزویج من لم یولد" میں نقل کیا ہے۔ کیونکہ اس میں تصریح ہے کہ کردم کی آمد آپؐ کے حج میں ہوئی تھی، اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ یہ حدیث امام ابوداؤد نے "باب ما یؤمر بہ من وفاء النذر" میں مختصراً ذکر کی ہے، جس میں بوانہ میں اونٹ ذبح کرنے کا قصہ مذکور ہے۔ امام احمدؒ نے یہ دونوں قصے ایک ہی حدیث میں ذکر کئے ہیں۔

کیا ان چار دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف کعبہ کے لئے گئے تھے؟

پھر میرے نزدیک ظاہر یہ ہے ان ایام میں، جب کہ آپؐ ابطح میں فروکش تھے۔ طواف کعبہ کے لئے آتے رہے، بخلاف ان حضرات کے جو اس کے قائل

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ایام میں بیت اللہ کے قریب نہیں گئے، جیسا کہ پہلے گذرا،

باب کعبہ کے پاس آپؐ کا خطبہ

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن عربی نے المحاضرۃ میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں باب کعبہ کا حلقہ پکڑا، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "اے مسلمانوں کی جماعت! من جملہ علامات قیامت کے یہ چیزیں ہیں۔ نماز کو غارت کرنا، نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا، خیانت پیشہ حاکموں اور بدکار وزیروں کا ہونا" الخ اس طویل حدیث میں علامات قیامت اور ان گناہوں کا ذکر ہے۔ جن میں یہ امت مبتلا ہوگی۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلے پہل بیت اللہ میں تشریف لائے تو بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد فوراً صفا کی طرف نکل گئے۔ اسی طرح یوم النحر کو منیٰ سے سواری پر تشریف لائے، اونٹ پر طواف کیا اور اس کے بعد حنفیہ کے نزدیک سعی کی، اور راجح قول کے مطابق ظہر سے قبل ہی منیٰ کو واپس تشریف لے گئے۔ جیسا کہ ابن عمر کی روایت ہے اور طواف وداع آپؐ نے رات کے وقت نماز صبح سے پہلے کیا تھا جیسا کہ اپنی جگہ آتا ہے۔ اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بطحاء سے طواف کے لئے تشریف لائے ہوں گے۔

اور یہ طویل حدیث، جو ابن عربی نے ایک ورق میں نقل کی ہے، ارشاد فرمائی ہوگی۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں بھی طواف کیا، نیز اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں طواف کیلئے مکہ تشریف لائے تھے جیسا کہ عنقریب آتا ہے اور میرے نزدیک یہ بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے تین میل کے فاصلے سے تو طواف کے لئے تشریف لائیں اور خود مکہ میں قیام کے دوران طواف نہ کرتے ہوں، امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب "باب من لم یقرب الکعبۃ" پر لامع کے حاشیہ میں مفصل گفتگو کی گئی ہے، نیز اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ ۷ ذی الحجہ کا خطبہ حنفیہ اور مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک سنت ہے۔ اور بظاہر وہ مسجد حرام ہی میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ ابن المواز فرماتے ہیں کہ حج کے تین خطبے ہیں، پہلا ۷ ذی الحجہ کو نماز ظہر کے بعد مسجد حرام میں" اھ اب اگر یہ خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابطح میں دیا ہوتا تو جو لوگ مکہ میں مقیم تھے وہ اس سے محروم رہ جاتے۔ نیز طبقات ابن سعد کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپؐ کے لئے ابطح میں خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی

فلما كان يوم الخميس ضحًى توجه إلى منى. احرم بالحج من كان احلّ منهم

ترجمہ:- پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت آیا تو منیٰ کا قصد کیا اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے انہوں نے بھی احرام باندھ لیا۔

فرودگاہ کی طرف لوٹ گئے اور جب یوم الترویہ سے پہلا دن آیا یعنی ۷ ذی الحجہ تو آپؐ نے نماز ظہر کے بعد مکہ معظمہ میں خطبہ دیا: اھ

خطبات حج میں اختلاف علماء اس کے قائل ہیں کہ یہاں ۷ ذوالحجہ کا خطبہ مسنون ہے۔ البتہ اس میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے وہ اسے سنت نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک تینوں خطبے پے درپے ہوں گے اور پہلا خطبہ ۸ ذی الحجہ کو ہوگا، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بھی تین ہی خطبے ہیں مگر پے در پے نہیں بلکہ پہلا خطبہ ۷ ذوالحجہ کو نماز ظہر کے بعد ہوگا، جیسا کہ اوپر گذرا، اور دوسرا ۹ ذوالحجہ کو عرفات میں نماز ظہر سے قبل ہوگا۔ اور تیسرا ۱۱ ذوالحجہ کو منیٰ میں نماز ظہر کے بعد ہوگا۔ اور شافعیہ کے نزدیک چار خطبے ہیں، پہلے دو تو وہی ہیں جن کے حنفیہ اور مالکیہ قائل ہیں۔ اور تیسرا یوم النحر (۱۰ ذوالحجہ) کو اور چوتھا ۱۲ ذوالحجہ کو۔ حنابلہ کی کتابوں میں مجھے ۷ ذوالحجہ کے خطبے کی تصریح نہیں ملی۔ البتہ شارحین نے ذکر کیا ہے کہ وہ چار خطبوں میں شافعیہ سے متفق ہیں۔

منیٰ کو روانگی پس جب جمعرات کو چاشت کا وقت ہوا۔ الہدیٰ میں اس طرح ہے۔ اور ابن حزمؒ نے بھی اسی کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ شرح مناسک للنووی میں ہے اور اسی طرح "المحاضرہ" میں ہے، اور یہی معروف ہے۔ اس کے خلاف ایک قول آگے آتا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے بعد منیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو آپ نے رفقاء سمیت منیٰ کا قصد کیا۔ حضرت بلالؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لکڑی پر کپڑا لگا ہوا تھا جس سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ البدایہ والنہایہ میں ہے۔ محرم کے سایہ میں بیٹھنے میں ائمہ کا جو اختلاف ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پالان پر حج کرنے کے بیان میں گذر چکا ہے۔

ابطح سے احرام باندھنا اور جو حضرات احرام کھول چکے تھے انہوں نے بھی ابطح ہی سے احرام باندھ لیا۔ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: "باب الاهلال من البطحاء وغيرها للمكي" اور منیٰ پہنچ کر وہاں قیام فرمایا اور نماز ظہر ادا کی، جیسا کہ الہدیٰ میں ہے،

وبات بھا حتی طلعت الشمس

ترجمہ: اور رات کو وہاں قیام رہا یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہوا۔

نیز زرقانی نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گذرا یہی معروف ہے۔ اور اوجز میں ابو عبداللہ قطبی کی شرح مؤطا سے نقل کیا ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ ذوالحجہ کی شام کو منٰی کی طرف نکلے" نووی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: "اور سان کا (حجاج کا منٰی کی طرف) مکہ سے نکلنا نماز صبح کے بعد ایسے وقت ہوگا کہ ظہر کی نماز منٰی میں پڑھ سکیں"۔ شافعیہ کا صحیح اور مشہور مذہب یہی ہے جو ان کی تصریحات سے ثابت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ظہر مکہ میں پڑھ کر نکلیں اھ۔

سورۂ والمرسلات کا نزول اور رات کو وہاں قیام رہا۔ اسی رات سورۂ والمرسلات نازل ہوئی چنانچہ امام بخاریؒ نے "باب ما یقتل المحرم من الدواب" کے ذیل میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ: "دریں اثنا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ منٰی کی ایک غار میں تھے کہ آپؐ پر والمرسلات نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرما رہے تھے، اور میں آپ کی زبان مبارک سے اس کو حاصل کر رہا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ رطب اللسان تھے"۔ الحافظ فرماتے ہیں کہ "اسماعیلی کی روایت میں ہے کہ یہ عرفہ کی شب تھی": انتہٰی۔ بخاری وغیرہ کی روایات میں ہے کہ وہاں ایک سانپ نکلا تھا، صحابہ کرام نے اس کو قتل کرنا چاہا مگر وہ اپنی بل میں داخل ہوگیا۔ یہاں تک کہ جمعہ کے دن کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس میں اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک جمعہ کو ہوا۔

جمعہ کے حج کی فضیلت رہی یہ بحث کہ آیا جمعہ کے حج کو کچھ مزید خصوصیت بھی حاصل ہے؟ اوجز میں اس پر مفصل کلام کیا ہے، اور اس میں عبداللہ بن کریزؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل دعا یوم عرفہ کی دعا ہے"۔ الحدیث۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ "تجرید الصحاح" میں اس حدیث کے شروع میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "سب سے افضل دن عرفہ کا دن ہے۔ جو جمعہ کے دن آئے، اور ایسے دن کا حج دوسرے دنوں کے ستر حجوں سے افضل ہے"۔ حافظؒ اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ "اگر اس حدیث کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے کہ ستر کے لفظ سے خاص عدد ہی مراد ہو یا محض کثرت میں مبالغہ مقصود ہو، بہر صورت اس کی مزید خصوصیت ثابت ہوتی ہے"۔ ابن قیمؒ کی الہدیٰ میں ہے کہ "یہ جو عوام کی زبان پر مشہور ہے کہ جمعہ کا وقوف عرفات بہتر حج کے برابر

فسار منہا الی عرفۃ بطریق ضب

ترجمہ: پس وہاں سے عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ ضب کے راستہ سے،

ہے یہ قطعاً باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی صحابی یا تابعی سے"۔ زرقانی نے جو حدیث تجرید سے نقل کی ہے وہ جمع الفوائد میں بھی مذکور ہے۔ اور ملا علی قاریؒ شرح لباب میں فرماتے ہیں کہ جمعہ کا وقوف دیگر ایام کے وقوف سے ستر درجے افضل ہے۔" نیز وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "الحظ الاوفر فی الحج الاکبر" ہے۔ اور رزین کی مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں:" اس کے ذکر کرنے میں رزین متفرد ہے، اس نے اس کے راوی صحابی کا بھی ذکر نہیں کیا نہ اس کے مخرج کا ——————— اس کے بعد انہوں نے وہی بات ذکر کی ہے جو حافظؒ کے کلام میں گزر چکی ہے کہ اگر اس کی کچھ اصل ہو تو احتمال ہے الخ۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

منیٰ سے عرفات کو روانگی

پس وہاں سے عرفات کیطرف روانہ ہوئے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:" ثم افیضوا من حیث افاض الناس " پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

حُمس کا عرفات میں نہ جانا

امام بخاریؒ "کتاب التفسیر" میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ قریش اور ان کے ہم مشرب لوگ صرف مزدلفہ جا کر واپس آجاتے تھے اور "حُمس" کہلاتے تھے، اور ان کے علاوہ باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے، پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ عرفات جائیں اور وہاں وقوف کر کے واپس آئیں۔ یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے ارشاد:" ثم افیضوا من حیث افاض الناس کا "۔ البدایہ والنہایہ میں منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:" پھر آپ تھوڑی دیر ٹھہرے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہوا۔ اور آپ کے حکم سے نمرہ میں بالوں کا خیمہ نصب کیا گیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے۔ اور قریش کو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشعر حرام کے پاس (مزدلفہ میں ہی) ٹھہریں گے، جیسا کہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے گزر کر عرفات پہنچ گئے"۔ زرقانی نے شرح مواہب میں بھی اسی طرح ذکر کیا ہے، اور یہ حضرت جابر کی طویل حدیث کے الفاظ ہیں۔

ضب کا راستہ

ضب کے راستے سے یہ اس راستہ کی دائیں جانب ہے جو آج کل لوگوں میں معروف ہے۔ اور المرآۃ کے حاشیے میں ہے کہ ضَبّ اس پہاڑ کا نام ہے جس کی جڑ میں مسجد

فنزل فی قبہ۔

ترجمہ:۔ پس ایک قبہ میں فروکش ہوئے۔

خیف ہے۔ اور طریقِ ضبؔ عرفہ کی دائیں جانب مأزمین کے اول سے شروع ہوتا ہے اور یہ طریقِ مأزمین سے مختصر راستہ ہے۔" اور زرقانی فرماتے ہیں: "ضب (بفتح ضاد وتشدید باء) ایک بستی ہے جو آجکل لوگوں کے دائیں جانب آتی ہے۔" ملاعلی قاریؒ کی شرح لباب میں ہے: "مستحب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اقتدا کرتے ہوئے ضبؔ کے راستے عرفات کو جائے اور مأزمین کے راستے سے واپس آئے۔ مگر اکثر لوگوں نے ہمارے زمانے میں اس کو ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ اس راستہ میں کانٹے بہت ہیں اور خوف کا غلبہ ہے۔ اور مأزمین، عرفہ اور مزدلفہ کے مابین ایک تنگ گھاٹی کا نام ہے۔" اھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ تلبیہ کہتے تھے اور بعض تکبیر کہتے تھے۔ اور کسی پر نکیر نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ صحیحین میں ہے۔

نمرہ عرفات میں داخل ہے یا کہ نہیں؟ پس وہاں آپؐ ایک قبہ میں فروکش ہوئے۔ جو نمرہ میں نصب کیا گیا تھا۔ اور آیا نمرہ عرفات میں داخل ہے یا اس سے خارج ہے؟ اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل میرے حاشیۂ بذل میں ہے۔ چنانچہ بذل میں ہے کہ "طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے، جو عرفات میں داخل نہیں۔" اھ اور میرے حاشیہ میں ہے کہ نوویؒ نے اور زرقانی نے شرح مواہب میں یہی ذکر کیا ہے اور اکمال میں ابی کے کلام میں بھی یہی ظاہر ہے، اور نووی کی تہذیب اللغات میں ہے کہ "یہ عرفات کے قریب ایک معروف جگہ ہے۔" اور شرح مہذب میں فرماتے ہیں: "یہ عرفات کا حصہ نہیں۔ بلکہ عرفات کے قریب میں واقع ہے۔ یہی قول صحیح ہے جس کی امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے۔" حافظ فرماتے ہیں: "یہ عرفات کے قریب ایک جگہ ہے جو بیرونِ حرم، عرفات اور حرم کے کناروں کے مابین واقع ہے۔" عینی میں بھی اسی طرح ہے۔ اور یہی مُغنی سے ظاہر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "نمرہ میں قیام کرے اور چاہے تو عرفات میں۔" لیکن باجی اور دردیر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عرفہ میں شامل ہے اور حنفیہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ یہ عرفات میں شامل ہے۔ بلکہ فخر الدین زیلعی نے شرح کنز میں اور جمال الدین زیلعی نے تخریج ہدایہ میں اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس کی تصریح کی ہے۔ نیز ردالمختار میں بھی یہی ہے، اور عینی میں اس کے خلاف اوپر گزر چکا ہے اور مجمع البحار میں ہے کہ:

حتی اذا زالت الشمس سار حتی اتی بطن الوادی فخطب خطبۃ عظیمۃ۔

ترجمہ: یہاں تک کہ جب زوال آفتاب ہوا تو روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے۔ پس ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔

"یہ عرفات میں ایک پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رکھے جاتے تھے"۔ اور قاموس میں ہے: "یہ عرفات میں ایک جگہ ہے یا وہ پہاڑ ہے جس پر حرم کے بت رہتے تھے۔ مأزمین سے نکلو تو یہ تمہاری دائیں جانب آئیگا"۔ اور یہی حضرت ابن عمر کی حدیث سے ظاہر ہے جو ابو داؤد "باب الخروج الی عرفہ" میں ان الفاظ سے مروی ہے: "یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ پہنچے، پس نمرہ میں فروکش ہوئے۔ اور یہی فرودگاہ ہے امام کی جو اس جگہ عرفہ میں فروکش ہو"۔

بطن عرفہ عرفات میں داخل ہے یا نہیں؟

اور اوجز میں ہے "باب وقوف بعرفہ" میں ہے کہ "ناظرین کتب حدیث کے لئے تین چیزوں کی تحقیق کی حاجت ہے کہ آیا وہ عرفہ میں داخل ہیں یا نہیں۔ ایک بطن عرفہ، دوسری نمرہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب کیا گیا، تیسری عرفات کی مسجد"۔ بعد ازاں بہت ہی تفصیل کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔ اگر تفصیل و تحقیق کا شوق ہو تو اوجز کی مراجعت کرو۔ یہاں تک کہ جب زوال آفتاب ہوا تو اپنی ناقہ مبارک قصواء کو تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ وہ تیار کی گئی تو اس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے یہاں تک کہ بطن وادی میں پہنچے، جو سرزمین عرفہ کا حصہ ہے۔ الہدیٰ زرقانی اور مرقاۃ میں اسی طرح ہے، اور بذل میں حضرت جابرؓ کی حدیث طویل کے الفاظ: "حتی اتی بطن الوادی" کے تحت لکھا ہے کہ "یہ عرفات میں ایک جگہ ہے جو "عرفہ" کہلاتی ہے، اور یہ عرفات کا حصہ نہیں بخلاف امام مالکؒ کے کہ ان کے نزدیک یہ عرفات میں شامل ہے"۔ اھ

اوجز میں بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ عرفہ عرفات میں داخل ہے یا اس سے خارج؟ اور اس میں ہے کہ آئمہ اربعہ متفق ہیں کہ وقوفِ عرفہ وقوفِ عرفہ کی جگہ کافی نہیں۔ البتہ امام مالک کا ایک مرجوح قول ہے کہ یہ بھی کافی ہے مگر اس پر دم لازم ہوگا۔ پس آپؐ نے سواری پر سے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک عظیم الشان خطبہ دیا۔ یہ ایک خطبہ تھا یا دو تھے؟ اس میں اختلاف ہے جو آگے آتا ہے۔

وقوفِ عرفات پیدل ہو یا سواری پر

اوجز میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ آیا وقوفِ عرفہ سواری پر افضل ہے؟ یا پیدل؟ یا دونوں برابر ہیں؟ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ سواری پر افضل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر وقوف کیا تھا۔ نیز اس

مقام میں دعا اور گریہ وزاری میں مبالغہ مطلوب ہے اور سواری سے اس پر خوب مدد مل سکتی ہے۔ اور شافعیہ و حنابلہ کا ایک قول یہ ہے کہ پیدل افضل ہے، اور امام شافعیؒ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ دونوں مساوی ہیں تفصیل اوجز میں دیکھئے۔

آنحضرتؐ کا خطبۂ عرفات

(ش) اس خطبے کا بیشتر حصہ سیرت ابن ہشام، ابن عربی کی "الحاضرہ" البدایہ والنہایہ، اور زرقانی شرح مواہب میں مذکور ہے اس خطبہ میں آپؐ نے ابن ربیعہ کے خون کے ساقط کرنے کا اعلان فرمایا۔ جیسا کہ مسلم اور ابو داؤد میں ہے۔ ربیعہ کے اس لڑکے کا نام ایاس تھا، مسلم اور ابو داؤد کی بعض روایات میں "ربیعہ کے خون" کا لفظ ہے۔ جسے ایک جماعت نے غلط قرار دیا ہے، مگر غلط کہنے کی ضرورت نہیں۔ ربیعہ ولی دم تھا۔ اس لئے اس کی طرف نسبت کردینا مستبعد نہیں۔ اس خطبہ میں جاہلی سود کے موقوف ہونے کا اعلان کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے عباس بن مطلب کا سود ساقط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ سب کا سب ساقط ہے۔ اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا: "خوب یاد رکھو کہ جاہلیت کی ایک ایک چیز میرے قدموں کے نیچے پامال ہے۔" اسی خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا: "اے لوگو! میرا خیال ہے کہ ہم اور تم اس مجلس میں پھر کبھی جمع نہیں ہوں گے۔" حضرت ابو امامہؓ کی حدیث کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں۔ مگر اس میں عرفہ کی تصریح نہیں، جیسا کہ کنز العمال میں ہے۔

میدانِ عرفات میں سواری پر آپؐ کا دودھ نوش فرمانا

(ق) ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے دودھ کا ایک پیالہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جو آپؐ نے سب لوگوں کے سامنے اونٹ پر نوش فرمایا۔ تلخیص بذل میں یہاں بعیر (اونٹ) کے بجائے ناقہ کے لفظ کی تصویب کی ہے جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اول قصہ میں آپ کا ناقہ قصواء پر سوار ہونا مذکور ہے۔ لیکن اوجز میں مؤطا اور بخاری سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں "بعیر" کا لفظ ہے، ان کی تاویل یہ ہے کہ لفظ بعیر نر اور مادہ دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ امام راغب اور صاحب قاموس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور نسائی کی روایت میں جَمل کا لفظ بھی مؤوّل ہے اوجز میں یہ بھی ہے کہ "متعدد وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے منافی نہیں کہ "چوپاؤں کی پشتوں کو منبر بنانے سے احتراز کرو۔" (ابو داؤد) ایک وجہ یہ کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ چوپائے کو مشقت لاحق ہو۔ یا یہ کہ عرفہ میں سواری کا مندوب ہونا اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔" میرے نزدیک اَوجَہ

جواب یہ ہے کہ یہ متنبی کے ذیل کے شعر کے قبیل سے ہے۔

لیت انا اذا ارتحلت الخیل   وانا اذا نزلت الخیام

جب تو گھوڑوں پر سوار ہو تو کاش ران کی جگہ ہی ہوتا۔ اور جب تو خیموں میں فروکش ہو تو کاش ران کی جگہ بھی میں ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے سامنے ناقہ پر دودھ نوش فرمانا

حاجی کیلئے عرفہ کے روزے کا حکم اس امر کے اظہار کے لئے تھا کہ آپؐ کا روزہ نہیں، متعدد روایات میں جو البدایہ والنہایہ میں ذکر کی گئی ہیں۔ یوم عرفہ میں روزے کی ممانعت آئی ہے۔ اور اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ روزہ حاجی کے لئے سنت نہیں۔ امام اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے بھی سنت ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے سنت ہے بشرطیکہ ضعف نہ ہو۔ یہی حکم حنفیہ کے نزدیک ہے۔ اگر دعاؤں سے ضعف کا اندیشہ ہو تو ترک مستحب ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے انتہی ملخصاً۔ (ق) جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلالؓ کو حکم فرمایا پس انہوں نے نماز کی اقامت کہی۔ یہ ابن حزم کا قول ہے جو وہم پر مبنی ہے اور صحیح یہ ہے کہ خطبہ کا مقام عرفہ تھا جو موقف نہیں۔ اور دودھ پینے کا قصہ عرفہ کا ہے جو موقف ہے۔

عرفات کا خطبہ ایک ہے یا دو؟ (ق) اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی خطبہ دیا تھا۔ دو خطبے نہیں تھے کہ ان کے درمیان میں بیٹھے ہوں (ش) ہدایہ میں ہے کہ "امام دو خطبے پڑھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا تھا" جمہور کے نزدیک جن میں حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ بھی شامل ہیں۔ یہ دو خطبے ہیں، جیسا کہ اوجز میں ان کی فقہی کتابوں سے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ البتہ ابن قیمؒ کی گذشتہ بالا عبارت کے علاوہ حنابلہ کی کتابوں میں مجھے اس کی تصریح نہیں ملی۔ اور موفق کا یہ قول بھی اس کا مؤید ہے کہ "امام ایک خطبہ پڑھے پھر اذان کا حکم کرے، جیسا کہ اوجز میں ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ سندی مالکی نے مالکیہ کا یہ قول کیسے نقل کر دیا کہ ان کے نزدیک ایک خطبہ ہے۔ حالانکہ ان کی فقہی کتابیں اس کے خلاف ہیں؛ جیسا کہ اوجز میں ہے، خطبہ عرفات کے علاوہ حج کے جو دو خطبے اور ہیں ان میں ہمارے نزدیک بھی ایک ہی خطبہ ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ پوری بحث تلخیص بذل میں ہے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کا خطبہ نماز کے بعد تھا؛ جیسا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے۔ یا نماز سے پہلے تھا؟ جیسا کہ جمہور کے نزدیک ہے، اور امام مالک سے جو نماز کے بعد ہونا منقول ہے ان کی فقہی کتابوں

(قال) فلما انتهى امر بلالا فاذن فصلى الظهر ركعتين والعصر ركعتين۔

ترجمہ: (ق) پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا۔ پس انہوں نے اذان کہی۔
پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتین پڑھیں اور عصر کی دو رکعتیں۔

کے خلاف ہے چنانچہ ان میں نماز سے قبل ہونے کی تصریح ہے اس سلسلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو اختلاف ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں، بذل میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ علماء کا عمل حدیث جابرؓ پر ہے (جس میں قبلِ نماز کی تصریح ہے) اور حدیث ابن عمر معلول ہے۔ جیسا کہ بذل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(ق) پس جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو بلال کو حکم دیا پس انہوں نے اذان کہی۔ حافظ ابن قیمؒ نے ان لوگوں کی رائے کو وہم قرار دیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ اذان خطبہ سے پہلے یا خطبہ کے دوران ہوئی۔ ابن قیمؒ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اذان تمام خطبہ کے بعد ہوئی۔ اوجز میں ہے کہ موفق فرماتے ہیں: "امام خطبہ دے، پھر اذان کا حکم کرے، پھر اتر کر نماز پڑھے" اھ اور نوویؒ اپنے مناسک میں لکھتے ہیں جب سورج ڈھل جائے تو امام ظہر سے پہلے دو خطبے پڑھے، پس جب خطبۂ ثانیہ کے لئے اٹھے تو مؤذن اذان شروع کردے۔ اور امام دوسرا خطبہ اتنا مختصر پڑھے کہ ادھر مؤذن اذان سے فارغ ہوجائے ادھر امام خطبے سے" اس میں مالکیہ کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل اوجز ہے۔ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ اذان خطبے کے بعد ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ دونوں خطبوں کے درمیان ہو، اور بعض کے قول کے مطابق اس وقت کہی جائے جب کہ امام خطبہ میں مشغول ہو، اور حنفیہ کے نزدیک جب امام خطبہ کے لئے بیٹھے اس وقت اذان کہی جائے، اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام کے نکلنے سے پہلے اذان کہی جائے۔ اور ان سے ایک روایت یہ ہے کہ خطبہ کے بعد ہو۔ کذا فی الہدایہ، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں یہاں ابن حزمؒ کو وہم ہوا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ پڑھا۔ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ امام ظہر کی نماز پڑھے خواہ جمعہ کا دن ہو۔ جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

اور (ساتھ ہی) عصر کی دو رکعتیں (پڑھیں)۔ دونوں

عرفات میں اذان و اقامت کی تعداد میں اختلاف نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ہوئیں۔

موفق فرماتے ہیں: "خرقی کے اس قول سے کہ "اگر اذان دے تو مضائقہ نہیں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی

نماز کے لئے اذان کہنے یا نہ کہنے کا اختیار ہے۔ امام احمد کا یہی قول ہے۔ مگر اذان کہنا بہتر ہے، امام شافعیؒ اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے امام مالک فرماتے ہیں کہ ہر نماز کیلئے اذان کہی جائے۔" اھ اور مسئلہ اقامت میں ناقلین مذاہب کا اختلاف ہے۔ اس مسئلہ میں عینی میں ناقل سے تحریف ہوئی ہے، اور مذاہب کی تفصیل حاشیۂ ہدایہ میں نہایہ سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں علماء کے چھ مذہب ذکر کئے گئے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ حنفیہ کا مسلک ایک اذان اور دو اقامتوں کا ہے۔ امام احمد کا راجح قول بھی یہی ہے، جیسا کہ المغنی میں ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے، نوویؒ نے شرح مسلم میں اسکی تصریح کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "پہلی نماز کے لئے اذان کہے اور ہر ایک کے لئے اقامت کہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تفریق نہ کرے۔ یہ تمام مسائل ہمارے ہاں متفق علیہ ہیں۔" اور دردیر مالکی نے دو اذانوں اور دو اقامتوں کی تصریح کی، چنانچہ فرماتے ہیں: "پھر خطبہ سے فارغ ہو تو ظہر کے لئے اذان و اقامت کہے، درانحالیکہ امام منبر پر ہو، جب اقامت سے فارغ ہو تو امام منبر سے اترے اور ظہر و عصر کو جمع کرے بایں طور کہ عصر کے لئے الگ اذان و اقامت ہو۔" خلاصہ یہ کہ جمع عرفات میں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک اذان اور دو اقامتیں ہوں گی۔ اور مالکیہ کے نزدیک دو اذانیں اور دو اقامتیں۔

"اس نماز میں اہل مکہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی تھی، جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد فرمایا تھا کہ: "اپنی نماز پوری کرلو" یہ وہم ہے کیونکہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں فرمائی تھی" یہ بات الہدی میں شیخ ابن قیمؒ نے کہی ہے اور ان سے پہلے یہی بات ان کے شیخ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں کہی ہے، اور صاحب الہدایہ والنہایہ نے اسی پر جزم کیا ہے، شیخ ابن قیم کہتے ہیں: "اسی بنا پر علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ اہل مکہ عرفات میں قصر اور جمع کریں گے۔ اور یہ اس امر کی واضح تر دلیل ہے کہ سفر کسی معین مسافت یا معین ایام کے ساتھ محدود نہیں، اور نماز کے قصر میں مناسکِ حج اثر انداز نہیں" میں کہتا ہوں کہ شیخ ابن قیمؒ کے کلام میں یہ بحث ہے کہ ابو داؤد و طیالسی کی روایت کے مطابق حضرت عمران بن حصین کی حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین اور طائف میں حاضر ہوا تو آپ دو رکعتیں پڑھ رہے تھے۔ پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج وعمرہ کیا۔ (آپؐ نے دو رکعتیں ہی پڑھیں) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے اہلِ مکہ! تم اپنی نماز پوری کرلو ہم مسافر ہیں۔" پھر میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج وعمرہ کیا۔ انہوں نے دو رکعتیں

پڑھیں پھر (سلام پھیرنے کے بعد) کہا: اپنی نماز پوری کرلو ہم مسافر ہیں۔ الخ" اس حدیث میں اگرچہ منیٰ یا
عرفہ کی تصریح نہیں (تاہم اتنی تصریح تو موجود ہے کہ حج کے موقعہ پر بھی یہ ارشاد فرمایا تھا)۔

منیٰ اور عرفات میں قصر اور جمع کے سبب میں اختلاف

پھر اس میں اختلاف ہے کہ عرفات میں قصر اور جمع کا سبب افعالِ حج ہیں یا سفر؟ ابن قیمؒ کا میلان
اس طرف ہے کہ یہ دونوں سفر کی وجہ سے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک نہ کسی متعین مسافت کی تحدید ہے
نہ دنوں کی۔ اور میرے نزدیک یہی امام مالک کے قول کا حاصل ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور اوجز
میں اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور ہمارے احناف کے نزدیک دونوں نمازوں کو جمع کرنے کا
سبب افعالِ حج ہیں اور قصر کا سبب سفر ہے۔ اوجز میں ہے کہ: "اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ
اہل مکہ منیٰ میں پوری نماز پڑھیں گے یا قصر کریں گے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مکہ میں پوری پڑھیں اور
منیٰ میں قصر کریں۔ اسی طرح اہل منیٰ منیٰ میں پوری پڑھیں اور مکہ وعرفات میں قصر کریں۔ امام مالکؒ فرماتے
ہیں کہ یہ مقامات اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ میں قصر پڑھی تو آپکی
اقتداء میں بلا امتیاز سب لوگوں نے نماز قصر پڑھی۔ یہ مسئلہ کہ اہل مکہ منیٰ میں قصر کریں گے۔ حضرت
ابن عمرؓ وغیرہ اور امام اوزاعی اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ قصر ہی ان مقامات
میں سنت ہے۔ منیٰ اور عرفات میں صرف وہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے جو وہاں مقیم ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ
امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر اہل علم اس کے قائل ہیں کہ اہل مکہ منیٰ اور عرفات میں قصر نہیں کریں گے کیونکہ
مسافتِ سفر مفقود ہے۔" میں کہتا ہوں کہ اکثر شروح میں یہ بات زبان زد ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک قصر،
افعالِ حج کی وجہ سے ہے سفر کی بنا پر نہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ اوجز میں مالکیہ کی فقہی کتابوں سے تفصیل
نقل کی گئی ہے۔ اور حاشیہ لامع میں ہے: "اور میرے نزدیک اَوْجَہ یہ ہے کہ قصر امام مالکؒ کے نزدیک
بھی سفر ہی کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خود امام مالکؒ نے مؤطا میں تصریح کی ہے، وہ فرماتے: "نماز یومِ
عرفہ میں ظہر ہی کی ہے مگر سفر کی وجہ سے کم ہوگئی"۔ یہ امام مالکؒ کی جانب سے صاف تصریح ہے۔ البتہ
مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ اور وہاں سے مکہ آنے جانے کو امام مالکؒ
سفر واحد سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ احرام کی وجہ سے لازم ہے۔ ورنہ اگر قصر افعالِ حج کی وجہ سے ہوتا تو مکہ اور
اور منیٰ کے حجاج اپنے وطن میں بھی قصر کرتے۔" اھ

یہ تمام بحث تو قصر کی تھی رہا دونوں نمازوں کو جمع کرنا؛ سو وہ ہمارے احناف کے نزدیک بھی افعال حج کی وجہ سے ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ جن کی تفصیل حاشیۂ لامع میں ذکر کی گئی ہے، اور بخاری میں ہے کہ: ابن عمرؓ سے جب امام کے ساتھ نماز فوت ہو جاتی تب بھی جمع کرتے؛ شیخ لامع فرماتے ہیں: یہ ان کا اجتہاد تھا۔ اور ہمارے نزدیک جمع چند شرائط کے بغیر جو اپنے محل میں مذکور ہیں جائز نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جمع بین الصلوتین اس قیاس کے خلاف ہے جو نص سے ثابت ہے، اور وہ ہے: حق تعالیٰ کا ارشاد "ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتابا موقوتا"۔ بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے، لہٰذا دو نمازوں کا جمع کرنا مورد نص تک ہی محدود رہے گا اور اس کا تعدیہ صحیح نہ ہوگا کہ منفرد وغیرہ کے حق میں بھی جائز ہو، جو مورد نص کے حکم میں نہیں: اھ

اور اس کے حاشیہ میں ہے: "پس اگر اس کو امام کے ساتھ نماز نہ ملے تو اپنی جگہ نماز پڑھے۔ حاصل یہ کہ منفرد بھی اسی طرح دونوں نمازوں کو جمع کرے جس طرح امام کے ساتھ جمع کرے گا۔ یہ امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور صاحبین کا قول ہے۔ اور امام ثوریؒ، امام نخعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ امام کے بغیر جمع کرنا صحیح نہیں۔" اور ہدایہ میں ہے کہ: "جس شخص نے اپنی قیامگاہ میں تنہا نماز پڑھی، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ عصر کو اس کے وقت میں پڑھے۔ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ منفرد بھی دونوں نمازوں کو جمع کرے۔ کیونکہ دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا اس مقصد کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ وقوف کے لئے زیادہ وقت میسر آئے، اور منفرد بھی اس کا محتاج ہے۔ اور امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ وقت کی پابندی کا فرض ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا صرف اس صورت میں جائز ہوگا جس میں شریعت (کا استثنائی حکم) وارد ہو۔ اور وہ صرف امام کی معیت یعنی جماعت کے ساتھ جمع کرنے کی صورت (میں وارد) ہے"۔ اھ۔ اور صاحب لُباب نے جمع عرفات کی چھ شرطیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ہمارے ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ اور بعض میں اختلاف ہے۔ میں نے حاشیۂ لامع میں ان کو ذکر کر دیا ہے۔

فلما فرغ رکب حتی اتی الموقف، واستقبل القبلۃ، وھناك اقبل اھل نجد

ترجمہ: پس جب فارغ ہوئے تو سوار ہو کر موقف میں پہنچے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا۔ اسی موقعہ پر اہل نجد آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف عرفات پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو قصواء پر سوار ہو کر موقف میں پہنچے۔ جبل رحمت کے نیچے چٹانوں کے پاس وقوف فرمایا۔ زرقانی نے صخرات پر قصواء کے جائے قیام کو تفصیل سے لکھا ہے۔ نیز ابن عابدین اور صاحب شفاء الغرام نے بھی خوب مفصل لکھا ہے۔ اور قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعاء و تضرع میں مشغول ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر جو دعائیں فرمائیں انہیں صاحب الہدایہ والنہایہ نے اور زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

حج وقوف عرفہ کا نام ہے اسی موقعہ پر اہل نجد کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے حج کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج (وقوفِ) عرفہ کا نام ہے الخ" کذا فی الہدی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث معروف ہے جس کو ابو داؤد نسائی اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اس کی روایات کے الفاظ کا اختلاف بذل میں مفصل ذکر کیا ہے۔

وقوف عرفہ بالاجماع رکن ہے اور اوجز میں ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ وقوف عرفہ رکن ہے اس کے بغیر حج پورا نہیں ہوتا۔ بہت سے شارحینِ حدیث اور ناقلین مذہب نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، اس مسئلہ میں علماء کے درمیان ذرا بھی اختلاف نہیں بجز اس کے جو امام رازیؒ نے حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ وقوفِ عرفہ واجب ہے اور اگر یہ فوت ہو جائے تو تمام حرم کا وقوف اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے" اور دیگر تمام فقہائے اس کا انکار کیا ہے۔ اور ان کا اس پر اتفاق ہے کہ حج وقوفِ عرفہ کے بغیر ادا نہیں ہوگا۔

وقوفِ عرفہ کا وقت البتہ علماء کا اس سلسلہ میں چند مسائل میں اختلاف ہے۔ اول یہ مسئلہ کہ عرفہ کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اوجز میں اس کو مفصل ذکر کیا ہے۔ دوم یہ مسئلہ کہ وقوف عرفہ کا وقت کب سے کب تک ہے۔ اوجز میں اس کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے "اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ فرض وقت کے اختلاف کا حاصل تین اقوال ہیں۔ اول، یوم

عرفہ کی صبح صادق سے یوم النحر کی صبح صادق تک یہ امام احمد کا قول ہے۔

دوم شب یوم النحر۔ غروب سے طلوع صبح تک۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔

سوم: یوم عرفہ کے زوال سے یوم النحر کی صبح صادق تک۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے اور بعض نے اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔

اور وقتِ وجوب میں دو قول ہیں۔ اول رات اور دن کو جمع کرنا۔ خواہ ان دونوں کے کسی بھی وقت میں حاصل ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ جیسا کہ دردیر نے تصریح کی ہے۔ اور صاحب الروض المربع نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور نوویؒ نے اپنے مناسک میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

دوم حنفیہ اور عامہ حنابلہ کا قول ہے کہ جب دن کو وقوف کیا ہو تو اس کو مابعد غروب تک لمبا کرنا واجب ہے۔ ملا علی قاری اور المغنی وغیرہ نے اسی کو ذکر کیا ہے اور اگر دن کو وقوف کا اتفاق نہیں ہوا تو رات میں لمبا کرنا واجب نہیں۔"

وقوف عرفات کی حکمت

مخفی نہ رہے کہ مقام عرفات کو وقوف کے لئے منتخب کرنے کی کئی حکمتیں ذکر کی گئی ہیں مگر سب سے بہتر حکمت اس ناکارہ کے نزدیک یہ ہے کہ عرفات ہی وہ جگہ ہے جہاں "عہد الست" ہوا تھا۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بروایت احمد حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے موضع نعمان یعنی عرفہ میں اولاد آدم سے عہد لیا" الحدیث۔ گویا وقوفِ عرفات کے ذریعہ وہ عہد یاد دلایا جاتا ہے۔ جو اسی جگہ) اولاد آدم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے لیا گیا تھا۔

عرفات کے علاوہ کسی اور جگہ عرفہ منانا

یہاں اس بات پر تنبیہ کرنا بھی مناسب ہے کہ ہمارے نزدیک تعریف مکروہ ہے (تعریف سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عرفہ کے دن حجاج وقوفِ عرفہ کرتے ہیں۔ ان کی نقل اتارنے کے لئے دوسرے لوگ بھی اپنی بستی سے نکل کر کسی کھلے میدان میں جمع ہوں)، جیسا کہ فقہ حنفی میں تصریح ہے، اور مالکیہ کے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ الدسوقی میں ہے۔ اور شرح مہذب میں ہے کہ غیر عرفات میں عرفہ منانے میں سلف کا اختلاف ہے، اثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے اس کے بارے میں

وھناك استجيب دعاء المغفرة فيما عدا المظالم، وھناك سقط رجل عن راحلته فمات

ترجمہ: اور اس جگہ باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت قبول ہوئی۔ اور اسی جگہ ایک آدمی اپنی سواری سے گر کر جان بحق ہو گیا۔

دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا" اور حسنؒ، ثابتؒ اور ان کے علاوہ کئی حضرات یہ عمل کیا کرتے تھے کہ وہ عرفہ کے دن مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور ایک جماعت نے: جن میں نافع، نخعی، حماد اور مالکؒ بن انس وغیرہ شامل ہیں، اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور ابوبکر طرطوشی مالکی نے بدعات منکرہ پر ایک کتاب لکھی ہے اور ان بدعات میں اس تعریف کو بھی ذکر کیا ہے۔

باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں دعائے مغفرت کا قبول ہونا

اور اس جگہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لئے دعائے مغفرت فرمائی چنانچہ انسانوں کی) باہمی حق تلفیوں کے ماسوا میں (آپ کی) دعائے مغفرت قبول ہوئی، جیسا کہ الخمیس، البدایہ والنہایہ۔ اور زرقانی کی شرح مواہب میں ہے اور مزدلفہ میں حقوق کے بارے میں بھی دعا قبول ہوئی جیسا کہ آگے مفصل آتا ہے۔

عرفات میں ایک حاجی کا انتقال

اور اسی جگہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی جس کا نام غیر معروف ہے، بحالت احرام اپنی سواری سے گر کر جان بحق ہو گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ اس کو احرام کی دونوں چادروں میں دفن کیا جائے۔ یہ حدیث تمام کتابوں میں معروف ہے۔ اس قصہ سے کئی احکام ثابت ہوتے ہیں، جن میں سے بارہ حکم حافظؒ نے تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سے دو مسئلے معروف ہیں اول یہ کہ محرم کے لئے چہرے کا ڈھانکنا مختلف فیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ اس کو جائز کہتے ہیں۔ اور امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہاں ایک تیسرا شاذ قول ہے کہ اگر زندہ ہو تو ڈھانکنا جائز ہے اور مر جائے تو ناجائز۔ یہ ابن حزم کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ زندہ کے لئے جائز نہیں اور مرنے کے بعد جائز ہے۔

موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک موت کے بعد احرام باقی رہتا ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک موت سے احرام ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ قدس سرہ نے کوکبِ دُرّی میں اس مسئلہ پر بہت عمدہ اور لطیف کلام کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے، بعض حضرات بشمول امام شافعیؒ، فرماتے ہیں کہ اس کا احرام باقی رہتا ہے اور بعض حضرات جن میں حضرت امامؒ بھی شامل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ موت سے احرام پورا ہو کر ختم، ہو جاتا ہے، امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کا استدلال اس حدیث سے ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا منہ ڈھانکنے کی ممانعت فرمائی اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ وہ قیامت کے دن تلبیہ و تہلیل کہتا ہوا اٹھے گا۔ اور امام صاحبؒ اور ان کے موافقین فرماتے ہیں کہ دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کا احرام منقطع ہو چکا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ماسوا تین چیزوں کے، صدقۂ جاریہ، یا ایسا عمل جس سے نفع اٹھایا جائے، یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے " یہ ارشاد نبوی اپنے عموم کے اعتبار سے مُحرم کو بھی شامل ہے۔ رہا یہ واقعہ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ احرام ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ ان صاحب کی خصوصیت ہو۔ اس بات کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو اسی حدیث میں وارد ہے جس سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں۔ یعنی آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو" چونکہ بیری کے پتے میل کچیل کو صاف کرتے ہیں، سر کی جوؤں کو مارتے اور بالوں کو نرم کرتے ہیں اس لئے ان کا استعمال مُحرم کے لئے ممنوع ہے، جب کہ ان صاحب کو اس سے غسل دینے کا حکم فرمایا ہے۔ رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ: "وہ قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا" اس سے ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ اس جملہ میں اس کا سر نہ ڈھکنے کی علت بیان فرمائی ہے یعنی اس کے احرام کا باقی ہونا۔ مگر یہ ظاہر نہیں، نہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے، بلکہ اس میں فاء تعقیب کے لئے ہے، جو صرف ایک فضیلت کو بیان کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔ اور اس جملہ سے ان صاحب کی نیز ہر اس شخص کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے جو کسی نیک عمل کی حالت میں مرجائے کہ وہ اسی حالت میں اٹھایا جائے گا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نیکیاں جمع کرنے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی ترغیب دی، کیونکہ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت لقمۂ اجل اور نشانۂ حوادث بن جائے۔ اور یہ تو سب کو مسلم ہے کہ لوگ جن احوال و اعمال میں مرے ہوں گے قیامت کے دن انہیں حالات میں اٹھیں گے۔ اس صورت میں اس شخص کا قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھنا منہ کے نہ ڈھانکنے پر موقوف نہیں، بلکہ ہر دو صورت

وھناك نزلت علیه الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا "

ترجمہ: اور اسی جگہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی "الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

میں وہ تلبیہ کہتے ہوئے اٹھے گا۔ دیکھئے ایک شخص کا انتقال سجدہ کی حالت میں ہو جاتا ہے تو وہ قیامت میں بحالتِ سجدہ اٹھے گا۔ کیا ہمارے لئے جائز ہوگا کہ ہم اسے قبر میں نہ لٹائیں کیونکہ اسے سجدہ کی حالت میں اٹھنا ہے، اس لئے کیا اسے اسی حالت میں رکھ دیا جائے گا؟ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ پس اسی طرح محل متنازع فیہ میں سمجھنا چاہیئے، حاصل یہ کہ احکام دنیویہ کو آخرت کے احکام پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ شخصی واقعہ اس قاعدہ کلیہ کو دفع نہیں کر سکتا، جب کہ اس میں دیگر احتمالات بھی ہیں۔ جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا" انتہی۔

آیت: الیوم اکملت لکم دینکم کا نازل ہونا

(ق) اور اسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی: الیوم اکملت الخ یعنی آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے تم پر انعام تام کر دیا۔ اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا" (ترجمہ حضرت تھانویؒ) اس آیت کے نازل ہونے پر ناقہ بیٹھ گئی۔ کذا فی الخمیس، اور بہجۃ المحافل میں ہے کہ اس آیت کا نزول جمعہ کے دن عصر کے بعد ہوا۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ عضباء پر عرفات میں وقوف فرما تھے۔ نزول آیت کے وقت قریب تھا کہ شدتِ ثقل کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔ اس لئے ناقہ نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ صحیح بخاری میں طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ یہود نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ تم ایک آیت پڑھتے ہو اگر وہ ہمارے ہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس (کے نازل ہونے کے دن) کو عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ کس جگہ نازل ہوئی؟ کب نازل ہوئی؟ اور اس کے نزول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تشریف فرما تھے؟ یہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی اور واللہ! میں اس وقت عرفہ میں تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اور اس میں پانچ عیدیں جمع تھیں، جمعہ، عرفہ،

فلما غربت الشمس افاض من عرفة

ترجمہ: پس جب آفتاب غروب ہوا تو عرفات سے چلے،

عید یہود، عید نصاریٰ، عید مجوس۔ تمام اہل ملل کی عیدیں نہ اس سے پہلے کبھی جمع ہوئیں نہ اس کے بعد۔

اس آیت کے نازل ہونے پر حضرت عمرؓ کا رونا

ہارون بن عنترہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت کیا، تو عرض کیا "رونا تو اس کا ہے کہ اب تک تو ہمارے دین میں ترقی و اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہ کامل ہو چکا اور قدرتی بات ہے کہ جب کوئی چیز حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو (ہر کمالے را زوالے کے مطابق) اس میں کمی اور تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا "سچ کہتے ہو"۔ اس آیت کے بعد حلال و حرام اور فرائض و احکام کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی دن اس عالم فانی میں رہے۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گویا پیغام وصال تھا"۔ اھ

عرفات سے روانگی کا وقت

پس جب آفتاب غروب ہوا، اور اچھی طرح غروب ہو گیا، تو عرفات سے چلے، موفق فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص غروب سے پہلے چل پڑے تو جماعت فقہاء کے قول میں اس کا حج صحیح ہے۔ البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا حج نہیں ہوا، ابو عبدالبر فرماتے ہیں کہ فقہا امصار میں سے کسی کا ہمیں علم نہیں جو امام مالکؒ کے قول کا قائل ہو"۔

غروب سے پہلے عرفات سے چلنا

موفق آگے لکھتے ہیں: "جو شخص غروب سے پہلے چل پڑے اکثر اہل علم کے نزدیک اس پر دم لازم ہے۔ امام شافعیؒ، اصحاب رائے اور ان کے متبعین کا یہی مذہب ہے"۔ نیز وہ فرماتے ہیں: "لوگوں کو امام سے پہلے چلنا مناسب نہیں۔ امام احمد کا قول ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص امام سے پہلے جائے" ان سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص غروب کے بعد امام سے پہلے چل دیتا ہے تو فرمایا کہ میں نے کسی عالم کو نہیں پایا کہ وہ اس معاملہ میں نرمی کرتا ہو، سب ہی سختی کرتے ہیں"۔ ہمارا حنفیہ کا مسلک، جیسا کہ انکی کتابوں میں ہے، یہ کہ اگر کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے حدود عرفہ سے نکل جائے تو اس کے ذمہ دم لازم ہے، کیونکہ مابعد غروب تک عرفہ میں ٹھہرنا واجب ہے۔ جیسا کہ عنقریب گذرا۔ اور شرح لباب

من طريق المأزمين۔
ترجمہ: مأذمین کے راستے سے۔

میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلنے کے بیان میں ہے: "حاصل یہ کہ مزدلفہ سے امام کے ساتھ چلنا سنت ہے۔ بخلاف عرفہ کے، کہ وہاں سے امام کے ساتھ چلنا واجب ہے۔"

مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھنے کا حکم

باقی رہا نماز مغرب کا مسئلہ! تو موفق فرماتے ہیں: "جو شخص عرفہ سے چلے اس کے لئے سنت یہ ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب نہ پڑھے اور مزدلفہ پہنچ کر مغرب و عشاء کو جمع کرے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔" کذا فی الاوجز۔ اور "باب النزول بین عرفہ و المزدلفہ" کے ذیل میں حافظؒ نقل کرتے ہیں کہ: "حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "نماز نہیں مگر مزدلفہ میں" اور کوفیین اور ابن قاسم سے منقول ہے کہ اگر کسی نے مزدلفہ سے پہلے پڑھ لی تو اعادہ واجب ہے۔ اور امام احمدؒ سے مروی ہے کہ اگر پڑھ لی تو صحیح ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ اور جمہور کا یہی قول ہے۔" اور اوجز میں ہے کہ مزدلفہ پہنچنے سے پہلے مغرب پڑھ لی اور مغرب و عشاء کو جمع نہیں کیا تو اس نے سنت کے خلاف کیا مگر نماز صحیح ہوگی۔ یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام اسحاق اور ابو یوسف کا قول ہے، اور امام ابو حنیفہؒ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ: نماز صحیح نہیں ہوگی۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور حنفیہ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نماز تمہارے آگے ہے" جو عنقریب آتا ہے۔

مأزمین کا راستہ

(عرفات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی) مأزمین کے راستے سے ہوئی)، شرح لباب کے حوالے سے پہلے گذر چکا ہے۔ کہ عرفہ کی طرف "ضَبّ" کے راستے سے جانا اور وہاں سے "مأزمین" کے راستے سے واپس آنا مستحب ہے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ: "مأزمان: میم کا فتح، ہمزہ کا سکون۔ زا کا کسرہ۔ اس کے بعد میم مفتوح۔ پھر نون تثنیہ عرفہ اور مزدلفہ کے مابین ایک معروف جگہ ہے۔" نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں: "مزدلفہ کی طرف جاتے میں "مأزمین" کا راستہ سنت ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے تصریح کی ہے ضَبّ کا راستہ سنت نہیں۔" اھ مختصراً

وارداف اسامة بن زید و نزل فی اثناء الطریق فبال۔

ترجمہ: اور اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور اثنار راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔

(ق) اسی طرح عیدین میں راستہ بدلنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی (رشی) امام بخاریؒ نے اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے: "باب من خالف الطریق اذا رجع یوم العید"۔ حاشیہ لامع میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اور اس میں بحوالہ حافظؒ اس کی حکمت میں بیس سے زیادہ اقوال نقل کئے ہیں۔ نقل کئے ہیں۔

اور اُسامہ بن زید کو اپنے پیچھے سوار کیا۔ اور نہایت سکون سے روانہ ہوئے۔ ناقہ کی مہار یہ کھینچ رکھی تھی۔ تاکہ وہ تیز نہ چلے۔ یہاں تک کہ اس کا سر کجاوے کے اگلے حصہ سے لگ جاتا تھا۔ آپ کی سواری متوسط رفتار سے چل رہی تھی۔ کسی جگہ راستہ کشادہ ہوتا تو اس کی رفتار قدرے تیز کر دیتے۔ اور کہیں ٹیلا آتا تو اس کی مہار ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ تاکہ اس کے لئے چڑھائی آسان ہو۔

آنحضرتؐ کا ارشاد علیکم السکینۃ

لوگ دائیں بائیں اونٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف التفات فرماتے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے: "لوگو! سکون اور وقار کو لازم پکڑو"۔ یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابو داؤد کی روایت میں "لایلتفت الیہم" کے لفظ ہیں یعنی آپ لوگوں کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ شیخ نے بذل میں ابو داؤد کی روایت کو وہم قرار دیا ہے۔ کیونکہ اکثر روایات "نہیں" کے لفظ سے خالی ہیں اور اگر یہ لفظ صحیح ہو تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ بعض اوقات التفات فرماتے تھے، اور بعض اوقات التفات نہیں کرتے تھے۔ ابو الطیب شارح ترمذیؒ محب طبریؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ جس میں لا کا لفظ نہیں۔ میرے والد نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت امام ربانی کی تقریر ابو داؤد میں لکھا ہے کہ: "صرف چہرۂ انور کے ساتھ التفات فرماتے تھے۔ پورے جسم کے ساتھ نہیں"۔

اثنار راہ میں پیشاب کے لئے اترنا اور دو حدیثوں میں تعارض کا حل،

اور اثنار راہ میں سواری سے اتر کر پیشاب کیا۔ اور اوجز میں ہے کہ اس پر یہ اشکال ہے کہ ابو داؤد اور مسند احمد میں حضرت شریدؓ سے مروی ہے کہ عرفات سے واپسی میں میں

وتوضأ

ترجمہ: اور وضو کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ پس آپ کے قدم مبارک زمین پر نہیں لگے۔ یہاں تک کہ آپ مزدلفہ پہنچ گئے۔ ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "اس سے مقصود اس امر کا بیان کرنا ہے کہ عرفات سے مزدلفہ تک کا سفر سواری پر ہوا۔ لہذا اتر کر وضو کرنے کی روایت اس کے خلاف نہیں" اھ۔ حاصل یہ کہ عرفات سے مزدلفہ تک کی مسافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوار ہونے کو خوب مبالغہ سے بیان کرنا مقصود ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساری مسافت سواری پر طے کی۔ اور پیدل نہیں چلے۔ یہ مطلب نہیں ہیں کہ آپ سواری سے اترے ہی نہیں۔ لہذا یہ حدیث، حدیثِ اُسامہ کے معارض نہیں۔ صاحب عون المعبود نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف تھے اس لئے ان کی حدیث کو ترجیح ہے۔ مگر یہ جواب بعید ہے کیونکہ حضرت شریدؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں تصریح ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ لہذا یہاں ایک دوسرے پر ترجیح ممکن نہیں۔ کذا افادہ الشیخ فی البذل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثنائے راہ میں سواری سے اترنا مزدلفہ سے پیچھے "شعب الایسر" کے پاس ہوا تھا۔ جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے، زرقانی فرماتے ہیں یہ "شعب اذاخر ہے" [اذاخر ہمزہ اور ذال مفتوح پھر الف اور خاء مکسورہ، پھر راء] جو مازمین کے درمیان راستے کی بائیں جانب ایک جگہ ہے" اھ یہ امراء یعنی خلفائے بنو امیہ کی فرودگاہ تھی، کیونکہ وہ یہاں اترتے اور مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ الفاکہی نے حضرت عکرمہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پیشاب گاہ بنایا تھا۔ اور تم نے اس کو نماز گاہ بنا لیا ہے" گویا ان لوگوں پر اعتراض کرنا مقصود ہے جو جمع بین الصلوٰتین کو ترک کرتے تھے" اور ابو داؤد کی روایت میں حضرت اسامہؓ سے مروی ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا: "ہم اس گھاٹی میں آئے۔ جس میں نزول شب کے لئے لوگ اونٹ بٹھاتے ہیں" (الحدیث)

اور ہلکا پھلکا وضو کیا۔ اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "اور وضو میں اسباغ نہیں فرمایا:" ابو داؤد کے لفظ یہ ہیں: "پس ایسا وضو کیا جس میں زیادہ مبالغہ نہیں تھا" اوجز میں اس پر بڑی تفصیل سے

کلام کیا ہے کہ اس سے مراد وضو شرعی ہے یا بعض اعضار کے اعتبار سے وضو لغوی، یا استنجا؟ زیادہ مناسب یہ ہے کہ وضو شرعی مراد لیا جائے۔ کیونکہ لغوی وضو کو وضو خفیف نہیں بلکہ وضو ناقص کہا جاتا ہے۔ اور استنجا بھی مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ حضرت اسامہؓ کا یہ ارشاد کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانی ڈالا، اس مراد کے منافی ہے، اور ابن عبداللہ کا یہ اعتراض لازم نہیں آتا کہ ایک نماز کے لئے دو مرتبہ وضو مشروع نہیں۔ کیونکہ دوبارہ وضو نئے حدث کی وجہ سے کیا ہوگا۔ نیز یہ بھی متفق علیہ نہیں کہ نیا وضو صرف اسی شخص کے لئے مشروع ہے جو پہلے وضو سے فرض یا نفل نماز ادا کرچکا ہو۔ پہلا وضو آپ نے محض اس لئے کیا تھا کہ طہارت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ بالخصوص اس حالت میں تو بقاء طہارت بہت ہی اہم تھی۔ کیونکہ ذکر الٰہی کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اور ہلکا وضو اس لئے کیا کیونکہ پانی اس موقعہ پر کم تھا" الی آخر بالبسط فی الاوجز۔

آبِ زمزم سے وضو

فائدہ: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جس پانی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر وضو کیا تھا، وہ ماءِ زمزم تھا۔ جیسا کہ عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند احمد میں حضرت علیؓ سے بسند حسن نقل کیا ہے، اس سے ان لوگوں کی تردید ہوجاتی ہے جو کہتے ہیں کہ ماء زمزم کا استعمال پینے کے علاوہ ممنوع ہے۔ ابن حجر شرح مناسک میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا تو ہے مگر جب تک یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی موجود تھا مگر اس کے باوجود آپ نے زمزم سے وضو کیا تب تک یہ استدلال تام نہیں۔ ورنہ یہ احتمال بھی ہے کہ آپؐ کا آبِ زمزم سے وضو کرنا اس لئے تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی پانی آپ کے پاس نہ تھا۔ اس لئے اسی سے وضو کرنا پڑا"۔ میں کہتا ہوں کہ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال پر دوسروں کے استعمال کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص جب کہ آپؐ کے فضلات کی طہارت کا قول راجح قرار دیا گیا ہے۔ دُرِّ مختار میں ہے: "زمزم سے استنجا مکروہ ہے غسل مکروہ نہیں"۔ نیز دُرِّ مختار میں ہے کہ "ماءِ مطلق اور ماءِ زمزم سے رفع حدث کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ امام احمد سے روایت ہے کہ مکروہ ہے"۔ ابن عابدین فرماتے ہیں: "پہلے قول سے مستفاد ہوتا ہے کہ نفی کراہت رفع حدث سے مخصوص ہے۔ ازالۂ نجاست کا یہ حکم نہیں"۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور شرح لباب میں ہے: "ماءِ زمزم بکثرت پینا مستحب ہے اور زمزم میں نظر کرنا عبادت ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ماءِ زمزم سے وضو اور غسل بلا کراہت جائز ہے البتہ امام احمدؒ کا اس میں اختلاف

فقال اسامة الصلوٰة یارسول اللہ قال المصلی امامك ۔ ثم سار فاتی المزدلفة

ترجمہ: حضرت اسامہ نے عرض کیا: "یارسول اللہ نماز؟ فرمایا نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے" پھر روانہ ہوئے۔

مزدلفہ پہنچے

ہے اور مسح، غسل اور تجدید وضو کے لئے زمزم کا استعمال بمقصد تبرک ہونا چاہئیے۔ اور صرف پاک چیز پر اسے استعمال کیا جائے۔ اس لئے ناپاک کپڑا دھونا، غسل جنابت کرنا۔ اور بے وضو کا وضو کرنا یا کسی ناپاک جگہ میں اس کو استعمال کرنا اچھا نہیں۔ اور اس سے استنجا کرنا مکروہ ہے۔ بلکہ بعض علماء نے اس کو حرام کہا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے استنجا کیا۔ تو بواسیر کا مرض پیدا ہو گیا" انتہیٰ مختصراً

نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں "پس جمہور کا مذہب، ہمارے مذہب کی طرح یہ ہے کہ اس سے غسل اور وضو مکروہ نہیں۔ امام احمد سے ایک روایت ہے کہ مکروہ ہے" مغنی نے دونوں روایتوں کو نقل کر کے جواز کو ترجیح دی ہے۔ اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس کا شرف اس کے استعمال کی کراہت کا موجب نہیں۔ جیسا کہ اس پانی کا استعمال مکروہ نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ڈالے ہوں یا اس سے غسل فرمایا ہو"

حضرت اسامہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ! نماز؟ فرمایا" نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے" اوجز میں ہے کہ باجی فرماتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "نماز کی جگہ تمہارے آگے ہے" اس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز کا یہ وقت نہیں۔ یا نماز کی یہ جگہ نہیں۔ یا اتفاق سے دونوں چیزیں وہاں جمع ہو گئی ہوں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نماز نہ پڑھے یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچ جائے۔ اور امام مالک نے اس مسئلہ پر اسی ارشاد نبویؐ سے استدلال کیا ہے۔ ابن حبیب کہتے ہیں کہ جس نے مزدلفہ سے قبل بلا عذر نماز پڑھ لی اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے" الخ

مزدلفہ پہنچنا، اور مزدلفہ کی وجہ تسمیہ

پھر آپؐ سواری پر روانہ ہوئے، مزدلفہ پہنچے، زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ "یہ عرفات و منیٰ کے درمیان ایک جگہ ہے جو سب کی سب حدود حرم کے اندر ہے۔ اس کا نام جمع بھی ہے۔ بفتح جیم وسکون میم۔ یا تو اس وجہ سے کہ حضرت آدم حضرت حواؑ علیہما السلام کے ساتھ اس جگہ جمع ہوئے اور ان کے قریب گئے۔ یا بقول بعض اس لئے کہ یہاں دو نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ یا بقول بعض اس لئے کہ لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور

فتوضاء فصلی المغرب

ترجمہ : پس وضو کیا اور مغرب کی نماز پڑھی

یہاں ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کا قرب وازدلاف حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام مزدلفہ ہوا؛ حافظؒ اس پر اضافہ فرماتے ہیں کہ یا اس لئے کہ لوگ منیٰ کے قریب ہوجاتے ہیں۔ یا اس لئے اس میں رات کے ہر زُلفہ (حصہ) میں نزول ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں قرب ومنزلت (کا ذریعہ) ہے۔ پس نماز کا وضو کیا۔ بخاری ومسلم کے الفاظ یہ ہیں "پس جب مزدلفہ پہنچے تو سواری سے اترے پس وضوء کیا۔ اور خوب کامل وضو کیا" اور اوجز میں ہے کہ "احتمال ہے کہ محض وضو کی تجدید کی ہو۔ یا حدث لاحق ہونے کی بنا پر وضو کیا ہو" اور پھر مؤذن کو حکم دیا چنانچہ اذان ہوئی اور آپ نے کجاوے اتارنے اور اونٹ بٹھانے سے پہلے نماز مغرب ادا کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد کھانا تناول فرمایا یا نہیں؟

راجح قول کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً نے اس وقت شام کا کھانا نہیں تناول فرمایا جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی میں ہے کہ باجی فرماتے ہیں "ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کھانا تناول فرمایا۔ حنفیہ میں سے صاحب ہدایہ وغیرہ نے اس کی موافقت کی ہے لیکن شراح ہدایہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی نہیں بلکہ تو حضرت ابن مسعودؓ کے عمل سے ثابت ہے۔ حافظ درایہ میں فرماتے ہیں "یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کا کھانا کھایا۔ مجھے صراحۃً مرفوع نہیں ملی، البتہ بخاری شریف میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل مذکور ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ جب صبح صادق ہوئی تو انہوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ اور اسی روایت میں ان کا یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں نمازیں اپنے وقت سے ہٹادی گئی ہیں اور آخر میں فرمایا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے" پس احتمال ہے کہ اس فقرے سے ان کی مراد صرف دو نمازوں کا جمع کرنا اور ان کے فہم کے مطابق دونوں نمازوں کا اپنے وقت سے ہٹایا جانا مراد ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی مراد ان تمام افعال سے ہو جو ان سے صادر ہوئے"

فصلی العشآءِ

ترجمہ : پھر عشاء پڑھی

میں کہتا ہوں کہ غالباً باجی اور صاحب ہدایہ اور ان کے موافقین نے حدیث کو دوسرے احتمال پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور بالخصوص حنفیہ نے پہلے احتمال پر۔ اسی بنا پر ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ عشاء کے لئے الگ اقامت نہ کہی جائے۔ بلکہ پہلی اقامت ہی کافی ہے۔ اور شیخ نے بذل میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کی یہ توجیہہ کی ہے کہ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آپؐ کے حکم سے مغرب و عشاء کے درمیان کھانا کھایا اس کو مجازاً آپؐ کی طرف منسوب کردیا گیا۔ ثم دق (پس جب کجاوے اتارے گئے تو اقامت کا حکم فرمایا

مزدلفہ میں اذان اور اقامت میں اختلاف

پس اقامت ہوئی پھر عشاء پڑھی اور ہمارے حنفیہ کے) نزدیک جیسا کہ شرح لباب میں ہے: "اس جمع میں تعجیل مستحب ہے اس لئے فرض نماز [یعنی جنس فرض جو دونوں نمازوں کے جمع کرنے پر صادق ہے] کجاوے یعنی سامان اتارنے سے پہلے پڑھے۔ بشرطیکہ امن کی حالت ہو اور سواری کا مالک بھی راضی ہو۔ اور اونٹوں کو بٹھاوے کیونکہ اس سے بنسبت کھڑے رہنے کے ان کے لئے آسان ہوگی۔ یا ان کی حفاظت کی قصد سے (ان کو بٹھاوے) اور ان کو عقال بھی لگادے۔ پس جب عشاء کا وقت ہو تو مؤذن اذان و اقامت کہے اور امام مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں جماعت سے پڑھے۔ پھر عشاء جماعت سے پڑھے اور عشاء کے لئے اذان و اقامت کا اعادہ نہ کرے" اھ۔ ابن قیمؒ الہدیٰ میں فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں نمازیں دو اذانوں اور دو اقامتوں سے پڑھیں۔ جیسا کہ عرفہ میں بھی یہی کیا"

علماء کے اس مسئلہ میں چھ قول ہیں، جو اوجز میں مذکور ہیں۔ اول اذان کے بغیر دو اقامتیں۔ یہ امام اسحٰق کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت اور خطابی کی نقل کے مطابق امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ دوم: صرف ایک اقامت پہلی نماز کے لئے۔ یہ ثوریؒ کا قول ہے۔ اور امام احمد کی ایک روایت ہے۔ سوم ایک اذان دو اقامتیں، یہ امام احمد کا صحیح قول اور امام طحاوی و امام زفر کا قول ہے۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہی ہمارے ہاں صحیح ہے۔ چہارم

ایک اذان ایک اقامت صرف پہلی نماز کے لئے۔ یہ حنفیہ کا مذہب ہے، جیسا کہ شرح لُباب سے اوپر گذر چکا ہے۔ مگر اس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں میں کھانے وغیرہ کا فصل نہ ہو، پنجم: دو اذانیں اور دو اقامتیں یہ مالکیہ کا مذہب ہے۔ ششم: بغیر اذان و اقامت۔ محب طبری نے یہ قول بعض سلف سے نقل کیا ہے" انتہی مختصراً۔ ان اقوال کے ماخذ اوجز میں مذکور ہیں۔

دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد (ش) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نمازوں کے درمیان نوافل نہیں پڑھے نہ ان کے بعد وتروں کے علاوہ کچھ پڑھا۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اس پر امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے" باب من جمع بینہما ولم یتطوع" اور اس کے ذیل میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں نمازوں کو جمع کیا اور ان کے درمیان نوافل نہیں پڑھے، نہ ان کے بعد" اوجز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اس میں مالکیہ کی کتابوں سے نقل کیا ہے کہ نہ ان دونوں کے درمیان نوافل پڑھے نہ ان کے بعد۔ اور ابن حجر کی شرح منہاج سے نقل کیا ہے کہ "مسنون یہ ہے کہ نماز مغرب کے بعد ہر شخص اپنی سواری بٹھائے اور ان کے عقال باندھے پھر عشاء کی نماز پڑھیں۔ پھر سامان کھولیں۔ پھر سنتیں اور وتر پڑھیں" اور ہمارے حنفیہ کے نزدیک دونوں کے درمیان نوافل مکروہ ہیں۔ جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے شرح لُباب میں تصریح کی ہے اور دونوں نمازوں کے بعد جمع عرفات میں نوافل مکروہ ہیں، مزدلفہ میں مکروہ نہیں۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں" دونوں کے درمیان نفل نہ پڑھے، بلکہ مغرب وعشاء کی سنتیں اور وتر دونوں کے بعد پڑھے" اور مرقاۃ میں فرماتے ہیں" قولہ ولم یسبح بینہما شیئاً" یعنی دونوں نمازوں کے درمیان سنتیں اور نفل نہیں پڑھے۔ اور معتمد یہ ہے کہ مغرب وعشاء کی سنتیں اور وتر دونوں کے بعد پڑھے۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ عشا کی سنتیں اور وتر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کے لئے لیٹ گئے" اھ مزدلفہ میں مغرب وعشا کا جمع کرنا حنفیہ، مالکیہ، اور حنابلہ کے نزدیک افعال حج کے سبب سے ہے جیسا کہ اوجز میں تفصیلاً اور بذل میں اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اور

ثم نام حتی اصبح

ترجمہ: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

شافعیہ کے قول میں یہ جمع سفر کی بنا پر ہے۔ نوویؒ شرح مسلم میں کہتے ہیں کہ صحیح ہمارے اصحاب کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جمع سفر کے سبب سے ہے، لہذا یہ صرف اسی مسافر کے لئے جائز جس کا سفر مدتِ قصر تک پہنچتا ہو"۔ اھ

مزدلفہ کی رات تہجد پڑھی یا نہیں؟

(ق) پھر آپؐ سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اور اس رات شب بیداری نہیں کی۔ اھ قسطلانی نے مواہب میں اس پر بسط سے لکھا ہے۔ اور ترکِ تہجد کے وجوہ میں ان اعمال کا ذکر کیا ہے جو پہلے ذکر ہوئے یعنی زوال سے غروب تک عرفہ کا وقوف، دعاء اور تضرع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبالغہ واجتہاد اور غروب کے بعد عرفہ سے مزدلفہ تک کا سفر، نیز وہ بہت سے اعمال جو آپؐ کو یوم النحر میں کرنے تھے یعنی بہت سی قربانیوں کا نحر، رمی، اور طواف زیارۃ وغیرہ، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے"۔ انتہی مختصراً۔ اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اگر کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کو کیسے ترک فرمایا جب کہ ایک جماعت کے قول کے مطابق وہ آپؐ پر فرض تھی۔ جواب یہ ہے کہ ترک تہجد اس جماعت کے قول پر مبنی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ تہجد آپؐ پر فرض نہیں تھی۔ اور شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور مولانا بحر العلوم نے "رسائل الارکان" میں اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ کی رات تہجد نہیں پڑھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سے مستحب امور کو عام مجمعوں میں ترک فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ انہیں سنت نہ بنالیں"۔ اور بحر العلوم فرماتے ہیں: "راوی کے اس قول میں کہ "آپ لیٹ گئے" اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد نہیں پڑھی، قسطلانیؒ نے مواہب میں اس کی تصریح کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احیاء العلوم میں جو لکھا ہے کہ: "اس رات، رات کے نوافل ترک نہ کرے، بلکہ اس رات ان کا ادا کرنا تو بہت ہی اہم ہے"۔ یہ غیر مناسب ہے"۔

شیخ فرماتے ہیں کہ احیاء میں جو لکھا ہے وہ بظاہر اس قول پر مبنی ہے کہ تہجد آپؐ پر فرض تھی۔ پس بظاہر آپؐ نے واجب کو ترک نہیں فرمایا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تہجد فرض ہو یا سنت

(قال) واذن لضعفة اهله ان يتقدموا الى منى قبل طلوع الفجر عند غيبوبة القمر وامرهم ان لا يرموا حتى تطلع الشمس

ترجمہ: (ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء اہل بیت کو اجازت دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے، جب کہ چاند غروب ہو، منیٰ چلے جائیں اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

بہرحال راوی کا یہ کہنا کہ آپ لیٹ گئے اس کے علم پر محمول ہوگا کہ اس نے آپ کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا، یا یہ کہا جائے کہ آپ مغرب وعشا کی سنتیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے ہوں گے کیونکہ وتر حنفیہ کے نزدیک واجب ہیں۔ ان دونوں حضرات کے قول پر لازم آئے گا کہ آپ نے نماز تہجد کی طرح نماز وتر کو بھی ترک فرمایا۔ ورنہ وتر کا اطلاق جس طرح وتر پر ہوتا ہے اس طرح نماز تہجد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، پس بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد اور وتر دونوں پڑھے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔" انتہیٰ مافی البذل۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بحوالہ المرقاۃ پہلے گزر چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سنتیں اور وتر پڑھنے کے بعد لیٹے تھے۔ اور وتر کا لفظ تہجد کے لئے روایات میں شائع ذائع ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ آپ تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ رکعات کیساتھ وتر (تہجد) پڑھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت روایات اس مضمون کی وارد ہیں۔ اور یہ بحث کہ تہجد آپ پر فرض تھی یا نہیں؟ حاشیۂ لامع میں کتاب التہجد کے آغاز میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ یہ حضرت ام سلمہؓ کی باری کا دن تھا، میں کہتا ہوں کہ امام ابوداؤد نے "باب التعجیل من جمع" میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو لیلۃ النحر میں بھیجا۔ اور یہ وہ دن تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے یہاں تھے۔" اس پر مفصل کلام عنقریب آتا ہے۔

ضعفاء کو منیٰ جلدی جانیکی اجازت

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفا اہل بیت کو اجازت دی کہ وہ طلوع فجر سے پہلے جب کہ چاند غروب ہو، منیٰ چلے جائیں۔ اور انہیں حکم فرمایا کہ آفتاب طلوع ہونے سے پہلے رمی نہ کریں۔

(ش) یہاں چند بحثیں ہیں۔

اول ضعفاء سے کون لوگ مراد ہیں؟

اور ضعفاء اہل بیت میں سے حسب ذیل حضرات کے نام روایات میں مصرح ہیں، ۱ حضرت سودہؓ جیسا کہ صحیحین وغیرہ

میں ہے، یہ کمزور اور بھاری جسم کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اپنی کبرسنی کے زمانے میں فرمایا کرتی تھیں کہ کاش میں نے بھی اجازت حاصل کر لی ہوتی۔ حضرت ام سلمہؓ جیسا کہ ابو داؤد اور نسائی کی روایت میں ہے، ام حبیبہؓ رضی اللہ عنہا۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ چنانچہ شیخین وغیرہ کی روایت میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے کمزور لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بھیجا تھا"، حضرت عباس رضی اللہ عنہ۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا تھا: "آپ ہمارے کمزور بچوں اور عورتوں کو لے جائیے" تاکہ یہ نماز فجر منیٰ جاکر پڑھیں، جیسا کہ زرقانی شرح مواہب میں ہے۔ اور فتح الباری میں ہے کہ "صحیح ابوعوانہ کی حدیث میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو منیٰ بھیج دیا کرتے تھے"۔ مذکورہ بالا حضرات کی روایت شیخ ابن قیمؒ اور صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی ذکر کی ہے، علامہ عینی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ضعفاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں عینی کہتے ہیں کہ عاجز بوڑھے بھی اس میں داخل ہیں۔

دوم، جانے کا وقت ظاہر روایات کے مطابق دسویں رات کے چاند کے غروب کا وقت ہے، صحیحین، مؤطا اور دیگر کتب حدیث میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی روایت اس باب میں مصرح ہے کہ وہ نماز میں مشغول تھیں اور دریافت کرتیں کہ کیا چاند غروب ہوگیا؟ اور جب چاند کے غروب کی خبر دی گئی تو فرمایا "پس چلو"۔ اور حاشیہ لامع میں ہے "کہ حافظین ابن حجر و عینی کہتے ہیں کہ اس رات چاند کا غروب ثلث اخیر کے اوائل میں ہوتا ہے"۔ اور ابن قیم کہتے ہیں کہ سنت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعجیل نصف شب کے بعد نہیں بلکہ چاند غروب ہونے کے بعد ہے۔ اور جن لوگوں نے نصف شب سے تحدید کی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں"۔ اور اوجز میں حضرت طلحہؓ کے اس اثر ذیل میں کہ "وہ اپنے گھر کی عورتوں کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے الخ" باجی سے نقل کیا ہے کہ راوی نے اس تقدیم کا وقت بیان نہیں کیا۔ اس لئے احتمال ہے کہ ان کا منیٰ آنا فجر سے اس قدر پہلے ہو کہ وہ فجر کی نماز منیٰ میں پڑھ سکیں۔ جیسا کہ حضرت اسماء کی حدیث میں ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کا آنا فجر کے بعد اور وقوف سے قبل ہو۔ مگر اُن کے لئے زیادہ سہولت اس میں ہے کہ فجر سے پہلے چلیں کہ اس صورت میں ان کو تنہائی زیادہ میسر ہوگی"۔ اور اسی میں ایک دوسری جگہ ہے کہ موفق کہتے ہیں:

"عورتوں اور بچوں اور کمزوروں کو پہلے بھیج دینے میں مضائقہ نہیں۔ عبدالرحمان بن عوفؓ اور حضرت عائشہؓ اور دیگر حضرات اپنے کمزور اہل و عیال کو پہلے بھیج دیا کرتے تھے۔ اور امام شافعیؒ اور اصحاب سارے اسی کے قائل ہیں۔ اور ہمیں معلوم نہیں کہ اس میں کسی کا اختلاف ہو۔" اوجز میں اس پر بسط سے لکھا ہے اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے :۔

مزدلفہ میں شب گذاری اور وقوف میں اختلاف

"یاد رہے کہ یہاں دو مسئلے ہیں۔ ایک دسویں رات مزدلفہ میں گذارنے کا۔ اور دوسرا مزدلفہ میں نماز فجر کے بعد وقوف کا۔ یہ دونوں بسا اوقات ناقلین مذاہب پر ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ان کے اقوال مختلفہ اوجز میں نقل کر چکا ہوں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ظاہر یہ رکنیتِ وقوف کے قائل ہیں۔ ابن حزم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن مردوں کو مزدلفہ میں امام کے ساتھ صبح کی نماز نہ مل سکے ان کا حج باطل ہے ـــــ باقی رہے ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین! تو ان کے مذاہب میں سے صحیح یہ ہے کہ نصفِ اول کے مابعد تک مزدلفہ میں رہنا معتمد قول کے مطابق امام شافعیؒ ـــــــ اور امام احمد کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ نصف شب سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا ہو ورنہ نصفِ اخیر میں ایک گھڑی کی حاضری بھی کافی ہے۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک کجاوے اتارنے کی بقدر ٹھہرنا واجب ہے خواہ رات کے کسی حصہ میں ہو۔ اور حنفیہ کے نزدیک مزدلفہ میں رات رہنا سنّتِ موکدہ ہے۔ رہا فجر کے بعد وقوف کرنا تو یہ حنفیہ کے نزدیک واجب، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت، ابن ماجشون مالکی اور ابن عربی کے نزدیک رکن ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کمزوروں اور عورتوں کو پہلے بھیج دینا بالاجماع جائز ہے، جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے لکھا ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: "اگر مزدلفہ میں شب باشی کو ترک کر دیا تو اس کی تلافی دم سے کرے۔ اور جس نے عذر کی بنا پر ترک کیا اس کے ذمہ کچھ نہیں" اور دردیر کہتے ہیں: "کمزور عورتوں اور بچوں کو پہلے بھیج دینے کی بطور استحباب رخصت ہے۔" دسوقی اس پر لکھتے ہیں: "یعنی جب کہ کجاوے اتارنے کی بقدر وہ مزدلفہ میں قیام کر چکے ہوں۔ اور کسی نے بالکل ہی قیام نہیں کیا تو اس پر دم لازم ہے۔ اور اس میں کمزور وغیرہ کا کوئی فرق نہیں۔" اور شرح لباب میں ہے کہ :

"مزدلفہ میں رات رہنا فجر تک سنت موکدہ ہے، اور فجر کے بعد وقوف واجب ہے۔ اور اگر وقوف ترک کر دیا تو دم لازم ہوگا۔ البتہ اگر ترکِ وقوف کسی عذر کی بنا پر ہو تو اس کے ذمہ کچھ نہیں، مثلاً کوئی زیادہ سن رسیدہ ہو،

یا بچہ ہو، یا عورت ہو جس کو ہجوم سے اندیشہ ہو۔"

یوم النحر کی رمی کا وقت

بحث سوم: مصنف کے اس قول میں کہ "ان کو حکم فرمایا کہ سورج نکلنے سے پہلے رمی نہ کریں" حضرت اسماءؓ کے قول: "بیٹا! کیا چاند غروب ہو گیا" کے تحت لامع میں ہے: "حضرت اسماءؓ چاند کے غروب ہونے کا اس لئے پوچھتی تھیں کہ ان راتوں میں چاند کا غروب سحری کے قریب ہوتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ طلوع فجر کا قصد رکھتی تھیں۔ اور اس کے قبل کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی ہمارا مذہب ہے۔" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم النحر کی رمی کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے، اوجز میں یہاں بھی خوب بسط سے مذاہب کو بیان کیا گیا ہے۔ موفق کہتے ہیں: "اس جمرہ کی رمی کے دو وقت ہیں۔ وقتِ فضیلت اور وقتِ جواز۔ وقت فضیلت تو طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن چاشت کے وقت رمی کی تھی۔ اور بنو عبدالمطلب کے نو عمر لڑکوں کو فرمایا تھا کہ "رمی نہ کرنا یہاں تک کہ سورج نکل آئے"۔ اس کو ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن وقت جواز کی ابتداء امام احمدؒ کے نزدیک نصفِ شب سے ہو جاتی ہے اور یہی قول امام شافعیؒ کا ہے۔ اور امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے جائز ہے، یہ امام مالکؒ اور اصحاب رائے کا مذہب ہے۔ امام ثوریؒ اور امام نخعیؒ فرماتے ہیں کہ سورج نکلنے کے بعد ہی رمی کرے۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھ لی جائے۔ اور شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "اس مسئلہ میں تین مذہب ہیں۔ اول: نصف شب کے بعد مطلقاً جائز ہے خواہ قادر ہو یا نہ ہو۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا مذہب ہے۔ دوم: صرف طلوع فجر کے بعد جائز ہے، یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔ سوم: اہل قدرت کے لئے طلوع آفتاب کے بعد ہی جائز ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔"

(ق) اور حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث منکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ کو بھیج دیا تھا۔ پس انہوں نے صبح صادق سے پہلے ہی رمی کر لی۔" (ش) شیخ ابن قیمؒ نے خوب بسط سے اس کا منکر ہونا ثابت کیا ہے۔ اسی طرح امام طحاوی، امام بیہقی اور صاحب الجوہر النقی نے بھی اس کو منکر کہا ہے، یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے۔ اور اس پر سکوت کیا ہے۔ صاحب البدایہ والنہایہ لکھتے ہیں کہ "اس حدیث کی روایت میں ابوداؤد متفرد ہیں۔ اور اس کی سند جیّد اور قوی ہے اور اس کے راوی

رقال) فلما طلع الفجر صلے الصبح

ترجمہ: رق) پس جونہی صبح صادق ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا کی

سب ثقہ ہیں "

کیا مزدلفہ کی رات حضرت ام سلمہؓ کی باری تھی؟

اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی باری دسویں رات (لیلۃ النحر) تھی۔ مگر اس پر عبداللہ بن زمعہؓ کی حدیث سے اشکال ہوتا ہے جس کو امام ابوداؤد نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ "میری رات، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے یہاں قیام کرنا تھا، یوم النحر کی شام کو تھی۔ چنانچہ آپ میرے یہاں تشریف لائے" الخ میرے نزدیک ان میں تطبیق یہ ہوسکتی ہے کہ ایام حج کی راتیں گذشتہ دن کے تابع ہوتی ہے، جیسا کہ معروف ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں یہ آتا ہے کہ یوم النحر حضرت ام سلمہؓ کا تھا۔ رات کا ذکر نہیں۔ اور عبداللہ بن زمعہؓ کی حدیث میں تصریح ہے کہ گیارہویں رات حضرت ام سلمہؓ کی تھی، اس لئے ان دونوں کے درمیان منافات نہیں۔

رق) پس جونہی کہ صبح صادق ہوئی تو آپ نے اوّل وقت میں نماز فجر ادا کی۔ اور ان لوگوں کو وہم ہوا جو اس کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو نماز صبح قبل از وقت پڑھی تھی۔ اس وہم کا منشا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو فجر کی نماز اس کے وقت سے پہلے پڑھی۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مراد یہ ہے کہ جس وقت عام طور پر پڑھنے کی عادت تھی۔ اس سے پہلے پڑھی۔ یہ تاویل ناگزیر ہے۔ اور خود عبداللہ بن مسعودؓ کی اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ان سے مروی ہے کہ یہ دو نمازیں اپنے وقت سے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک نماز مغرب کہ وہ لوگوں کے مزدلفہ آنے کے بعد پڑھی جاتی ہے اور دوسری نماز فجر جو سفیدۂ صبح کے وقت پڑھی جاتی ہے۔" اور حدیث جابرؓ میں ہے، جس میں قصہ حجۃ الوداع کا بیان ہے، کہ جب صبح صادق نمودار ہوئی تو آپ نے ـــــ اذان واقامت[1] ـــــ کے ساتھ نماز فجر پڑھی"۔ کذا فی البدایہ۔

اور آپ نے فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے، اور یہ ہر مشرک سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] وفی الاصل "باذانات واقامتین"۔ والتصحیح من صحیح مسلم ص ۳۹۸ (مترجم)

(قلت، واعاد الدعآء لامته

(ش) اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔

کی برأت کے اعلان کا دن ہے۔ پھر آپ سوار ہو کر مشعر حرام کے پاس موقف میں پہنچے، اور خوب روشنی ہونے تک دعا و تضرع، تکبیر، وتہلیل اور ذکر میں مشغول رہے۔ انتہیٰ۔

باہمی حقوق کے بارے میں آپکی دعا قبول ہوئی

(ش) اور اپنی امت کے لئے دوبارہ دعا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی دعا باہمی حقوق کے بارے میں بھی قبول ہوئی، اور زرقانی میں عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو اپنی امت کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا گیا ہے کہ میں نے مظالم (باہمی حق تلفیوں) کے ماسوا ان کی بخشش فرمادی، البتہ ظالم سے مظلوم کا بدلہ ضرور لوں گا۔" آپ نے عرض کیا کہ "اے میرے رب! آپ چاہیں تو مظلوم کو جنت سے بدلہ دے کر ظالم کو معاف کر سکتے ہیں۔" مگر عرفہ کی شام کو آپ کی یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ مزدلفہ کی صبح کو دوبارہ دعا فرمائی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کیا: ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، یہ وقت ایسا ہے کہ آپ اس میں نہیں ہنسا کرتے، ہنسنے کا سبب کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو ہنستا رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کے دشمن ابلیس کو معلوم ہوا کہ میری دعا قبول ہوئی اور میری امت کی بخشش ہوگئی تو وہ سر پہ مٹی ڈالنے اور واویلا کرنے لگا۔ اس کی جزع فزع سے مجھے ہنسی آگئی۔" اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے۔ اور ابن جریر نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام کو ہمیں خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا ہے۔ پس تمہارے نیکوکاروں سے (طاعات وعبادات کو) قبول فرمایا۔ اور تمہارے نیکوکاروں کو وہ سب کچھ عطا کر دیا جس کا انہوں نے سوال کیا۔ اور تمہارے گنہ گار تمہارے نیکوکاروں کو ہبہ کر دیئے (یعنی نیکوکاروں کی بدولت تمہارے گنہ گاروں کی بخشش فرمادی)، البتہ تمہاری باہمی حق تلفیاں معاف نہیں ہوئیں۔ چلو اللہ کے نام پہ (عرفہ سے مزدلفہ چلو) پس جب مزدلفہ کی صبح ہوئی۔ تو ارشاد فرمایا: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے

تمہارے اس مقام میں تم پر بہت ہی احسان فرمایا، چنانچہ تمہارے نیکوکاروں سے ان کی طاعات وعبادات کو قبول فرمالیا۔ اور تمہارے گنہگار تمہارے نیکوکاروں کو عطا کر دیئے (یعنی نیک لوگوں کی بدولت گنہگاروں کو بخش دیا) اور تمہاری باہمی حق تلفیوں کا معاوضہ اپنے پاس سے ادا کر دیا، چلو اللہ تعالیٰ کے نام پر منیٰ کی طرف۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کل تو آپ ہمیں بہت ہی حزن وملال کی حالت میں لائے تھے۔ اور آج نہایت فرحت ومسرت کی حالت میں لے جا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کل میں نے اپنے رب سے ایک درخواست کی تھی جو منظور نہیں ہوئی۔ میں نے درخواست کی تھی کہ باہمی حق تلفیوں کو بھی معاف کر دیا جائے۔ مگر نامنظور ہوئی۔ اور آج جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ آپ کا پروردگار آپ کو سلام کہتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے حقوق اپنے ذمہ لے لئے ہیں ان کو اپنے پاس سے ادا کروں گا۔"

عباس بن مرداسؓ کی حدیث طبرانی نے معجم میں، عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند احمد میں اور ابویعلیٰ وابن عدی نے روایت کی ہے، جیسا کہ تخریج زیلعی میں ہے، نیز بیہقی نے سنن میں، ابن البرؒ نے تمہید میں اور ابواللیث سمرقندی نے تنبیہ الغافلین میں بھی اس کو روایت کیا ہے، ابن جوزی نے اس کو بروایت عباس بن مرداس، بروایت ابن عمر اور بروایت عبادہ بن صامت۔ جسے عبدالرزاق اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔ موضوعات میں ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے "القول المسدد" میں اور سیوطیؒ نے "اللآلی المصنوعۃ" میں ابن جوزی پر تعقب کیا ہے۔ سیوطی کہتے ہیں کہ "یہ حدیث ترمذی کی رائے کے مطابق حسن کی حد میں داخل ہے، بالخصوص جب کہ اس کے مجموعی طرق پر نظر کی جائے۔ اور ابوداؤد نے اس کا ایک حصہ روایت کر کے اس پر سکوت کیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ان کے نزدیک صالح ہے۔ اور حافظ ضیاء مقدسی نے "المختارۃ" میں بھی اس کی تخریج کی ہے، امام بیہقی شعب الایمان" میں اس کو روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اس حدیث کے لئے بہت سے شواہد موجود ہیں جن کو ہم کتاب البعث میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ اگر اپنے شواہد کی وجہ سے صحیح ہو تو یہ حجت ہے۔ اور اگر صحیح بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔ "ویغفر ما دون ذالك لمن یشاء" یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے ماسوا کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور شرک کے ماسوا میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا بھی داخل ہے۔" اور یہ حدیث

بروایت انسؓ بھی مروی ہے جس کو ابویعلیٰ اور ابن منیع نے روایت کیا ہے۔ الخ" اور حاشیۂ کوکب میں ابن جوزی کے رد میں اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے۔

حج سے گناہوں کی مغفرت

میں کہتا ہوں کہ حج سے تمام خطاؤں کے معاف ہونے کا مسئلہ مشہور ہے۔ جس پر شروحِ حدیث اور کتبِ مناسک میں خوب بسط سے لکھا گیا ہے۔ اوجز میں اس پر کسی قدر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ اور حاشیۂ لامع میں اس کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔ شیخ قدس سرہٗ لامع میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "رجع کما ولدته امہ" کے ذیل فرماتے ہیں: "بظاہر صغائر مراد ہیں اور ممکن ہے کہ صغائر و کبائر دونوں مراد ہوں کیونکہ مواقفِ حج میں بہت سی دعائیں ہیں، جو حضور و استغفار کو متضمن ہیں۔ مگر حقوق العباد جب تک اصحاب حقوق کی طرف سے معاف نہیں ہوجاتے ان کے ساقط اور ختم ہوجانے کا قائل ہونے کی جرأت مشکل ہے۔ ہاں توبۂ صادقہ سے وہ گناہ معاف ہوجائیگا۔ جو تفویتِ حقوق کی وجہ سے لازم آیا۔" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس مسئلہ پر شیخ نے بحرجامع ترمذی کے افادات میں جو "الکوکب الدری" کے نام سے مطبوع ہیں، مختصر سا کلام کیا ہے۔ اور اس کے حاشیہ میں قدرے تفصیل ہے۔ اور اوجز میں ان روایات کو ذکر کرنے کے بعد، جن میں حج سے گناہوں کی تکفیر کا مضمون وارد ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ بہت سے محققین، مثلاً قاضی عیاض اور ابن عبدالبر وغیرہما نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ کہ کبائر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اس لئے بعض حضرات تو ان روایات کو صغائر کے ساتھ مؤوّل قرار دیتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ بعض اعمال کبائر کو بھی مٹا دیتے ہیں۔ بالخصوص حج کہ اسکے بارے میں تو بڑی کثرت سے روایات وارد ہوئی ہیں۔ اور "درِّ مختار" میں ہے: "کیا حج کبائر کو مٹا دیتا ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ ہاں، جیسے کوئی حربی مسلمان ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صرف ان کبائر کو جو حقوق (کے حقوق) سے متعلق نہ ہو، جیسے ذمی اسلام لے آئے۔"

شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں: "جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ حج سے حقوقِ واجبہ ساقط ہوجاتے ہیں اس سے توبہ کرائی جائے، توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے، کیونکہ حج سے حقوق العباد بالاجماع ساقط نہیں ہوتے۔" شیخ قدس سرہٗ الکوکب میں فریقین کے دلائل پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں: "شاید وہ حق بات جس سے عدول مناسب نہیں یہ ہے کہ تمام طاعات و عبادات میں عبادت کنندگان کے مختلف

حالات کی بنا پر بے شمار تفاوت ہوتا ہے۔ بہت سے سونے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں اعلیٰ وارفع مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور بہت سے زاہدانِ شب زندہ دار کو بجز کلفتِ بیداری کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور جب یہ ہے تو معلوم ہوا کہ تمام عبادات کا حکم یکساں نہیں۔ بلکہ بعض تو آدمی کو ایسا کر دیتی ہیں گویا آج کے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ جب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہو اور گذشتہ زمانے میں جن حماقتوں کا ارتکاب کر چکا ہے ان پر حسرت و افسوس ہو اور بعض ایسی ہیں کہ کبائر تو کجا صغائر کو مٹانے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتیں، بلکہ عجب نہیں کہ الٹا وبال بن جائیں، اور آدمی کے لئے عتاب و نکال کی موجب ہوں۔ چنانچہ یوں آتا ہے کہ آدمی نے جب نماز کے آداب کی ٹھیک رعایت نہ کی ہو۔ خواہ ارکان و شرائط بجا لایا ہو، تو نماز اس کو بددعا دیتی ہے کہ اللہ تجھے غارت کرے جیسے تو نے مجھے ضائع کیا۔ اس مضمون کی اور بہت سی روایات ہیں" اھ

ارشادِ نبوی: جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا الخ

(ق) اسی مقام میں عروہ بن مُضرّس طائی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا! یا رسول اللہ! میں قبیلہ بنی طے کے پہاڑوں سے آیا ہوں، میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا، اور اپنی جان کو مشقت میں ڈالا، کوئی پہاڑ نہیں جس پر میں نہ ٹھہرا ہوں۔ تو کیا میرا حج ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا پھر ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم یہاں سے جائیں۔ جب کہ اس سے قبل رات یا دن کے کسی حصہ میں عرفات کا وقوف کر چکا تھا، تو اس کا حج تام ہے" ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اس حدیث کے پیشِ نظر بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وقوف عرفہ کی طرح مزدلفہ میں شب باشی اور وہاں کا وقوف رکن ہے، یہ صحابہؓ و تابعین وغیرہم کی ایک جماعت اور داؤد ظاہری کا مذہب، اور شافعیہ کی ایک روایت ہے، شیخ ابن قیمؒ نے فریقین کے دلائل تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ مندرجہ بالا حدیث ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ابن حبان، دارقطنی، اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں وقوفِ عرفہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ واجباتِ حج میں سے ہے۔ اور شوکانیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے امام احمد بن حنبل نے استدلال کیا ہے کہ وقوف عرفہ کا وقت مابعدِ زوال کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ یوم عرفہ کی صبح صادق سے یوم نحر کی صبح صادق تک اس کا وقت ہے۔ کیونکہ دن اور رات کا لفظ مطلق ہے اور جمہور اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دن سے مراد

(قال) ثم سار من مزدلفة مردفا للفضل۔

ترجمہ: پھر آپؐ مزدلفہ سے روانہ ہوئے اور فضل کو اپنے پیچھے سوار کیا۔

مابعدِ زوال ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے زوال کے بعد ہی وقوف کیا۔ اور المحلّٰی میں ہے کہ اس حدیث سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ وقوفِ عرفہ یوم عرفہ کے غروبِ آفتاب سے فوت ہو جاتا ہے اور ان لوگوں کی بھی جو کہتے ہیں کہ اس کا وقت طلوعِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے" انتہٰی مافی البذل مختصراً۔

طلوعِ آفتاب سے قبل مزدلفہ سے چلنا

(ق) پھر آپؐ طلوعِ آفتاب سے قبل مزدلفہ سے روانہ ہوئے۔ موفق کہتے ہیں: ہمیں اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں کہ سنت طلوعِ آفتاب سے پہلے چلنا ہے، اور خوب روشنی ہو جانے تک وقوف سنت ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ کی رائے یہ تھی کہ اسفار سے پہلے چلنا چاہیئے۔ کذا فی الاوجز۔

(ش) امام ابوداؤدؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اہلِ جاہلیت اس وقت تک نہیں چلتے تھے جب تک کہ کوہ ثبیر پر دھوپ نہ دیکھ لیتے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت فرمائی اور طلوعِ آفتاب سے پہلے چلے" اور بخاری کے الفاظ عمرو بن میمون کی روایت سے یہ ہیں کہ "میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپ نے مزدلفہ میں صبح کی نماز پڑھی پھر وقوف کیا۔ پھر فرمایا کہ مشرکین مزدلفہ سے نہیں چلتے تھے یہاں تک کہ سورج نکل آئے اور وہ کہا کرتے تھے: "اشرق ثبیر" یعنی اے کوہِ ثبیر تو دھوپ سے روشن ہو جا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور طلوعِ آفتاب سے پہلے روانہ ہوئے"

ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے

یہاں یہ یاد رہے کہ ثبیر مکہ کے پانچ پہاڑوں کا نام ہے جیسا کہ شیخ قدس سرہ نے بذل میں افادہ فرمایا ہے اور اسی طرح مجمع میں بھی مذکور ہے، شارحِ قاموس نے اس میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ کہ ثبیر نامی پہاڑ منیٰ میں ہے یا کسی اور جگہ، تفصیل میرے حاشیہ شرح لباب میں ہے"

ابن عباسؓ کا راستے سے کنکریاں اٹھانا

اور فضل بن عباسؓ کو اپنے پیچھے سوار کیا اور حضرت اسامہؓ پیدل چل پڑے۔ اور اسی راستے میں ابن عباسؓ کو کنکریاں اٹھانے کا حکم فرمایا۔ اور اس رات کو پہاڑ سے کنکریاں نہیں توڑیں، جیسا کہ بعض بے علم کرتے ہیں کذا فی الھدیٰ"

(قال) وفی طریقہ تلك

ترجمہ (ق) اور اسی راستے میں،

زرقانی کہتے ہیں کہ سنن بیہقی اور نسائی میں بسند صحیح علی شرط مسلم مروی ہے نیز حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل بن عباسؓ سے یوم النحر کی صبح کو فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں جمع کرو۔ جیسے پھینکنے کی کنکریاں ہوتی ہیں" کنکریوں کے مسائل پر اوجز میں بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے۔ کہ ان کو رات ہی کو جمع کرلے یا راستے سے لے؟ اور یہ کہ صرف جمرۂ عقبہ کے لئے سات کنکریاں لے؟ یا تمام دنوں کے لئے ستر کنکریاں لے؟ اور یہ کہ جمرات کے پاس سے کنکریاں اٹھالینا جائز ہے یا نہیں؟ اس قسم کی اور بھی لطیف بحثیں کی ہیں۔ اور اسی میں یہ ہے کہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ "ابن حزمؒ کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی جو عبداللہ بن عباسؓ نے موضع رمی سے اٹھائی تھیں" الخ اور ابن عربی نے المحاضرہ میں ابن حزم کے قول کی موافقت کی ہے۔ اور حافظؒ نے تلخیص میں فضل بن عباسؓ کے نام کو ترجیح دی ہے، اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعفاء اہل بیت کے ساتھ رات ہی کو منیٰ بھیج دیا تھا۔

قبیلۂ خثعم کی ایک خاتون کا سوال

(ق) اور اسی راستے میں (ش) ابن عربی نے المحاضرہ میں بھی یہی ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ (جو آگے آتا ہے) راستہ میں پیش آیا، اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ آیا یہ واقعہ راستہ میں پیش آیا؟ جیسا کہ بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "فضلؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے۔ پس قبیلۂ خثعم کی ایک عورت آئی، فضلؓ اس کی طرف دیکھنے لگے" اور مؤطا کی روایت کے الفاظ بھی اسی طرح کے ہیں۔ یا رمی کے بعد منحر میں یہ واقعہ پیش آیا؟ جیسا کہ متعدد روایات میں ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ حافظؒ فرماتے ہیں: "احتمال ہے کہ قبیلۂ خثعم کی خاتون کا سوال رمی جمرۂ عقبہ کے بعد ہوا ہو، اور ابن عباسؓ بھی اس موقعہ پر حاضر ہوئے ہوں! اس لئے کبھی وہ اپنے بھائی (فضل) سے روایت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی صاحب واقعہ ہیں: اور کبھی خود اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہیں۔ اس کی تائید ترمذیؒ و احمدؒ وغیرہما کی روایت سے ہوتی ہے۔ امام احمدؒ کے الفاظ بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ

عرضت له امرأة جمیلة سألت عن الحج عن ابیها فامرها ان تحج عنه۔
ایک حسین وجمیل عورت آپؐ کے پاس آئی، اور دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے باپ
کی جانب سے حج کرسکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے۔

یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منحر میں پہنچے اور فرمایا: یہ منحر ہے، اور منیٰ کی ہر جگہ منحر ہے۔ اور آپؐ سے ایک عورت نے استفتاد کیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ کے پاس قبیلہ خثعم کی ایک جوان لڑکی آئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل کی گردن موڑ دی، حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ نے اپنے چچازاد بھائی کی گردن موڑ دی، آپؐ نے فرمایا: "میں نے دیکھا جوان لڑکا لڑکی ہیں مجھے ان کے حق میں شیطان کا خطرہ محسوس ہوا" الخ اور اسی میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ حدیث مسند ابن عباس ہے یا مسند فضل؟ ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں ابن عباسؓ کی روایت بواسطہ فضل زیادہ صحیح ہے۔" الخ۔

قبیلہ خثعم کی ایک حسین وجمیل خاتون آپؐ کے پاس آئی، حافظ کہتے ہیں اس کے نام کا ذکر نہیں آتا۔ اور دریافت کیا۔ کہ کیا وہ اپنے باپ کی جانب سے، جو سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا حج کرسکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اس کی جانب سے حج کرے، یہاں چند بحثیں ہیں۔ جو اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ اول: یہ کہ سائل مرد تھا یا عورت تھی؟ اور اس نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا یا اپنی ماں کے بارے میں؟ حافظؒ اس سلسلہ میں روایات کے اختلاف کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان مجموعی طرق سے جو بات میرے سامنے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سائل مرد تھا۔ اس کے ساتھ لڑکی بھی تھی، اس نے بھی سوال کیا، اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا۔ الخ"

جو شخص خود قادر نہ ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

بحث دوم: جو شخص بذات خود قادر نہ ہو مگر کسی دوسرے سے حج کراسکتا ہے اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر اوجز میں خوب بسط سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قادر بالغیر پر امام شافعیؒ، احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک حج فرض ہے۔ اور امام مالکؒ اور ابوحنیفہؒ کے نزدیک فرض نہیں۔ ان کی طرف سے اس حدیث کا جواب جیسا کہ حاشیۂ لامع میں ہے یہ دیا گیا ہے کہ حدیث خثعمیہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے؛ اس کو دوسروں کی طرف متعدی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: من استطاع الیہ

سبیلا ..یعنی حج اسی پر فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھے۔ اور اوجز میں ہے کہ "ابن عبدالبرؒ کا رجحان یہ ہے کہ یہ قصہ خثعمیہ سے مخصوص ہے۔ اور قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ میں حجت نہیں کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس خاتون نے بتایا کہ فریضۂ حج ایسی حالت میں نازل ہوا کہ اس کا باپ طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صرف یہ دریافت کیا کہ اس کے لئے اپنے باپ کی جانب سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں"۔ اھ

اور شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "اس کا قول" اللہ تعالیٰ کے فریضۂ حج نے اسے پایا" یہاں دو احتمال ہیں، اول یہ کہ جب حج کا حکم نازل ہوا اس وقت یہ بڑے میاں حج کی قدرت و استطاعت رکھتے تھے مگر پہلے سال حج نہ کیا، یا تو کچھ عوارض و موانع پیش آگئے ہوں گے، یا یہ توقع ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حج سے مشرف ہو سکیں گے، اور بعد میں کمزور ہو گئے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ "حج کے حکم نے ان کو بڑھاپے کی حالت میں پایا"۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حج کے بارے میں حکم خداوندی نازل ہی اس وقت ہوا جب کہ وہ شیخ کبیر تھے"۔ انتہیٰ۔

بحث سوم: کسی شخص کی طرف سے حج بدل جائز ہے یا نہیں؟

اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں کہ جو شخص بذات خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی جانب سے حج واجب میں نیابت بالاتفاق جائز نہیں، ابن منذر کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جس پر حج اسلام فرض ہو اور وہ خود حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس کی جانب سے کسی دوسرے کا حج بدل کرنا صحیح نہیں۔ اور جو حکم حج فرض کا ہے وہی نذر کے حج کا ہے، کہ اگر خود عاجز ہے تو کسی کو نائب بنا سکتا ہے۔ اور اگر خود قادر ہو تو نیابت صحیح نہیں۔ کہ وہ بھی حج واجب ہے۔ اور نفلی حج کی تین قسمیں ہیں: "ایک یہ کہ کسی نے حج فرض ادا نہیں کیا ایسا شخص کسی کو نفلی حج کے لئے اپنا نائب بنا کر نہیں بھیج سکتا، دوم یہ کہ حج فرض ادا کر چکا ہو اور حج نفل ادا کرنے سے عاجز ہے اس کی طرف سے نائب بنانا صحیح ہے سوم یہ کہ اس میں دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ صحیح ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے دوسری یہ کہ صحیح نہیں اور یہ امام شافعیؒ کا قول ہے۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

بحث چہارم: مرد کا عورت کی جانب سے اور عورت کا مرد کی جانب سے حج بدل صحیح ہے یا نہیں؟

اوجز میں المغنی سے نقل کیا ہے کہ مرد کا عورت کی جانب سے اور عورت کا مرد کی جانب سے حج بدل عام اہل علم کے نزدیک صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں، بجز حسن بن صالح کے کہ ان کے نزدیک مرد کی جانب سے عورت کا حج بدل

کرنا مکروہ ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ حسن بن صالح کا یہ قول ظاہر سنّت سے غفلت ہے۔ کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کو اس کے باپ کی جانب سے حج کرنے کا حکم فرمایا" الخ یہ چار بحثیں حدیث الباب کے مناسب ہیں، ورنہ حج بدل کے مسئلہ میں بہت سی بحثیں ہیں۔ جن میں سے دس بحثیں اوجز میں مذکور ہیں، چنانچہ "باب الحج عن الغیر" کی ابتدا میں اوجز کے الفاظ یہ ہیں۔

حج بدل کے متعلق دس بحثیں

"اس باب کے فروع بہت ہی زیادہ ہیں۔ ہم یہاں دس بحثوں میں ان مسائل کو ذکر کرتے ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اوّل: حج فرض یا نفل میں نائب بنانا صحیح ہے یا نہیں؟ دوّم:۔ جو شخص خود تو ادا نہ ہو البتہ دوسرے کی مدد سے حج پر قادر ہو اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟ سوّم: اپاہج کی طرف سے حج بدل کا حکم۔ چہارم:۔ جس شخص کے مرض کے زائل ہونے کی توقع ہو اس کی طرف سے اور محبوس کی طرف سے حج بدل کا حکم، پنجم:۔ حج بدل کے بعد مریض کو صحت ہو جائے۔ ششم:۔ آمر کا اذن شرط ہے یا نہیں؟ ہفتم:۔ ثلث مال سے حج بدل کا حکم۔ ہشتم:۔ دوسرے کی جانب سے حج ضرورت کا حکم۔ نہم:۔ مرد کا عورت کی طرف سے اور عورت کا مرد کی طرف سے حج بدل۔ دہم:۔ حج آمر کی طرف سے ادا ہوتا ہے یا مامور کی طرف سے"؟

دق، فضلؓ اس عورت کی طرف اور وہ فضل کی طرف دیکھنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضلؓ کا منہ پھیر دیا تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں: دش) اور کنز العمال میں یہ اضافہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج کا دن وہ ہے کہ جس شخص نے اپنی نظر کو قابو میں رکھا اس کے تمام گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فضلؓ کا منہ عورت کی طرف سے ہٹایا، اس کے برعکس عورت کو منہ پھیرنے کا حکم نہیں کیا۔ اوجز میں اس کے وجوہ تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔ من جملہ ان کے باجی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف فضل کا منہ دوسری طرف پھیر دینے کو کافی سمجھا، کیونکہ یہ چیز عورت کے لئے فضل کا چہرہ دیکھنے سے مانع تھی، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا۔ علاوہ ازیں دوسرے وجوہ اوجز میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اجنبی مرد و عورت کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا حکم اوجز میں دو مقام پر مفصل مذکور ہے۔ حدیث خثعمیہ کے ذیل میں۔ اور "عدۃ المرأۃ فی بیتہا" کے ذیل میں۔

وسأله آخر عن امه۔

ترجمہ: اور اسی موقعہ پر ایک اور شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں یہی سوال کیا۔

ایک شخص کا اپنی والدہ کے بارے میں سوال

اور اسی موقعہ پر ایک اور شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں یہی سوال کیا، آپؐ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: "یہ بتا کہ اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو تو اس کی جانب سے ادا کرتا یا نہیں؟ عرض کیا کہ ضرور کرتا۔ فرمایا: پھر اپنی ماں کی طرف سے حج بھی کر" کذا فی الہدیٰ۔ یہ حدیث امام نسائیؒ نے حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے پس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میری ماں الخ امام نسائی نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے "باب حج الرجل عن المرأۃ"۔ امام نسائی کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے الگ الگ ہیں۔ چنانچہ شیخ ابن قیمؒ کا بھی یہی رجحان ہے۔ اور ابن عربی نے المحاضرہ میں اسی کو جزماً ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ قبیلہ خثعم کی خاتون کا واقعہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اسی نوعیت کا سوال ایک مرد نے بھی کیا" اھ اور پیچھے قریب ہی اوجز سے گذر چکا ہے کہ حافظؒ کا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک ہی قصہ ہے۔ وہ روایات کا اختلاف نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان تمام طرق کو ملانے سے جو بات میرے لئے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوال کرنے والا مرد تھا اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے بھی سوال کیا، اور سوال مرد کے ماں باپ دونوں کے بارے میں تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے نکلتی ہے جو ابویعلیٰ نے بسند قوی فضل بن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کے پیچھے سوار تھا، ایک اعرابی آیا، اس کے ساتھ حسین و جمیل لڑکی بھی تھی۔ وہ اعرابی اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نیت سے پیش کر رہا تھا کہ آپؐ اس سے نکاح کرلیں گے۔ اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا سر پکڑ کر دوسری طرف پھیر دیا"۔ اس صورت میں اس جوان عورت کا یہ کہنا کہ میرے باپ کے ذمہ الخ غالباً اس سے مراد دادا ہوگا کیونکہ اس کا باپ تو اس کے ساتھ ہی تھا۔ غالباً اس شخص نے لڑکی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کو کہا ہوگا۔ تاکہ آپؐ اس کی بات سنیں اور اسے دیکھ لیں، امید یہ ہوگی کہ آپؐ اس سے نکاح کرلیں گے۔ جب آپؐ نے اس کو

فلما اتی بطن محسّر حرّک ناقتہٗ واسرع السیر۔

ترجمہ:۔ پس جب بطن مُحسّر پہنچے تو اونٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کر دی۔

پسند نہ فرمایا تو اس نے اپنے باپ کے بارے میں خود بھی دریافت کیا ہوگا۔ اور کوئی مانع نہیں کہ اس شخص نے اپنی والدہ کے بارے میں بھی سوال کیا ہو" اھ۔

اور میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان بہتر تطبیق یہ ہے کہ مذکورہ لڑکی اپنے باپ کیساتھ نہیں بلکہ اپنے چچا کے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ابویعلیٰ کی مندرجہ بالا ایک روایت میں "اس کی لڑکی" کے لفظ کو مجاز پر محمول کرنا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ بہت سی مختلف روایتوں میں جو لڑکی کے سوال میں "میرے باپ" کا لفظ مذکور ہے اسے ہر جگہ مجاز پر محمول کیا جائے۔ حاصل یہ ہوا کہ لڑکی نے اپنے باپ کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور اس کے چچا نے اپنی والدہ کے بارے میں ۔ مزید یہ کہ حافظ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق جب وہ شخص اپنے باپ کے بارے میں دریافت کر چکا تھا تو دوبارہ اسی کے بارے میں لڑکی کے سوال کی ضرورت نہیں رہ جاتی" انتہٰی من الاوجز مختصراً۔

بطن مُحسّر میں سواری کو تیز کرنا

پس جب بطن مُحسّر پہنچے تو اونٹنی کو تحریک کی اور رفتار تیز کر دی۔

مسلم اور ابوداؤد کے الفاظ حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں یہ ہیں "یہاں تک کہ بطن مُحسّر پہنچے تو تھوڑی سی تحریک کی" اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے "اور وادیٔ مُحسّر میں (اونٹنی کو) دوڑایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ میری امت کو مجھ سے مسائل حج سیکھ لینے چاہئیں شاید کہ اس سال کے بعد ان سے نہ مل سکوں" (ق) جن مقامات میں اللہ کے دشمنوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا وہاں آپؐ کی یہی عادت مبارکہ تھی کہ تیزی کے ساتھ وہاں سے گذر جاتے تھے، وادیٔ مُحسّر میں اصحاب فیل پر وہ عذاب نازل ہوا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فیل میں کیا ہے، اور اسی مناسبت سے اسے مُحسّر کہتے ہیں کہ یہاں ہاتھی آگے چلنے سے عاجز ہو کر رک گئے تھے۔ اور مقام حجر اور دیار ثمود میں گذرتے ہوئے بھی آپ نے یہی کیا تھا کہ کپڑے سے چہرہ انور ڈھانک لیا اور رفتار تیز کر دی۔

مُحسّر کی وجہ تسمیہ

اور مُحسّر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان برزخ ہے، نہ اِس میں شامل ہے نہ اُس میں" کذا فی البدائع۔ اور شرح لُباب میں ہے کہ مُحسّر میں تیز چلنا ائمہ

اربعہ کے نزدیک مستحب ہے، خواہ سواری پر ہو یا پیدل۔ اور اس کا نام مُحَسِّر اس لئے ہے کہ ہاتھی یہاں رک گئے تھے۔ یا اس لئے کہ یہاں شیطان نے بصد حسرت وقوف کیا تھا" اھ اور زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں کہ "مُحَسِّر: بضم میم وفتح حائے مہملہ وکسر سین مشددہ مہملہ۔ منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک جگہ ہے اور اسنوسی کہتے ہیں کہ یہاں سے تیز گذرنے کی وجہ یہ ہے کہ بقولِ رافعیؒ نصاریٰ یہاں وقوف کیا کرتے تھے۔ اور بقولِ وسیط عرب یہاں ٹھہرتے تھے: ہمیں ان کی مخالفت کا حکم کیا گیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس کی حکمت کے بارے میں مجھے ایک اور بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ کہ یہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا۔ یہ ایک قول ہے مگر صحیح قول اس کے خلاف ہے کیونکہ اصحاب فیل حرم مکہ میں داخل نہیں ہو سکے بلکہ حرم کے قریب ہلاک ہوئے۔ دراصل یہاں ایک آدمی نے شکار کیا تھا۔ آسمان سے آگ نازل ہوئی اور اس شکاری کو خاکستر کر ڈالا۔ اسی لئے اہلِ مکہ اس مقام کا نام "وادیٔ نار" رکھتے ہیں" اھ اور نوویؒ نے صرف قصۂ اصحاب فیل ہی کو وجہ تسمیہ میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "یہ نام یوں پڑا کہ اصحاب فیل یہاں تھک کر عاجز رہ گئے تھے" اھ اور ابن حجرؒ نے شرح مناسک نووی میں اس مقام میں تیز رفتاری کے وجوہ بسط سے بیان کئے ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ "اصحاب فیل پر عذاب کا نزول تو اُس جگہ ہوا تھا جو عرفہ کے محاذی ہے۔ اور جسے مُغَمَّس [دوسری میم کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی مکسور بھی پڑھی جاتی ہے] کہا جاتا ہے۔ بلکہ معروف یہ ہے کہ اصحاب فیل حرم میں داخل ہی نہیں ہونے پائے تھے، جیسا کہ ابن اثیر نے جزم کے ساتھ ذکر کیا ہے" الخ۔

ان معروف روایات کے، جن میں وادیٔ مُحَسِّر میں تیز چلنا مذکور ہے، وہ روایت منافی نہیں جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سکون کے ساتھ عرفہ سے چلے" الحدیث۔ اسی میں عرفہ سے چلنے کے بعد کا قصہ یوں نقل کیا ہے کہ "پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے فضل بن عباسؓ کو سوار کیا اور ارشاد فرمایا: اے لوگو! گھوڑے اور اونٹوں کو دوڑانا کوئی نیکی نہیں، پس سکون کو لازم پکڑو ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں پس میں نے آپؐ کی اونٹنی کو قدم اٹھاتے (یعنی دوڑتے) ہوئے نہیں دیکھا" بظاہر یہ حدیث ان احادیث کے خلاف ہے جن میں وادیٔ مُحَسِّر میں تیز رفتاری کا ذکر ہے۔ نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں کہ "اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ آپؐ نے مُحَسِّر میں بھی تیز رفتاری کو

حتّٰی اتی جمرۃ العقبۃ فرماھا راکبا

ترجمہ :- یہاں تک کہ جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے۔ پس سوار ہونیکی حالت میں جمرۂ عقبہ کی رمی کی۔

ترک فرمایا تھا- لہذا یہ حدیث ان احادیث کے معارض نہیں جن میں تیز رفتاری کی تصریح ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس میں تیز رفتاری کے ترک کی تصریح بھی ہوتی تب بھی تیز رفتاری کے ثبوت کی روایات دو وجہ سے مقدم تھیں- ایک یہ کہ ان میں اثبات ہے اور وہ نفی پر مقدم ہے۔ دوسری یہ کہ وہ کثرۃِ رُواۃ، صحتِ سند اور شہرت میں اس سے بڑھ کر ہیں۔ لہذا وہ مقدم ہوں گی۔"

جمرۂ عقبہ کے پاس آنحضرتؐ کس جگہ کھڑے ہوئے

یہاں تک کہ منیٰ آکر جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے، پس وادی کے نشیب میں کھڑے ہوکر جمرہ کا استقبال کیا۔ بایں طور کہ بیت اللہ بائیں جانب اور منیٰ دائیں جانب تھا۔ کذا فی الہدیٰ۔ اور اس ہیئت سے کھڑا[1] ہونا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مستحب ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل ان کی کتب فقہ سے اوجز میں ذکر کی گئی ہیں۔ اور حنابلہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو، اور اوجز میں حافظؒ سے نقل کیا ہے کہ "کسی جگہ سے رمی کرے جائز ہے۔ خواہ جمرہ کی طرف مُنہ ہو، یا وہ دائیں جانب ہو یا بائیں جانب، اور اوپر سے رمی کرے یا اس کے نیچے سے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل کیا ہے۔" اھ

(ق) درآنحالیکہ آپ اونٹنی پر سوار تھے، پس سوار ہونے کی حالت میں جمرہ عقبہ کی رمی کی۔ کذا فی الہدیٰ۔ اور یہ بہت سی روایات میں معروف ہے۔ اور البدایہ والنہایہ میں یہ ہے کہ "ابن ماجہ میں امّ جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں: "میں نے یوم النحر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرۂ عقبہ کے پاس دیکھا درآنحالیکہ آپؐ خچر پر سوار تھے۔ الحدیث" اور یہاں خچر کا ذکر بہت ہی غیر معروف ہے۔" اھ

رمی کا حکم

باقی رہا رمی کا حکم ؟ تو جمہور کے نزدیک یہ واجب ہے اگر اسے ترک کردیا تو دم سے اسکی تلافی ہوگی۔ اور مالکیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اس لئے اس کی تلافی کی جائیگی، اور مالکیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی رکن ہے اس کے ترک سے حج باطل ہوجائے گا۔ اور اس کے مقابل بعض کا قول یہ ہے کہ رمی صرف تکبیر کی یادداشت کے لئے ہے۔ جیسا کہ تکبیر بوقتِ رمی کی مباحث میں آگے آتا ہے۔ تفصیل اوجز میں ہے۔

---

[1] کذا فی الفتح ۱۲ شیخ

بعد طلوع الشمس ــــــــــ ترجمہ: طلوع آفتاب کے بعد۔

رمی پیدل ہو یا سواری پر؟

اوجز میں اس مسئلہ پر تفصیل سے لکھا ہے: ان دونوں صورتوں کے جواز پر آئمہ اربعہ کا اجماع نقل کرنے کے بعد افضلیت میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے موفق سے نقل کیا ہے کہ: "نافع کہتے ہیں ابن عمرؓ یوم النحر کو جمرۂ عقبہ کی رمی اپنی سواری پر کیا کرتے تھے اور باقی تمام ایام کی رمی پیدل ہی کرتے تھے۔ اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے"۔ اس روایت سے جمرۂ عقبہ کی رمی اور دیگر جمرات کی رمی کے درمیان فرق ثابت ہوتا ہے۔ "اھ نووی اپنے مناسک میں جمرۂ عقبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "اگر منیٰ میں سواری پر آیا ہو تو اس کی رمی سواری پر کرے۔ اور ایام تشریق کے پہلے دو دنوں کی رمی پیدل مستحب ہے۔ اور تیسرے دن کی سوار ہو کر"۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہی معتمد ہے۔ اور دردیر لکھتے ہیں: "اور منیٰ میں پہنچتے ہی جمرۂ عقبہ کی رمی مستحب ہے خواہ سوار ہو کر ہو۔ اور دیگر جمرات کی رمی پیدل کرنا مندوب ہے"۔ اھ۔ دسوقی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یعنی مستحب یہ ہے کہ منیٰ پہنچتے ہی جس حالت میں پہنچا ہو، خواہ سوار ہو کر یا پیدل اسی حالت میں رمی کرے"۔ انتہیٰ مختصراً۔ رہا حنفیہ کا مذہب؟ تو شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کی رمی سوار ہونے کی حالت میں کی، یہ ہمارے نزدیک اگرچہ جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری پر ہونے کا عذر وہی ہے جو آپؐ کے سواری کی حالت میں طواف کرنے کا ہے کہ لوگ رمی کا طریقہ دیکھ لیں۔ یعنی رمی کرنے والا جمرات سے کتنی دور کھڑا ہو؟ کنکریوں کی مقدار کتنی ہو؟ اور کس جانب کھڑا ہونا چاہیئے؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دن کی رمی میں ان امور کو بیان فرما دیا تو اس کے بعد سوار ہو کر رمی نہیں کی"۔ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ شیخ کا یہ ارشاد فقہ حنفی کے تین اقوال میں سے ایک کے مطابق ہے۔ جس کا مبنیٰ یہ ہے کہ پیدل رمی کرنے میں کمالِ تضرع ہے نیز اس صورت میں لوگوں کی ایذاء کا خطرہ نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سوار ہو کر رمی کرنا مطلقاً افضل ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ جس رمی کے بعد رمی ہو اس میں پیدل رمی کرنا افضل ہے۔ ورنہ سوار ہو کر۔ حضرت شیخ کے نزدیک پہلا قول مختار ہے۔ نیز آپ نے اپنے رسالہ "زبدۃ المناسک" میں بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اور پیدل رمی کرنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ ابن ہمام کا مختار ہے"۔ اھ۔

طلوع آفتاب کے بعد یوم نحر کی رمی کے وقت میں ائمہ کا اختلاف ۲ ضعفاء کو مزدلفہ سے قبل

از وقت بھیجنے کی بحث میں گذر چکا ہے۔

جمرہ کے پاس سے اٹھائی ہوئی کنکریوں سے رمی کرنا ابن عربی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کی رمی ان کنکریوں کے ساتھ کی تھی جو ابن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں" اھ ابن عربی کا یہ قول انس روایت کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکی ہے آنحضرت صلی اللہ نے ان کو راستہ سے کنکریاں اٹھانے کا حکم کیا تھا۔ جو کنکریاں موضع رمی سے اٹھائی جائیں ان سے رمی کرنے پر اوجز میں خوب بسط سے کلام کیا ہے۔ اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: رمی کی کنکریاں راستے سے اٹھائے یا مزدلفہ سے، اور یہ اس لئے مستحب ہے کہ منیٰ آنے کے بعد رمی سے پہلے کسی چیز میں مشغول نہ ہو، کیونکہ جس طرح مسجد حرام کا تحیۃ طواف ہے اسی طرح منیٰ کا تحیۃ رمی ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اِس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کنکریاں جہاں سے چاہو اٹھالو اور یہی صحیح تر ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ کیونکہ ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح کو، جب کہ آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار تھے، مجھ سے فرمایا کہ میرے لئے کنکریاں اٹھالاؤ۔ پس میں نے سات کنکریاں اٹھائیں" الحدیث۔ اور یہ منیٰ کا قصہ ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں کہ جہاں سے اٹھالے کفایت کریں گی، انتہیٰ۔

اور نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں: "ہمارا مذہب یہ ہے کہ رمی کے لئے کنکریاں اٹھانا مزدلفہ کے درمیاں[1] مستحب ہے اور حضرت عطاءؒ امام مالکؒ، اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جہاں سے چاہے اٹھالے: ابن منذر کہتے ہیں: اس امر میں علماء کے درمیان کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں کہ جہاں سے بھی اٹھالے کفایت کریں گی" انتہیٰ۔ اور اوجز میں دردیر سے نقل کیا ہے کہ رمی کے لئے جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے۔ البتہ جمرۂ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے اٹھانا مستحب ہے" اھ اور ابن عابدینؒ کہتے ہیں کہ: "مستحب یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ کے لئے مزدلفہ سے یا راستہ سے سات کنکریاں اٹھالے۔ اور ان سات کے علاوہ کے لئے ہمارے نزدیک کوئی مخصوص جگہ مقرر نہیں" انتہیٰ ملخصًا۔ اور ہدایہ میں ہے کہ: "جہاں سے چاہے کنکریاں اٹھالے۔ مگر جمرہ کے پاس سے نہ لے۔ کہ یہ مکروہ ہے۔

---

[1] کذا فی الاصل۔ شیخ

واحدۃً بعد واحدۃ یکبر مع کل حصاۃ

ترجمہ: یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔

کیونکہ جمرہ کے پاس کی کنکریاں غیر مقبول ہوتی ہیں، حدیث میں یونہی آتا ہے، اس لئے وہاں سے اٹھانے میں بدشگونی ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسا کرلے تو کفایت کرے گا۔ کہ فعل رمی بہرحال پایا گیا"۔ اھ اور موفق لکھتے ہیں: "اگر موضع رمی سے کنکریاں اٹھا کر رمی کی تو اس کو کفایت نہیں کرے گی، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو کفایت کریگی، کیونکہ یہ بھی کنکریاں ہیں۔ لہٰذا عموم میں داخل ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر موضع رمی سے کنکریاں لی تھیں۔ اور آپؐ نے فرمایا تھا: "مجھ سے اپنے مناسک حاصل کرلو"۔ اور اوجز میں اس پر مفصل کلام کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "ابن حزم کا یہ قول مردود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کنکریوں سے رمی کی تھی۔ جو عبداللہ بن عباسؓ نے مقام رمی سے اٹھائی تھیں۔ علاوہ ازیں دونوں اقوال کے درمیان یہ تطبیق ممکن ہے کہ مزدلفہ سے جو کنکریاں لی تھیں شائد ان میں سے کوئی حضرت فضلؓ سے گر گئی ہوگی۔ اس کے بدلہ میں آپؐ نے موقف سے یعنی جہاں آپؐ بطن وادی میں کھڑے تھے وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہوگا۔ یہ نہیں کہ جہاں رمی کی کنکریاں گرتی ہیں وہاں سے اٹھانے کا حکم فرمایا ہو"۔ الخ۔ اوجز میں بہت ہی بسط سے لکھا ہے۔

رمی کے متعلق سات بحثیں

یکے بعد دیگرے ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔ کذا فی الہدی۔ اور اوجز میں مسائل رمی پر خوب بسط سے کلام کیا ہے، جس میں تقریباً بیس ابحاث ذکر کی ہیں۔ سات بحثیں اس مقام سے متعلق ہیں۔ اول: تکبیر کے وقت رفع یدین کا حکم۔ دوم: تکبیر کس وقت کہی جائے۔ رمی کے ساتھ یا رمی کے بعد؟ ائمہ اربعہ کے نزدیک رمی کے ساتھ تکبیر کہنا مختار ہے۔ جیسا کہ اوجز میں ان کی کتب فقہ سے نقل کیا ہے۔ سوم اس تکبیر کا حکم؟ حافظ کہتے ہیں: "اس پر ان کا اجماع ہے کہ جو شخص تکبیر ترک کردے اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں۔ البتہ امام ثوریؒ کا قول ہے کہ تارکِ تکبیر کھانا کھلائے اور اگر دم کے ذریعہ اس کی تلافی کرلے تو میرے نزدیک اور بھی اچھی بات ہے"۔ اھ۔ چہارم۔ الفاظِ تکبیر۔ اور اوجز میں فروعِ ائمہ سے اسکے کئی الفاظ نقل کئے ہیں مثلاً بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وغیرہ، پنجم: اگر تکبیر کے بجائے تسبیح کہے تو مضائقہ نہیں۔

ساتوں کنکریاں ایک ہی بار پھینکدینے کا حکم

ششم: ایک ایک کنکری پھینکنا یہاں ہی بحث اصل مقصود ہے اور اوجز میں اس پر بھی خوب بسط سے لکھا ہے۔ موفق کہتے ہیں:"اگر بہت سی کنکریاں ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو صرف ایک سمجھی جائے گی۔ امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی امام مالکؒ امام شافعیؒ اور اصحاب رائے کا قول ہے۔ اور عطاء کہتے ہیں کہ اگر ساری ایک ہی دفعہ پھینک دیں تو کفایت کریں گی"۔ میں کہتا ہوں کہ حافظؒ نے حنفیہ کا قول جو عطاء کے موافق نقل کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ حنفیہ کی کتابوں میں معروف وہی ہے جو موفق نے نقل کیا ہے۔

رمی کے بجائے دس تکبیر کہہ لینا

ہفتم:۔ جو اوجز میں بحث دوم کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ طبری نے بعض کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی کنکری نہ پھینکے بلکہ ہر جمرہ کے پاس سات مرتبہ تکبیر کہتا ہے تب بھی کافی ہے۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ کنکریاں پھینکنا دراصل سات تکبیروں کی یادداشت کے لئے ہے، جیسا کہ تسبیحات میں انگلیاں بند کرنا محض گنتی یاد رکھنے کے لئے ہے"۔ پوری بحث اوجز میں دیکھئے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے "باب یکبر مع کل حصاۃ" میرے نزدیک اَوْجَہ یہ ہے کہ اس عنوان سے مقصود اس قول کی تردید ہے۔ چنانچہ میں نے تراجم بخاری میں اس کو بیان کیا ہے۔

(ق) اور حضرت بلالؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ایک نے آپؐ کی اونٹنی کی مہار تھام رکھی تھی۔ دوسرے صاحب آپؐ کو دھوپ سے بچانے کے لئے کپڑے سے سایہ کررہے تھے۔ اگر یہ یوم نحر کا قصہ ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ مُحرِم کے لئے کجاوہ وغیرہ کے سائے میں بیٹھنا جائز ہے۔ اور اگر یہ ایام منیٰ میں سے کسی اور دن کا قصہ ہے تو مسئلہ مذکورہ کی دلیل نہیں۔ اور حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ یہ کس وقت کا قصہ ہے۔ کذا فی الہدی (ش) اور مُحرِم کے سائے میں بیٹھنے کا مسئلہ اختلافی ہے اس کا بیان رسالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ جہاں یہ بحث آئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر حج کیا۔ اور مشکوۃ شریف میں بروایت مسلم ام حصینؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: میں نے اسامہؓ و بلالؓ کو دیکھا کہ ان میں سے ایک آپؐ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے تھے۔ اور دوسرے اپنے کپڑے سے آپؐ کو سایہ کررہے تھے۔ یہاں تک

کہ آپ جمرۂ عقبہ کی رمی سے فارغ ہوگئے۔" یہ حدیث اسی لفظ سے ابو داؤد میں بھی آئی ہے۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں "اول سے مراد بظاہر بلالؓ ہیں اور دوسرے سے اسامہؓ" اھ۔

میں کہتا ہوں کہ نسائی میں اسی حدیث کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔ روایت کے لفظ یہ ہیں "پس میں نے بلالؓ کو دیکھا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے ہیں۔ اور اسامہ بن زیدؓ آپ پر کپڑے سے سایہ کررہے ہیں ——— اور آپ احرام کی حالت میں تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے جمرۂ عقبہ کی رمی کی" الخ اس میں آپ کے محرم ہونے کی بھی تصریح ہے۔ جس سے اس بات کی تعیین ہوگئی کہ یہ قصہ یوم نحر کا ہے۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ابو داؤد میں عمرو بن احوص کی اپنی والدہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بطن وادی سے جمرہ کی رمی کررہے تھے۔ اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ ایک آدمی پیچھے سے آپ کو پردہ کررہا تھا۔ میں نے اس شخص کا نام دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ یہ فضل بن عباسؓ ہیں" الخ شیخ بذل میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ حدیث امام احمدؒ نے مفصل ذکر کی ہے۔ اور اس کے سیاق سے یہ اشکال حل ہوجاتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بطن وادی سے جمرۂ عقبہ کی رمی کررہے تھے۔ اور آپ کے پیچھے ایک آدمی آپ کو لوگوں سے پردہ کررہا تھا۔ کہ کہیں کوئی پتھر آپ کو نہ لگے" الخ تو اب صورت یہ ہوئی کہ حضرت فضلؓ تو آپ کو پیچھے سے پردہ کئے ہوئے تھے، تاکہ آپ کو پیچھے سے آنے والی کنکریوں سے بچائیں۔ اور حضرت اسامہؓ اپنے کپڑے سے آپ کے سر مبارک پر دھوپ سے سایہ کررہے تھے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں قصے دو الگ الگ ایام کے ہوں مگر ام حصینؓ کی حدیث کا واقعہ معین طور پر یوم نحر کا ہے۔ کیونکہ نسائی کی روایت میں آپ کے محرم ہونے کی تصریح ہے اور زرقانیؒ نے یوں تطبیق دی ہے کہ ممکن ہے دونوں باری باری سایہ کررہے ہوں۔ اور مکہ سے منیٰ جانے کی بحث میں گذر چکا ہے کہ بلالؓ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس پر کپڑا لٹکا کر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سایہ کررہے تھے۔

ولم یزل یلبی الی اول حصاۃ ۔ ثم رجع الی منی فخطب خطبۃ ۔

ترجمہ: اور پہلی کنکری تک آپ برابر تلبیہ پڑھتے رہے، پھر منی کیطرف لوٹے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔

حاجی تلبیہ کب بند کرے؟ اور پہلی کنکری پھینکنے تک آپ برابر تلبیہ پڑھتے رہے۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جو اوجز میں بسط کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ اس کا اجمالی خلاصہ حاشیہ لامع میں مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حاجی تلبیہ کب ختم کرے؟ بخاری کی حدیث میں حضرت فضلؓ اور حضرت اسامہؓ دونوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرہ عقبہ تک برابر تلبیہ کہتے رہے یہ جمہور کے قول کی ——— جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بھی شامل ہیں، دلیل ہے کہ جمرۂ عقبہ کی رمی تک تلبیہ کہنا ہے۔ البتہ اس میں ان کا اختلاف ہے کہ پہلی کنکری کے ساتھ بند کردے یا رمی پوری کرنے کے بعد، جمہور پہلی صورت کے قائل ہیں۔ اور امام احمدؒ اور بعض اصحاب شافعیؒ دوسری صورت کے۔ اور ایک گروہ کا قول ہے کہ محرم جب حرم میں داخل ہو جائے تو تلبیہ بند کردے۔ لیکن جب مکہ سے عرفہ کی طرف نکلے تو دوبارہ تلبیہ شروع کردے۔ ابن عمرؓ کا یہی مذہب ہے۔ اور ایک گروہ کا قول ہے کہ جب عرفات میں موقف کی طرف چلے تو تلبیہ بند کردے۔ امام مالکؒ اسی کے قائل ہیں۔ اور انہوں نے اس کو یوم عرفہ کے زوالِ آفتاب کے ساتھ مقید کیا ہے۔ پوری تفصیل اوجز میں دیکھی جائے۔

خطبۂ یوم نحر پھر منیٰ کی طرف لوٹے اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آئمہ کا اختلاف یوم الترویہ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔ چنانچہ شافعیہ و حنابلہ اس کے قائل ہیں۔ اور حنفیہ و مالکیہ اس کے قائل نہیں، بلکہ وہ اسے وصایا عامہ پر محمول کرتے ہیں عینیؒ نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے کہ "خطبہ وصایا عامہ کے باب سے تھا نہ کہ مناسک حج سے۔" اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ "خطبۂ مذکورہ متعلقاتِ حج سے نہیں تھا کیونکہ احکام حج میں سے اس میں کوئی بات نہیں بیان فرمائی گئی۔ اس میں صرف وصایا عامہ ذکر فرمائے۔ اور کسی نے یہ نقل نہیں کیا کہ آپؐ نے اس خطبہ میں یوم نحر سے متعلق کوئی حکم بیان فرمایا ہو جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ خطبہ حج کی خاطر مقصود نہیں تھا۔" اور ابن قصار کہتے ہیں: "یہ خطبہ آپؐ نے ان مضامین کی تبلیغ کی خاطر ارشاد فرمایا تھا۔ جو اس میں ذکر کئے گئے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے دور دراز گوشوں

سے بہت سا مجمع جمع تھا۔ دیکھنے والوں نے یوں گمان کیا کہ آپؐ نے خطبہ دیا: اھ ان حضرات کا یہ کہنا کہ یہ خطبہ وصایا عامہ کے قبیل سے تھا اس کی تائید اُن مضامین سے ہوتی ہے جو شیخ ابن قیمؒ نے اس خطبہ کے ضمن میں نقل کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "آپؐ نے لوگوں کو ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں یوم نحر کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرمت اور تمام شہروں کے مقابلے میں مکہ مکرمہ کی عزت و حرمت بیان فرمائی۔ اور حکم فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے اس کی سمع و طاعت بجا لاؤ۔ اور لوگوں کو ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے مناسک حج سیکھ لیں۔ اور ارشاد فرمایا کہ شاید میں اس سال کے بعد حج نہیں کروں گا۔ ان کو احکامِ حج کی تعلیم فرمائی۔ مہاجرین و انصار کے لئے ان کے منازل تجویز فرمائے۔ لوگوں کو حکم فرمایا کہ وہ آپؐ کے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں۔ آپؐ نے حکم فرمایا کہ (حاضرین نے جو کچھ سُنا ہے) آپؐ کی جانب سے ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں) پہنچا دیں اور آپؐ نے بتایا کہ بہت سے لوگ جن کو احکام پہنچائے جائیں۔ سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور آپؐ نے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ہر مجرم کا جرم صرف اسی کی ذات پر عائد ہوگا (کسی دوسرے سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی) اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے لوگوں کے کان کھول دیئے۔ یہاں تک کہ اہلِ منیٰ اپنی اپنی جگہ پہ آپؐ کا خطبہ سن رہے تھے اور آپؐ نے اپنے اسی خطبہ میں فرمایا: "اپنے رب کی عبادت کرو۔ نماز پنجگانہ ادا کرو۔ ماہ مبارک کے روزے رکھو۔ اپنے اولوالامر کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے" اور آپؐ نے اس وقت لوگوں کو الوداع کہی۔ اس لئے اس کا نام "حجۃ الوداع" ہوا"

(۵۳) اور اسی خطبہ میں آپؐ نے ایک دوسرے کے خون۔ مال اور آبرو کی حرمت بیان فرمائی۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "وارث کے لئے وصیت نہیں" جیسا کہ زیلعی میں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ "زمانہ گھوم کر اپنی اصلی ہیئت پر آگیا ہے۔ سال کے بارے میں مہینے ہیں۔ جن میں چار حرمت کے مہینے ہیں": اور اس میں یہ بھی فرمایا "اور عنقریب تم اپنے رب کے سامنے جاؤ گے، وہ تمہارے اعمال کے بارے میں دریافت فرمائیں گے۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جائیو" الخ جیسا کہ روایات میں معروف ہے۔ اور یہ بھی تین بار فرمایا: "دیکھو! کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟" اور فرمایا "سنو! جو حاضر ہیں وہ ان کو پہنچا دیں جو حاضر نہیں" الخ کذا فی الطبقات۔ اور آپؐ نے مسیح دجّال کا بھی ذکر فرمایا۔ اور بڑا طویل بیان فرمایا۔

یہ پوری حدیث بخاری "باب حجۃ الوداع" میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی وصیتیں فرمائیں۔ جو بہت سی کتب احادیث میں بالخصوص طبقات ابن سعد میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس سے زیادہ البدایہ والنہایہ میں ہیں، پس یہ تمام روایات دلالت کرتی ہیں کہ اس خطبہ میں وصایا عامہ ذکر فرمائی تھیں اسی بنا پر امام طحاوی فرماتے ہیں، جیسا کہ زرقانی نے ان سے نقل کیا ہے کہ اس خطبہ کے کسی راوی، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ اور ابی بکرہؓ وغیرہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ نے کسی ایسی چیز کی تعلیم فرمائی ہو جس کا تعلق یوم نحر سے ہے۔

سورۃ النصر کا نزول

اور زرقانی یہ بھی کہتے ہیں کہ بیہقی میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے بسندِ ضعیف اس وداع کا سبب مذکور ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ" وسطِ ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ نے پہچانا کہ یہ پیغامِ وداع ہے، پس آپ نے اپنی قصواء نامی اونٹنی کو تیار کرنے کا حکم فرمایا، پس تیار کی گئی۔ پس آپ سوار ہوئے، اور عقبہ میں ٹھہرے اور لوگ آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ پس آپ نے فرمایا اے لوگو! (اس کے بعد حدیث کے مضامین وہی ہیں جو اوپر ذکر ہوئے)" اور یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر میں نہیں۔ بلکہ ایام تشریق میں ہوا تھا کیونکہ یہ خطبہ سورۃ النصر کے نزول کے بعد تھا۔ اور سورۃ النصر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ سورۃ النصر کے زمانۂ نزول میں روایات مختلف ہیں کہ آیا اس کا نزول وصال نبوی سے ایک سال پہلے ہوا تھا۔ یا دو سال پہلے اور یہ کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا یا مدینہ میں؟ ان روایات کی تفصیل "درمنثور" میں ہے۔ مندرجہ بالا روایت جو زرقانی نے نقل کی ہے، علامہ سیوطیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ "اس کی تخریج ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، بزار، ابو یعلیٰ، ابن مردویہ، اور بیہقی نے دلائلِ نبوت میں ابن عمرؓ سے کی ہے۔" اور ایام منیٰ کے ذیل میں بھی وسط ایام تشریق میں اس کے نازل ہونے کا بیان آئے گا۔

حضرت شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ مولانا محمد یحییٰؒ نے اپنے شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے افادات میں تحریر کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطباتِ حج کے سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دن خطبہ دیا۔ بلکہ ساتویں تاریخ سے ختم مناسک تک تمام ایام میں خطبہ دیا۔ اور اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے یہی

ظاہر ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو ہر وقت وعظ و تذکیر فرماتے تھے، خصوصاً ان دنوں میں وہ وعظ نصیحت کے بہ نسبت دیگر اوقات کے زیادہ محتاج تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع بھی تھے۔ لہذا یہ مناسب نہیں کہ خطبات کی تمام روایات کو تین یا چار خطبوں کی طرف راجع کیا جائے۔ اور ہمارے علماء احناف رحمہم اللہ کا یہ مذہب کہ امام ۷، ۸ ذی الحجہ کو خطبہ دے پھر ۹، پھر ۱۱ کو تو اس کا مقصد لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ ان کے روزمرہ اجتماع سے انہیں حرج لاحق ہوگا کہ انہیں ہر دن سامان اٹھانا اور چیزیں درست کرنا پڑینگی اور سامان کی حفاظت بھی وزان پر ضلے ہمارے علماء کا یہ مقصد نہیں کہ ان خطبات پر زیادتی کرنا ممنوع یا بدعت ہے۔ واللہ اعلم۔" انتہیٰ۔ پھر مخفی نہ ہے کہ کہ شیخ ابن قیمؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطبہ بوقتِ چاشت ہوا، اور مناسکِ نووی میں ہے کہ "امام کے لئے سنت ہے کہ اس دن نماز ظہر کے بعد خطبہ دے" اور ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس پر امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا اتفاق ہے۔ مگر اس میں اشکال ہے کیونکہ احادیث میں تصریح ہے کہ یہ خطبہ یوم نحر کی چاشت کو ہوا نہ کہ ظہر کے بعد۔ ابوداؤد میں بسند ثقات مروی ہے: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ منیٰ میں شہباء نامی خچر پر چاشت کے وقت خطبہ دے رہے تھے" مصنف نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ زوال کے بعد تھا کیونکہ اس روایت میں ہے کہ بعض سائلین نے عرض کیا کہ "میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی" اور شام کا اطلاق زوال کے بعد پر ہوتا ہے۔ اس لئے ابن عباس کی روایت مقدم ہے کیونکہ وہ صحت و شہرت میں ابوداؤد کی روایت سے فائق ہے۔ اور علامہ سبکی نے یہ جواب دیا کہ ابوداؤد کی روایت میں جو خطبہ مذکور ہے وہ یوم نحر کا نہیں بلکہ گیارہ تاریخ کا خطبہ تھا چنانچہ طبقات ابن سعد میں عمرو بن یثربی سے یہی روایت اس طرح مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم نحر سے اگلے دن کا خطبہ یاد رکھا ہے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قصواء نامی اونٹنی پر سوار تھے، اور وہ اس پورے خطبہ کو نقل کیا کرتے تھے۔

خطبہ خچر پر دیا تھا یا اونٹنی پر؟

زرقانی کہتے ہیں کہ آپ نے شہباء نامی خچر پر خطبہ دیا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ شہباء کے معنیٰ ہیں "جس کا رنگ سفید ہو اور اس میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو" اھ۔ اور زرقانی کہتے ہیں: یعنی سفید رنگ جس کی سفیدی

قلت، وعلی رضی اللہ عنہ یعبر عنہ

ترجمہ: (ش) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کر رہے تھے۔

سیاہی پر غالب ہو" اور ابو داؤد کی کتاب اللباس کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "اور سرخ چادر آپؐ کے زیب تن تھی"۔ یہ حدیث ابو داؤد نے رافع بن عمرو المزنی سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابو داؤد ہی میں ہرماس بن زیاد سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے دن منیٰ میں اپنی عضباء نامی اونٹنی پر خطبہ دے رہے تھے"۔ شیخ قدس سرہٗ بذل میں فرماتے ہیں کہ "یہ (رافع بن عمرو کی روایت) ہرماس کی روایت کے مخالف ہے لہٰذا ہرماسؓ کی روایت کو خطبۂ یوم نحر پر محمول کیا جائیگا، اور رافع بن عمرو کی حدیث خطبۂ یوم النحر کے علاوہ کسی اور دن پر"۔

حضرت علیؓ کا ترجمانی کرنا

(ش) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی کر رہے تھے۔ جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ زرقانی کہتے ہیں "یُعَبِّرُ بضم اول اور تشدید یاء، یعنی آپ کی آواز کو دور تک پہنچاتے تھے۔ جوہری کہتے ہیں کہ جب کسی کی جانب سے گفتگو کرو تو اس کے لئے عَبَّرْتُ عَنْ فُلَانٍ کہا جاتا ہے۔ اور زبان ما فی الضمیر کی ترجمانی کرتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپؐ کی عبارت کی تفسیر و تشریح کرتے تھے۔ اس صورت میں یہ لفظ تعبیر خواب سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی ہیں تفسیر کرنا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ یہ عَبَّرْتُ الکتاب سے ماخوذ ہوگا۔ لیکن پہلے معنی ظاہر بلکہ متعین ہیں"۔ اور ملا علی قاریؒ کہتے ہیں: "یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز دور کے لوگوں کو پہنچاتے تھے۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی دور کھڑے تھے جہاں تک آپ کی آواز پہنچ رہی تھی، اور وہ اسے سمجھ کر دور کے لوگوں کو کمی زیادتی کے بغیر سمجھا رہے تھے۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا بے محل ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے پہنچاتے تھے"۔ اھ۔

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحابہؓ کے اس قول کے خلاف نہیں کہ "ہمارے کان کھل گئے تھے اور ہم اپنی اپنی جگہ آپؐ کی آواز سن رہے تھے"۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ ہو کہ منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی بار خطبے ہوئے، یا یہ کہا جائے کہ معجزہ صرف انہی لوگوں کے حق میں تھا جو اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ اور جو لوگ اس مجلس میں حاضر تھے وہ معتاد طریقے ہی سے سنتے

تھے۔ اس لئے بسا اوقات کوئی لفظ شغل کی وجہ سے سننے سے رہ جاتا تھا، یا بعض لوگ اس لغت سے ناواقف ہوں گے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خطاب فرما رہے تھے۔ کیونکہ اس موقعہ پر مختلف قبائل سے بہت سی مخلوق جمع تھی۔ اور ولی عراقی نے کہا ہے کہ یہ خطبہ اس خطبہ کے علاوہ تھا جو قبل ازیں ذکر کیا گیا۔ کیونکہ یہاں اونٹنی کا ذکر ہے اور وہاں خچر کا ذکر تھا۔ اور وہ حدیث جس میں خچر کا ذکر ہے۔ ابوداؤد، نسائی، بغوی اور طبرانی وغیرہ نے ان ہی سے یعنی رافع بن عمرو المزنی سے طوالت کے ساتھ روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں: "میں اپنے والد کے ساتھ حجۃ الوداع کو گیا۔ اس وقت میری عمر دس بارہ برس یا اس سے زیادہ تھی، میں نے دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شہباء نامی خچر پر لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ اور علی بن ابی طالبؓ آپؐ کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ لوگ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں۔ میرے والد تو بیٹھ گئے۔ اور میں اونٹوں کے درمیان سے ہوتا ہوا خچر تک جا پہنچا، پس میں نے آپؐ کی رکاب پکڑ لی، پھر میں نے آپؐ کے زانو پر ہاتھ رکھ کر پنڈلی تک ہاتھ پھیرا، یہاں تک کہ قدم مبارک تک پہنچ گیا۔ پھر میں نے نعل مبارک اور پاؤں مبارک کے درمیان ہاتھ ڈالا۔ مجھے آج تک یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ کے قدم مبارک خنکی میں اپنے ہاتھ میں پاتا ہوں" اھ ـــــ زرقانی کا کلام ختم ہوا۔

اور صحابہ کا یہ قول کہ "ہم منیٰ میں اپنی اپنی جگہ بیٹھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سن رہے تھے"۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو حضرات صحابہؓ اپنے اپنے خیموں میں کیسے بیٹھے رہے؟ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے بذل میں اس کا بہت ہی عمدہ جواب المنہل العذب المورود سے نقل کیا ہے، یہ میرے والد مرحوم نور اللہ مرقدہٗ کے سنن ابوداؤد کے افادات کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"جواب یہ ہے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ کسی ضرورت سے اپنے خیموں میں رہ گئے تھے وہ بھی آپؐ کی آواز سن رہے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ سب اپنے اپنے خیموں میں بیٹھے رہے یا یہ مراد ہے کہ اگر وہ اپنے خیموں میں بھی ہوتے اور خطبہ میں حاضر نہ ہوتے تب بھی آپ کی آواز سن سکتے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے متفرق مسائل اتفاقاً ذکر کئے ہوں۔ اور ان کو جمع کرنے کا اہتمام نہ فرمایا ہو کہ وہ حضرات لازماً جمع ہوتے الخ" میں کہتا ہوں کہ اس ناکارہ کے نزدیک یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اپنی اپنی قیام گاہوں اور خیموں میں تھے، کہ ان کی قیام گاہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ کے بعد متعین فرمائی تھیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خطبہ سننے کے لئے اس مجلس میں جہاں بھی کوئی بیٹھا تھا خواہ وہ آپؐ سے کتنا ہی دور تھا وہیں آپؐ کا خطبہ سن رہا تھا۔ گویا اس حدیث

(قال) وودع الناس فسمی حجۃ الوداع

ترجمہ: (ق) اور آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہی، اس لئے یہ حج "حجۃ الوداع" کہلایا۔

میں منازل سے مجلس خطبہ کی نشست گاہیں مراد ہیں: جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ سے دور تھیں کیونکہ صحابہ کرامؓ اس موقعہ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) تھے۔ ظاہر ہے سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جگہ ملنا ممکن نہیں تھا۔ اور ان دنوں لاؤڈ سپیکر یا مکبر الصوت بھی ایجاد نہیں ہوا تھا، اس لئے سب تک آواز کا پہنچنا آپؐ کا معجزہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کان کھول دیئے۔

حجۃ الوداع کی وجہ تسمیہ اور دوسرے نام

(ق) اور اس موقعہ پر آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہی، اس لئے یہ حج حجۃ الوداع کہلایا۔ اور اوجز میں ہے کہ یہ نام متعدد احادیث میں آتا ہے۔ اور "وداع" داؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس حج میں رخصت کیا، اور آپؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسکے بعد آپؐ کو ایسے کسی اور موقعہ کا اتفاق نہیں ہوگا۔ نہ اس جیسا اجتماع میسّر ہوگا۔ اور سبب اس کا یہ ہوا کہ وسطِ ایام تشریق میں آپؐ پر "اذا جاء نصر اللہ" نازل ہوئی، اور آپؐ نے جانا کہ یہ کوچ کا پیغام ہے۔ کذا فی الجمع۔ اور عینیؒ کہتے ہیں: "اس کو "حجۃ الوداع" اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لوگوں کو رخصت کیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ شاید اس سال کے بعد تم سے نہیں مل سکونگا، جن لوگوں نے اس نام کو مکروہ کہا ہے یہ ان کی غلطی ہے، اور اس کو "حجۃ البلاغ" کا نام بھی دیا گیا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں فرمایا تھا هَلْ بَلَّغْتُ (کیا میں نے پہنچا دیا؟) اور اس کو "حجۃ الاسلام" بھی کہتے ہیں کہ اس سال پہلی بار صرف مسلمانوں نے حج کیا۔ کوئی مشرک شریک حج نہیں تھا"

اور لامع کے حاشیہ میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ اس کو حجۃ الوداع اس بنا پر کہا گیا کہ آپؐ نے اس میں اور اس کے بعد لوگوں کو وداع (رخصت) کیا اور اس کا نام "حجۃ الاسلام" اس وجہ سے ہے کہ فرضیت حج کے بعد آپؐ نے مدینہ سے اس کے علاوہ کوئی حج نہیں کیا۔ اور "حجۃ البلاغ" اس بنا پر کہلاتا ہے کہ آپؐ نے اس میں مسائل حج کی قولاً و فعلاً تبلیغ فرمائی۔ نیز اس کا نام "حجۃ التمام" اور "حجۃ الکمال" بھی ہے۔ اھ۔ بخاری کے حاشیہ (مطبوعہ ہندوستان) میں اس پر یہ اضافہ ہے: کیونکہ ارشاد خداوندی: الیوم اکملت لکم دینکم الایۃ اس میں نازل ہوئی۔" اھ اور عینیؒ نے اس پر یہ اضافہ

کیا ہے کہ "حجۃ الوداع" کا نام زیادہ مشہور ہے" اھ اور ملا علی قاری فرماتے ہیں: "اس کا نام "حجۃ الوداع" اس وجہ سے ہوا کہ آپؐ نے اس حج میں لوگوں کو یا حرم کو الوداع کہی" اھ اور نیل المارب میں ہے: "اس کو "حجۃ الوداع" کہنا مکروہ ہے، یہ کراہت کا قول صاحب خمیس نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے" اوجز کی عبارت ختم ہوئی۔

اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ہم آپس کی گفتگو میں حجۃ الوداع" کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے۔ مگر ہمیں خبر نہیں تھی کہ حجۃ الوداع کا مفہوم کیا ہے؟" شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ "صحابہ کرام میں حضرات شیخین اور دیگر اعلیٰ طبقہ کے حضرات تو اس کی وجہ تسمیہ جانتے تھے۔ مگر عام لوگ صرف دوسروں کی تقلید میں یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بات بعید از قیاس[1] ہے کہ کوئی بھی اس کی وجہ تسمیہ سے واقف نہ ہو مگر اس کے باوجود یہ نام استعمال کرتے ہوں۔ اور بعید نہیں کہ اس نام رکھنے کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوئی ہو کہ "شاید میں تم کو اس سال کے بعد نہیں دیکھ سکوں گا" پس لوگوں نے آپؐ کے اس ارشاد کو اس معنیٰ پر محمول کیا ہے کہ آپؐ آئندہ اس اجتماع کے ساتھ حج نہیں کریں گے، اس بنا پر انہوں نے اس کا نام "حجۃ الوداع" رکھا۔ پھر جب اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپؐ کا وداع کہنا کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں تھا۔ اور یہ کہ یہ صرف ان عوام کو جو اس حج میں جمع تھے رخصت کرنا نہیں تھا بلکہ خاص و عام سب کو رخصت کرنا تھا" اھ اور اس کے حاشیہ میں مولانا محمد حسن مکی کے افادات سے نقل کیا ہے کہ "ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمیں خبر نہیں تھی" اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں تھی کہ اس کو "حجۃ الوداع" کیوں کہتے ہیں کیونکہ غایت محبت کی بنا پر ہمارے دل میں اس کا وہم بھی نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے رخصت ہو جائیں گے" اھ اور حافظ کہتے ہیں: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کا لفظ ذکر فرمایا، اور صحابہؓ اسے استعمال کرنے لگے۔ مگر ان کا ذہن ادھر نہیں گیا کہ وداع سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو وداع کرنا ہے، یہاں تک اس کے کچھ عرصہ بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا تو صحابہ کرامؓ اصل مراد کو سمجھے، اور انہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنی اس وصیت

---

[1] وفی الاصل (اعنی البذل) "اذ لا یبعد"۔ والظاہر "اذ یبعد"۔ شیخ۔

کے ذریعہ رخصت کیا تھا کہ آپؐ کے بعد کفر کی حالت کی طرف نہ لوٹ جائیں۔ اور اس وداع کو یوں مؤکد فرمایا
کہ پہلے ان کو اس بات پر گواہ بنایا کہ آپؐ تمام احکام خداوندی ان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور پھر ان کی گواہی پر
اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا، اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ "حجۃ الوداع" کے لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
مراد کیا تھی؟ اور بخاری کی کتاب الحج، "باب الخطبہ بمنیٰ" میں بروایت عاصم عن ابیہ عن ابن عمر رضی اللہ
عنہ اس حدیث میں یہ لفظ ہے "فودع الناس" (پس آپؐ نے لوگوں کو رخصت کیا) اور بیہقی کی روایت میں
ہے کہ سورۃ "اذا جاء نصر اللہ والفتح" وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے محسوس کیا کہ یہ وداع (یعنی رخصت) کا پیغام ہے، پس آپؐ سوار ہوئے اور لوگ جمع ہوگئے۔ پس
آپؐ نے خطبہ دیا الخ، پوری تفصیل حاشیۂ لامع میں ہے۔

ارشاد نبوی: شاید میں تمہیں اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا

اور شیخ قدس سرہٗ کوکب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
ارشاد "شاید کہ میں تمہیں اس سال کے بعد نہیں دیکھوں گا" کے ذیل
میں فرماتے ہیں: "اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس
بات کی ترغیب دینا تھا کہ وہ آپؐ سے احکام سیکھ لیں، آپؐ نے اس حج میں اپنی امتِ مرحومہ کو وداع کیا
تھا۔ اس لئے اس کا نام حجۃ الوداع ہوا۔ تمام صحابہ اس کی وجہ تسمیہ کو نہیں سمجھ پائے۔ البتہ بعض فقہاء صحابہ
نے شروع ہی سے جان لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ہی عرصہ میں انہیں چھوڑ کر سفر آخرت پر
روانہ ہو رہے ہیں، اور ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے، پھر جب اس حج کے قریباً
دو ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار دنیا سے رہگرائے عالم آخرت ہوئے عام صحابہؓ کو تب معلوم ہوا کہ
اس حج کو "حجۃ الوداع" کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟" اھ اور نووی لکھتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد "شاید کہ میں اس حج کے بعد اور حج نہ کر سکوں" اس میں ان کو وداع کہنے کی طرف اشارہ تھا۔ اور
انہیں وصالِ نبوی کے قرب کی اطلاع دینا تھا۔ اور اس امر پر برانگیختہ کرنا تھا کہ آپؐ سے اخذ و استفادہ
کا بہت ہی اہتمام کریں، آپؐ کی ملازمت اور آپؐ سے دین کے امور کے سیکھنے کی فرصت کو غنیمت
جانیں، اسی بنا پر اس کو "حجۃ الوداع" کا نام دیا گیا، واللہ اعلم۔" اھ

وسئل هناك عن اشياء بالتقديم والتاخير فقال افعل ولا حرج

ترجمہ: اور اس موقعہ پر آپؐ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "کوئی حرج نہیں، اب کر لو۔"

ارشادِ نبوی: کوئی حرج نہیں اب کرلو

اور اس موقعہ پر آپ سے چند چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا گیا، آپؐ نے فرمایا: "کوئی حرج نہیں، اب کرلو۔" شیخ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر آپؐ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے حلق کرلیا۔ اور یہ بھی دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے رمی سے پہلے ذبح کا عمل کرلیا، آپؐ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: "میں نے نہیں دیکھا کہ آپؐ سے اس دن کسی چیز کے بارے میں دریافت کیا گیا ہو اور آپؐ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ کوئی حرج نہیں، اب کرلو۔" ابن عباس کہتے ہیں کہ ذبح، حلق اور رمی کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں آپ سے عرض کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔" یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ اور اُسامہ بن شریک کہتے ہیں: "ایک شخص عرض کرتا کہ یا رسول اللہ! میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی، یا میں نے فلاں چیز کو مؤخر کردیا اور فلاں چیز کو پہلے کرلیا۔ مگر آپؐ ہر ایک کو یہی فرماتے کہ "کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں، البتہ حرج اس شخص پر ہے جس نے کسی مسلمان آدمی کی عزت، بطورِ ظلم، پامال کی پس یہ ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا" اور یہ لفظ کہ "میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی" اس حدیث میں محفوظ نہیں۔ محفوظ یہ ہے کہ رمی، نحر اور حلق کی تقدیم و تاخیر کا سوال کیا گیا تھا۔" انتہیٰ۔ اور اسامہ بن شریک کی اس روایت کو ابو داؤدؒ، طحاویؒ اور دارقطنیؒ نے روایت کیا ہے، جیسا کہ نوویؒ نے شرحِ مہذب میں لکھا ہے، اور دارقطنی کہتے ہیں کہ: "میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی" کا فقرہ صرف جریر نے شیبانی سے روایت کیا ہے۔

یوم النحر کے چار افعال کی تقدیم و تاخیر سے متعلقہ مباحث

(ش) اور یہاں چند بحثیں ہیں:۔

اوّل:۔ یہ سوال و جواب کس وقت ہوا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال و جواب بوقت چاشت خطبہ کے دوران ہوئے۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ شام کے وقت خطبہ کے دوران ہوئے۔ کیونکہ ایک سوال یہ ہوا تھا کہ

---

[1] کذا فی الہدی وفی البخاری عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

"میں نے شام ہوجانے کے بعد رمی کی" اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال وجواب دورانِ خطبہ نہیں ہوئے۔ بلکہ (اس وقت ہوئے جب کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم اور فتویٰ کے لئے تشریف فرما تھے، چنانچہ مؤطا کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں لوگوں کی خاطر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور لوگ آپ سے سوالات کر رہے تھے" الخ اور مسلم شریف میں بھی یہ روایت اسی سند سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی خاطر ٹھہرے، درآنحالیکہ لوگ آپ سے سوال کر رہے تھے" اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب کا عنوان یوں قائم کیا ہے "باب الفتیا علی الدابۃ عند الجمرۃ" اور اس کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ یوم النحر میں خطبہ دے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو خطبہ پر نہیں بلکہ مسائل بتانے پر محمول کیا ہے چنانچہ اُبی کہتے ہیں بخاری کا ترجمۃ الباب دلالت کرتا ہے کہ یہ خطبہ نہیں تھا" اھ تفصیل اوجز میں ہے۔

بحث دوم روایات میں معروف یہ ہے کہ سوال ان چار چیزوں کی تقدیم وتاخیر کے بارے میں تھا جو اس دن کی جاتی ہیں یعنی رمیؔ، ذبحؔ، حلقؔ، اور افاضہؔ (طواف کے لئے مکہ جانا) کہ یہی چار کام اس دن کئے جاتے ہیں۔ اوجز میں بسط کے ساتھ ان روایات کو ذکر کیا، جو ان چاروں کے بارے میں مروی ہیں۔ اور اسامہ بن شریک کی روایت میں طواف سے پہلے سعی کرنے کا ذکر بھی ہے۔ اور شیخ ابن قیمؒ کا قول پہلے گذر چکا ہے کہ یہ محفوظ نہیں۔ اور اوجز میں ہے کہ حافظ کہتے ہیں: "جو شخص طواف سے پہلے سعی کرلے اس کے بارے میں دو قول ہیں، بعض اہل حدیث اسامہ بن شریک کی روایت کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ صحیح ہے (اعادہ کی ضرورت نہیں) اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ کفایت نہیں کرے گی۔ وہ حدیث اسامہ کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہ طواف قدوم کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے سعی کرنے پر محمول ہے اور ابن حزم کا مذہب یہ ہے کہ سعی کی تقدیم جائز ہے۔ اور ابن حزم نے ان لوگوں پر رد کیا ہے جو طواف وسعی کی تقدیم وتاخیر کے درمیان اور باقی اشیاء کی تقدیم وتاخیر کے درمیان فرق کے قائل ہیں" اھ

اور نوویؒ شرح مہذب میں لکھتے ہیں: "اگر کسی نے طواف سے پہلے سعی کرلی تو ہمارے نزدیک اس کی سعی صحیح نہیں، یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ اور ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ ماوردیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، اور یہی امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مذہب ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی کی اور فرمایا کہ مجھ سے مناسک سیکھ لو۔ رہی اسامہؓ کی حدیث! تو خطابی وغیرہ کی توجیہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے طواف قدوم کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے سعی کی" اھ۔

بحث سوم اکثر روایات میں صرف چار چیزوں کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں سوال کا ذکر ہے۔ حافظؒ فرماتے ہیں کہ مجموعہ روایات سے چند صورتیں نکلتی ہیں جو ضرب و تقسیم کے بعد چوبیس ۲۴ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مذکور ہیں اور بعض کو راویوں نے ذکر نہیں کیا۔ یا تو اختصار کی بنا پر، یا اس وجہ سے کہ پیش نہیں آئی تھیں" اوجز میں ان چوبیس ۲۴ صورتوں کا نقشہ بصورت جدول دیا گیا ہے، تاکہ ان کا سمجھنا آسان ہو۔ جی چاہے تو وہاں دیکھ لو۔

بحث چہارم: ان افعال میں ائمہ کا اختلاف جاننا چاہیئے کہ یوم نحر میں علی الترتیب چار عمل کئے جاتے ہیں، رمیؔ، ذبحؔ، حلقؔ، طوافِ افاضہؔ۔ یہ ترتیب علماء کے نزدیک مسنون ہے، کیونکہ بہت سی روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے یہ عمل اسی ترتیب سے ادا کئے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک ان اشیاء میں ترتیب سنت ہے واجب نہیں: اس لئے اگر ان میں سے کسی چیز کو آگے پیچھے کر دیا تو ان کے نزدیک دم واجب نہیں۔ ان کا استدلال ان روایات سے ہے۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:" افعل ولا حرج" یعنی کوئی مضائقہ نہیں، اب کر لو" مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بعض چیزوں میں ترتیب واجب ہے اور بعض میں سنت۔ پس جس نے ترتیب واجب کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم لازم ہے۔ اور جس نے ترتیب مسنون کے خلاف کیا اس کے ذمہ دم تو نہیں، مگر اس نے بُرا کیا۔ چنانچہ امام مالکؒ کے نزدیک رمی کے درمیان اور باقی تین چیزوں کے درمیان ترتیب واجب ہے۔ پس اگر ان تین چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی رمی سے مقدم کر دیا تو دم واجب ہوگا۔ اور باقی تین چیزوں میں ترتیب سنت ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صرف مفرد بالحج کے لئے طواف اور ذبح کے درمیان ترتیب سنت ہے۔ ان کے علاوہ باقی تمام چیزوں میں ترتیب واجب ہے۔ خواہ مفرد ہو یا غیر مفرد۔ پس جو شخص ترتیب واجب کے خلاف کرے اس کے ذمہ دم لازم ہوگا" یہ اس تفصیل کا خلاصہ ہے جو اوجز میں مذاہب اربعہ کی کتابوں سے نقل کی گئی ہے۔ اور اوجز میں کتب فروع وغیرہ سے نقلِ مذاہب، ائمہ کے دلائل اور ان کے جواب میں خوب بسط سے کلام کیا ہے۔ ترتیب

اور دم کے واجب ہونے پر حنفیہ اور ان کے موافقین کا استدلال متعدد وجوہ سے ہے۔ ایک یہ کہ یہ معروف قاعدہ ہے کہ راوی حدیث کا فتویٰ جب اس کی روایت کے خلاف ہو تو اس کے فتویٰ پر عمل ہوگا۔ اور حدیث الباب کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وجوب دم کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور حافظؒ نے جو اس کا جواب دیا ہے عینیؒ نے اس پر ردّ کیا ہے جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ دوم یہ کہ امام مالک مؤطا میں فرماتے ہیں: "وہ امر جس میں ہمارے یہاں اختلاف نہیں یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے سر کا حلق نہ کرے، نہ اپنے جسم کے بال کاٹے یہاں تک کہ نحر کرے (آگے چل کر فرمایا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلّہ۔

سوم: یہ کہ ابن رشد کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا اعتماد اس بات پر ہے کہ جس شخص نے کسی ضرورت کی بنا پر قبل از وقت حلق کیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کا حکم فرمایا، اب جو شخص بلا ضرورت ایسا کرے اس پر کوئی چیز کیوں واجب نہ ہوگی۔ شیخ ابن ہمام نے اس پر جو جرح کی ہے اس کا جواب اوجز میں دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور متعدد دلائل جن سے وجوب دم ثابت ہوتا ہے، اوجز میں مفصل مذکور ہیں۔ نیز وہ احادیث جن میں یہ آتا ہے کہ "افعل ولا حرج" (کوئی مضائقہ نہیں اب کر لو) ان کے بارہ جواب تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ ان میں سب سے واضح جواب یہ ہے کہ ولا حرج میں گناہ کی نفی کی گئی ہے۔ دم کے وجوب یا عدم وجوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اوجز میں ہے: "یہاں صرف گناہ کی نفی مراد ہے کسی اور چیز کی نہیں۔ اس کی ایک دلیل ابو داؤد کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ: "کوئی حرج نہیں مگر اس شخص پر جس نے کسی مسلمان کی عزت کو بطور ظلم پامال کیا، پس یہی ایسا شخص ہے جو حرج میں واقع ہوا اور ہلاک ہوا۔" یہ حدیث بآواز بلند پکار کر کہتی ہے کہ یہاں صرف گناہ کی نفی مقصود ہے۔ کیونکہ سلف و خلف میں سے کوئی شخص اس کا قائل نہیں کہ کسی مسلمان کی عزت پامال کرنے پر دم لازم آتا ہے۔ شیخ کوکب میں ارشاد نبوی: "ارم ولا حرج" (اب رمی کر لو، اور کوئی مضائقہ نہیں) کے ذیل میں فرماتے ہیں: "اس سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے جو ان امورِ ثلاثہ میں عدم ترتیب کے قائل ہیں، کیونکہ "لا" نفی جنس کے لئے ہے جس سے تمام اقسام حرج کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ایسی چیزوں کو حرج شمار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے

ونزّل الناس منازلهم

ترجمہ: اور آپ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں اتارا (کہ ہر قبیلے کیلئے جائے قیام تجویز فرمائی)

جب خطبہ سنا اور انہیں احکام کا علم ہوا تب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے خلاف عمل کر چکے ہیں۔ اور یہ خیال ان کے لئے بے چینی کا باعث ہوا کہ اندریں صورت انہیں اپنے حج سے بجز بار گناہ کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اور قضا کے واجب ہونے میں انہوں نے حرج محسوس کیا۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے دفع کیا، کہ جس چیز کا تمہیں اندیشہ ہے (کہ ان غلطیوں کی وجہ سے قضا لازم ہو گی) اس سے کوئی حرج لاحق نہیں ہوا (یعنی نہ تم گناہ گار ہوئے۔ نہ ان افعال کی قضا لازم ہے) رہا وجوب دم کا مسئلہ؟ تو وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے، جس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ لہٰذا اس پر عمل ہو گا"

اور ابن عباسؓ کی یہ حدیث اوجز میں طحاوی اور ابن ابی شیبہ کے حوالے سے متعدد طرق کے ساتھ مذکور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان آئمہ عظام پر تعجب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "افعل ولا حرج" (کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کر لو) سے استدلال کرتے ہوئے ان افعال اربعہ میں تو وجوب ترتیب کے قائل نہیں لیکن رمی جمرات میں ترتیب کو واجب کہتے ہیں حالانکہ جمرۂ اولیٰ سے پہلے جمرۂ وسطیٰ کی رمی کرنا بھی تقدیم و تاخیر میں داخل ہے۔ مگر یہاں وہ افعل ولا حرج کو نہیں لیتے۔

مہاجرین و انصار کیلئے منازل کی تعیین

اور آپؐ نے لوگوں کو ان کی قیام گاہوں میں اتارا ـــــ کہ ہر قبیلے کے لئے جائے قیام تجویز فرمائی)

یہ حدیث ابوداؤد میں ان الفاظ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں لوگوں کو خطبہ دیا اور انہیں ان کی قیام گاہوں میں اتارا، چنانچہ قبلہ کی داہنی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "مہاجرین یہاں اتریں" اور قبلہ کی بائیں جانب اشارہ کر کے فرمایا "اور انصار یہاں فروکش ہوں۔ اور دوسرے لوگ ان کے ارد گرد قیام کریں" ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں ہمیں خطبہ دیا۔ پس ہمارے کان کھل گئے۔ یہاں تک کہ جو بھی ارشاد فرماتے ہمیں اپنی اپنی جگہ سنائی دے رہا تھا۔ پھر آپؐ لوگوں کو حج کے مسائل سکھانے لگے، یہاں تک کہ رمی جمرات کے بیان تک پہنچ گئے، پھر آپؐ نے اپنی دونوں انگشتانِ شہادت (کانوں میں) رکھ کر (بلند آواز سے) فرمایا

اتنی کنکری ہو جو انگلی پر رکھ کر پھینکی جاتی ہے، پھر مہاجرین کو حکم دیا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب فروکش ہوئے۔ اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اترے"
شیخ قدس سرہ پہلی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "ان کو اتارا" یعنی ان کیلئے متعین کیا۔ "قبلہ کی دائیں جانب" یعنی جب تم قبلہ کی جانب منہ کر کے کھڑے ہو تو جو جانب تمہارے دائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ "قبلہ کی دائیں جانب" ہے۔ اور جو تمہارے بائیں ہاتھ واقع ہوگی وہ قبلہ کی بائیں جانب ہوگی اور اگلی حدیث میں آئے گا کہ مہاجرین کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی اگلی جانب اترے اور انصار کو حکم فرمایا تو وہ مسجد کی پچھلی جانب اترے (اس کے بعد پھر دوسرے لوگ اترے) ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہوگی کہ مہاجرین میمین قبلہ کی جانب مسجد کے اگلے حصہ میں اترے اور انصار قبلہ کی بائیں جانب مسجد کے پچھلے حصہ میں: "پھر اور لوگ" یعنی مہاجرین وانصار کے علاوہ جو اور لوگ ہیں وہ ان کے گرد اترے،" آپ نے ان کی فرودگاہیں اس لئے معین کیں تاکہ ان (کے مختلف قبائل) کا اختلاط نہ ہو، اور تاکہ ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ اور انہیں اپنی ضروریات میں تنگی پیش نہ آئے۔" اھ

پھر یہاں یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ ان کے منازل کی تعیین خطبہ کے بعد ہوئی، یا خطبہ سے پہلے؟ اور اس اختلاف کا حل اس کے سوا ممکن نہیں جو پہلے بھی کئی بار گذر چکا ہے کہ آپؐ کا خطبہ ان ایام میں کئی بار ہوا۔ اور بار بار تعلیم فرمائی اس لئے یہ کہا جائے گا کہ منازل کی تعیین ایک خطبہ کے بعد اور دوسرے خطبہ سے پہلے ہوئی ہے

یہاں اس پر بھی تنبیہ ضروری ہے کہ امام بخاری نے عمرۂ تنعیم کے باب میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ سراقہ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمرۂ عقبہ کے پاس ملے، جب کہ آپؐ اس کی رمی کر رہے تھے، تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ آپؐ ہی لوگوں کے لئے خاص ہے، فرمایا: "نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔" اھ۔ مگر آپ کی سعی کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ یہی سوال انہوں نے مروہ کے پاس کیا تھا۔ تفصیل وہاں گذر چکی ہے۔

ثم انصرف الی المنحر۔ فنحر ثلاثا وستین

ترجمہ:۔ پھر منحر (قربان گاہ) کی طرف گئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسیٹھ اونٹ نحر (ذبح) کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربان گاہ

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم منحر (قربان گاہ) کیطرف گئے۔ یہ منیٰ میں ایک معروف جگہ ہے یوں منیٰ کی ساری زمین قربانی کی جگہ ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ ابن التین کہتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ جمرۂ اولیٰ کے قریب ہے جو مسجد کے متصل ہے۔ یہ تو زرقانی میں ہے۔ اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمرۂ عقبہ کے قریب تھی، اور یہ جو جمرۂ وسطیٰ کے قریب مسجد کی صورت میں مشہور ہے۔ اور جسے عوام مسجد نحر کہتے ہیں اس کی کچھ اصل نہیں بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کی جگہ آپؐ کی قیام گاہ ہی میں تھی، مسجد خیف کے قریب اور قبلۂ مسجد خیف سے آگے"۔

آنحضرتؐ نے کتنے اونٹ خود ذبح کئے

پس آپ نے عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے مطابق اپنے دست مبارک سے ترسیٹھ اونٹ نحر (ذبح) کئے۔ کذا فی الہدی۔ اور زرقانی کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ترسیٹھ اونٹ ذبح کرکے اپنی عمر مبارک کے کُل سالوں کی تعداد کا قصد کیا۔ چنانچہ عمر مبارک بھی ۶۳ سال تھی، پس ہر سال کے مقابلہ میں ایک اونٹ ہوا۔ یہ بات قاضی عیاض نے نقل کی۔ بعدازاں زرقانی کہتے ہیں: "ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپؐ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ اور ان کی تعداد ۶۳ تھی۔ جیسا کہ ترمذی نے روایت کیا ہے: اور سو میں سے باقی ماندہ کے ذبح کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا"۔ اور مرقات میں قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ "بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف وہی اونٹ ذبح کئے جو آپؐ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ اور سو میں سے باقی ماندہ جو حضرت علیؓ کے ساتھ یمن سے آئے تھے، وہ حضرت علیؓ کو عطا کر دئے"۔ اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے کتنے اونٹ ذبح کئے۔ چنانچہ بخاری کی اُس حدیث سے، جو حضرت انسؓ سے مروی ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے سات اونٹ ذبح کئے، اور علماء کے یہاں معروف اور راجح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر مبارک کے سالوں

کی تعداد کے مطابق ۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کئے تھے۔ شیخ ابن قیمؒ الہدی میں کہتے ہیں کہ آپ نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے۔ اور بقیہ کے ذبح کرنے کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تھا۔
پس اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کرو گے جو صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے سات اونٹ ذبح کئے۔" اس کے جواب میں ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی حدیث کی تین توجیہیں ہوسکتی ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی سات سے زیادہ اونٹ بدست خود ذبح نہ کئے ہوں جیسا کہ حضرت انسؓ کا بیان ہے، البتہ ایسا ہوا کہ سات کے بعد ۶۳ تک تو آپؐ نے اپنے سامنے ذبح کرائے، اور پھر وہاں سے تشریف لے گئے اور باقی ماندہ کے ذبح کرنے کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا۔ دوم یہ کہ حضرت انسؓ نے صرف سات ہی کو ذبح ہوتے دیکھا ہو، اور حضرت جابرؓ نے ۶۳ کو، اور ہر شخص نے اپنے اپنے مشاہدہ کو بیان فرمایا۔ سوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات اونٹ تو بلا شرکت غیر ذبح کئے، انہی کو حضرت انسؓ نے بیان کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ نے آپکے ساتھ نیزہ پکڑا، اور دونوں نے مل کر ۶۳ تک ذبح کئے، چنانچہ عروہ بن حارث کندی، کہتے ہیں کہ انہوں نے اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ نے نیزہ اوپر کی جانب سے پکڑا اور حضرت علیؓ کو نیچے کی طرف سے پکڑنے کا حکم فرمایا، پھر دونوں نے مل کر اونٹ ذبح کئے" اور ۶۳ کے بعد سو تک حضرت علیؓ نے تنہا ذبح کئے، جیسا کہ حضرت جابرؓ کا بیان ہے اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کروگے جو امام احمدؒ اور ابو داؤد نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹ ذبح کر لئے تو مجھے حکم فرمایا، باقی میں نے ذبح کئے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے، دراصل حضرت علیؓ کے ذبح کردہ اونٹوں کی تعداد کو راوی نے غلطی سے الٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔
اگر کہا جائے کہ تم عبداللہ بن قُرط کی حدیث کا کیا کرو گے جس میں یوں آتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پانچ اونٹ لائے گئے، پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھنے لگے کہ آپؐ کس سے ابتداء فرماتے ہیں"۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم اسے قبول کرکے اس کی تصدیق کرتے ہیں، دراصل سو اونٹ یکبارگی ہی آپؐ کے پاس نہیں لائے گئے تھے، بلکہ گروہ در گروہ لائے جاتے تھے، ان میں سے ایک گروہ پانچ نفری تھا۔ اور یہی گروہ تھا جن میں سے ہر ایک آگے بڑھ کر یہ چاہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اس سے بسم اللہ کریں"۔ ابن قیمؒ کی تقریر مختصراً ختم ہوئی۔

اور ہمارے شیخ قدس سرہٗ نے حضرت علیؓ اور حضرت جابرؓ کی حدیث میں متعدد وجوہ سے تطبیق دی ہے۔ ان میں سے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳۰ کسی کی اعانت کے بغیر ذبح کئے اور ۶۳ حضرت علیؓ کی شرکت کے ساتھ۔ اور باقی ماندہ حضرت علیؓ نے ذبح کئے۔" میں کہتا ہوں یہ جواب میرے نزدیک سب سے عمدہ ہے، کہ اس میں حضرت علیؓ کی روایت کو غلط کہنے اور راوی پر لفظ کے الٹ جانے کا دعویٰ کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں سات کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ یہ سات وہی ہیں جن کا ذکر عبداللہ بن قرطؓ کی حدیث میں، جو بحوالہ احمد و ابوداؤد اوپر گذری، یوں آیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنا چاہتا تھا، کہ آپ کس سے ابتدا کرتے ہیں؟ اوائی خصوصیت کی بنا پر انہیں الگ ذکر کیا، اور عبداللہ بن قرطؓ کی اس حدیث میں امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے "پانچ یا چھ" کا لفظ شک راوی کے ساتھ ذکر کیا ہے، پس بعید نہیں کہ وہ سات ہوں۔ اور مغنی میں موفق کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبداللہ بن قرطؓ کی حدیث میں ذکر شدہ پانچ اونٹوں کو حضرت جابرؓ کی حدیث کے سو اونٹوں کے علاوہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں کہ قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے، لکھتے ہیں: "اصحاب رائے کہتے ہیں کہ صدقہ جتنا زیادہ ہو بہتر ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے سو اونٹ ذبح کئے اور ہر اونٹ سے گوشت کا ٹکڑا لینے کا حکم فرمایا، اور پھر ان سب کا شوربا نوش فرمایا۔ اور آپ نے پانچ اونٹ ذبح کئے اور فرمایا جو چاہے ان کا گوشت کاٹ کر لے جائے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں: "اور آپ نے ان میں سے کچھ نہیں کھایا۔" اھ موفق کے ان دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ وہ پانچ اونٹوں والی حدیث کو قصۂ حجۃ الوداع کے علاوہ کسی اور موقعہ پر محمول کرتے ہیں۔" حاشیۂ لامع کا مضمون ختم ہوا۔

سات اونٹوں کی تخصیص کی وجہ

اور اس ناکارہ کے نزدیک جیسا کہ ابھی گذرا ان پانچ یا سات علی اختلاف روایات۔ کی تخصیص کی سب سے عمدہ توجیہ وہی ہے جس کی طرف ابوداؤد کی روایت میں یوں اشارہ کیا گیا ہے: "ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا تھا کہ آپ سب سے پہلے کس سے ابتدا فرماتے ہیں؟" اردو شاعر نے خوب کہا ہے۔

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں پر اوّل سب سے
دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر؟

اور فارسی شاعر نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے: ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف   بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد (امیر خسرو)

نیز:ـــــــــ ہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (عراقی)

قربانی کی جھول اور کھال کے صدقہ کا حکم

(ق)" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ انکی جھول، چمڑے اور گوشت مساکین پر صدقہ کر دیں، اور یہ بھی فرمایا کہ قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز نہ دیں، اور فرمایا کہ اجرت ہم اپنے پاس سے دیں گے، اور فرمایا کہ جس کا جی چاہے گوشت کاٹ کر لے جائے" اھ

قصاب کو اس میں سے اجرت نہ دی جائے

اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ بغوی کہتے ہیں "جب قصاب کو اجرت پوری دے دی جائے اور پھر اگر وہ فقیر ہو تو اس پر صدقہ کر دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں" اور بغوی کے علاوہ دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ قصاب کو اس کی اجرت میں گوشت دینا ممنوع ہے، کہ یہ معاوضہ ہے۔ اور بطور صدقہ یا ہدیہ کے دینا از روئے قیاس جائز ہے، لیکن شارع کے مطلقاً منع کرنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کو صدقہ کے طور پر دینا بھی ممنوع ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اجرت میں رعایت کرنے کا احتمال ہے، بالآخر یہ بھی معاوضہ ہی کی صورت ہو جائے گی۔ اور صرف حسن بصریؒ اور عبداللہ بن عبیدؒ نے اس کی رخصت دی ہے"

آنحضرتؐ نے شوربا نوش فرمایا

(ش) اور مشکوٰۃ میں مسلم وغیرہ کی جو طویل حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے اس میں ہے "حضرت علیؓ کو حکم فرمایا انہوں نے باقی ماندہ اونٹ ذبح کئے، پھر حکم فرمایا کہ ہر قربانی کا ایک ایک ٹکڑا لیا جائے۔ چنانچہ ان کو ہنڈیا میں پکایا گیا۔ پس دونوں حضرات نے ان کا گوشت کھایا اور شوربا نوش کیا"

ہدی کے کن کن جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے

نوویؒ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ نفل کی ہدی اور قربانی سے کھانا مستحب ہے علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ ہر ایک قربانی سے کھانا سنت ہے، اور سو قربانیوں کو الگ الگ پکانے میں زحمت تھی۔ اس لئے سب کو ایک ہی ہنڈیا میں ڈال دیا گیا۔ تاکہ آپؐ اس مجموعہ کے شوربے کو جس میں ہر ایک کا جز ہے، نوش فرما سکیں، اور شوربے میں جو گوشت ہے اسے بقدر ضرورت تناول فرما سکیں۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ نفلی ہدی اور قربانی سے کھانا سنت ہے واجب نہیں" اھ۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے موفق نے المغنی میں اور صاحب ہدایہ نے استدلال کیا ہے کہ تمتع اور قران

کی ہدی سے کھانا مستحب ہے۔ یہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل اوجز میں ان کی کتب فروع سے نقل کی گئی ہے، اور اس کا خلاصہ حاشیۂ لامع میں ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "جن ہدایا کا گوشت کھایا جاسکتا ہے ان کے بیان میں ناقلین مذاہب کا اختلاف ہے جس کی تفصیل اوجز میں ذکر کی گئی ہے۔ اور اس میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ گذشتہ عبارتوں سے واضح ہوا کہ حنابلہ کے نزدیک دم تمتع، دم قران اور دم تطوع کے علاوہ کسی کا کھانا جائز نہیں۔ یہی قول حنفیہ کا ہے۔ امام مالکؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ ہر وہ ہدی جو اپنے محل میں پہنچ چکی ہو اس کا کھانا جائز ہے۔ البتہ جزائے صید، فدیۂ اذیٰ، اور نذر مساکین کی ہدی کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن شافعیہ کے نزدیک کسی دمِ واجب کا کھانا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ دم تمتع اور دمِ قِران کا کھانا بھی درست نہیں۔ اور دم تطوع کا کھانا جائز ہے۔ مگر کچھ گوشت کا صدقہ کرنا بھی واجب ہے۔" اھ

کیا حجۃ الوداع میں ابوجہل کا اونٹ نحر کیا گیا

کیا ان سو اونٹوں میں ابوجہل کا اونٹ بھی تھا؟ جیسا کہ ترمذی شریف کے "باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں حضرت جابرؓ سے اس کی تصریح منقول ہے۔ اور مؤطا امام مالکؒ کے الفاظ بروایت عبداللہ بن ابی بکرؒ بن حزم یہ ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج یا عمرہ میں ابوجہل کا اونٹ ہدی کیا تھا" اور اوجز میں ہے کہ یہ راوی کا شک ہے، اور ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال من جملہ اور ہدایا کے ابوجہل کا اونٹ بھی ذبح کیا تھا، اس کے ناک میں چاندی کی نکیل تھی"، اور ترمذی نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج کئے، دو ہجرت سے پہلے، اور ایک ہجرت کے بعد جس کے ساتھ عمرہ بھی تھا۔ آپ اپنے ساتھ ۶۳ اونٹ لے گئے تھے۔ اور باقی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے لائے تھے، ان میں ابوجہل کا اونٹ بھی شامل تھا"؛ صاحب عارضۃ الاحوذی وغیرہ نے اس اختلاف سے سکوت اختیار کیا، اور شیخ کوکب میں فرماتے ہیں: "یہ صحیح نہیں کیونکہ ابوجہل کا اونٹ عمرۂ حدیبیہ میں ذبح فرمایا تھا اور اگر یہاں نہیں تو عمرۂ قضا میں۔ اور وہ اتنی مدت زندہ نہیں رہا کہ اسے حجۃ الوداع میں ذبح کرنے کی نوبت آتی۔ جس میں آپ نے سو اونٹ قربان کئے تھے۔" اھ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے کیونکہ عام اہل سِیَر، ابن اسحٰقؒ، ابن ہشام اور ابن کثیر

(قلت) وذبح عن نسائه بقرة

ترجمہ: (ش) اور آپ نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔

نے "البدایہ والنہایہ" میں ابوجہل کے اونٹ کی قربانی کا قصہ عمرۂ حدیبیہ میں ذکر کیا ہے حجۃ الوداع میں نہیں۔ چنانچہ زاد المعاد میں قصہ حدیبیہ کے فوائد کے ضمن میں لکھا ہے: "من جملہ ان کے اللہ کے دشمنوں کو غیظ دلانے کا استحباب ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے جانوروں میں ابوجہل کا اونٹ بھی قربان کیا" اور شیخ قدس سرہ نے اپنے اس قول میں کہ "اگر یہاں نہیں تو عمرۂ قضاء میں" اس قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ اونٹ بھاگ گیا تھا چنانچہ الخمیس میں ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۂ حدیبیہ میں من جملہ اور ہدایا کے ابوجہل کا اونٹ بھی ہدی کیا تھا۔ یہ آپ کو غزوۂ بدر کی غنیمت میں حاصل ہوا تھا۔ مروی ہے کہ ابوجہل کا یہ اونٹ بھاگ کر مکہ مکرمہ چلا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارندے اس کے تعاقب میں گئے، سفہاء قریش نے ارادہ کیا کہ اسے واپس نہ کیا جائے، مگر سہیل بن عمرو نے، جس نے عمارت صلح کا سنگ بنیاد رکھا تھا، انہیں اس سے منع کیا، چنانچہ (وہ) واپس لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نحر کیا"۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے۔

صاحب خمیس نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے سالوں کی تعداد کے مطابق ۶۳ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے، اور حیوۃ الحیوان میں ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں ۶۳ اونٹ ذبح کئے اور ۶۳ غلام آزاد کئے" اھ

ازواج مطہرات کی طرف سے گائے ذبح کرنا اور اس میں اشکال

(ش) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ ابوداؤد کے لفظ بروایت ابوہریرہؓ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ازواج مطہرات کی جانب سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا، ایک گائے ذبح کی جو ان کے مابین مشترک تھی"۔ اس پر مشہور اشکال ہے کہ ازواج مطہرات تو نو تھیں، ایک گائے ان سب کی طرف سے کیسے کافی ہوگئی؟ اوجز میں اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ اور اس کا خلاصہ لامع کے حاشیہ میں ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: "اور میرے نزدیک سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی جانب سے الگ گائے ذبح کی تھی جیسا کہ مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت سے مفہوم ہوتا ہے اور بقیہ ازواج کی جانب سے ایک گائے تھی، جو ابو داؤد کی روایت میں مذکور ہے حضرت عائشہؓ ان میں داخل نہیں تھیں۔ کیونکہ ابو داؤد کے الفاظ: "ان ازواج کی طرف سے جنہوں نے عمرہ کیا تھا" اس سے مانع ہیں، کیونکہ حضرت عائشہؓ ہمارے نزدیک مفرد بالحج تھیں۔ البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو خارج کر کے بھی تو ازواج مطہرات کی تعداد آٹھ ہوتی ہے، میرے نزدیک بعید نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ کو حضرت عائشہؓ کی گائے میں شریک کر دیا ہو۔ کیونکہ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے رکھی تھی۔ اس توجیہ کے مطابق حضرت عائشہؓ کی حدیث پر شذوذ کا حکم کرنے کی حاجت نہیں رہتی، جیسا کہ حافظؒ نے کہا ہے اور ابن حزمؒ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ دیگر ازواج مطہرات کے ساتھ شریک نہیں تھیں۔ کیونکہ دیگر ازواج کا تمتع تھا۔ اور حضرت عائشہؓ کا قران۔ اور قران والے پر ابن حزمؒ کے نزدیک ہدی لازم نہیں۔

ابن قیمؒ اس پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ مسلک فاسد ہے جس میں ابن حزمؒ تمام لوگوں سے متفرد ہیں، کیونکہ صحابہؓ، تابعینؒ اور ما بعد کے تمام حضرات اس پر متفق ہیں کہ قارن پر ہدی لازم ہے، جس طرح کہ متمتع پر لازم ہے" میں کہتا ہوں حضرت عائشہؓ کا قارن ہونا ان کے مسلک پر مبنی ہے ورنہ ہمارے نزدیک مفرد بالحج تھیں۔ یہ بحث احرام عائشہؓ کے بیان میں پہلے گذر چکی ہے، بعد ازاں ابن قیمؒ نے طویل کلام میں اصل اشکال کا جواب دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ روایات جن میں سات کی شرکت کا ذکر ہے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحت میں بھی فائق ہیں۔ اور زرقانی نے شرح مواہب میں ان روایات پر خوب بسط سے لکھا ہے، اور نسائی کی اس روایت کو جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، ترجیح دی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے حج کے سال ہماری جانب سے ایک ایک گائے ذبح کی تھی" اور حافظؒ نے جو اس حدیث پر شذوذ کا حکم کیا ہے اس پر زرقانیؒ نے تعقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حدیث عائشہؓ کا راوی عمار الدہنی مسلم اور سنن اربعہ کا راوی ہے اس کی زیادتی مقبول ہوگی کہ جو لفظ دوسرے نے یاد نہیں رکھا وہ اس نے یاد رکھا۔ اور اس راوی کی زیادتی دوسرے راویوں کے خلاف بھی نہیں کیونکہ معمر کی روایت میں جو الفاظ ہیں کہ آپ نے صرف گائے ذبح کی"

اس سے مراد جنس ہے، مطلب یہ کہ اونٹ اور بکری کی قربانی نہیں کی بلکہ صرف گائے کی قربانی کی تھی۔ اسلئے یہ اس صریح روایت کے خلاف نہیں۔ جس میں ہر ایک کی جانب سے گائے ذبح کرنے کا ذکر آتا ہے۔ اور شذوذ کا حکم تو جب کیا جاسکتا ہے جب کہ دو روایتوں میں تطبیق ممکن نہ ہو۔ اور یہاں ممکن ہے الخ حاصل یہ کہ زرقانی کا رجحان اس طرف ہے کہ تمام ازواج کی جانب سے ایک ایک گائے ذبح کی انتہی مختصراً۔

نحر کی جگہ ذبح اور ذبح کی جگہ نحر اس حدیث میں چند بحثیں ہیں۔ جن کی تفصیل اوجز میں ہے۔ ایک یہ کہ روایات میں ذبح اور نحر دونوں الفاظ آتے ہیں۔ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ قابل ذبح جانور کا نحر، اور قابل نحر جانوروں کا ذبح جائز ہے یا نہیں؟ موفق کہتے ہیں: "اہل علم کے درمیان اس امر میں تو اختلاف نہیں کہ اونٹ کا نحر مستحب ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مویشیوں کا ذبح ۔ رہا اونٹ کا ذبح اور دیگر مویشیوں کا نحر؟ تو جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ اور داؤد ظاہری سے منقول ہے کہ اونٹ نحر کے بغیر اور دیگر جانور ذبح کے بغیر حلال نہیں ہوں گے" انتہی مختصراً۔ امام مالکؒ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اونٹ کا نحر واجب ہے، جیساکہ اوجز میں دردیر اور دسوقی کا قول مفصل مذکور ہے۔

ہدی میں اشتراک: بحث دوم ایک بحث یہ ہے کہ ہدایا میں اشتراک جائز ہے یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک جائز ہے اور مالکیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ چنانچہ مؤطا میں ہے کہ "امام مالک فرماتے ہیں کہ انہوں نے بعض اہل علم سے سُنا ہے کہ ایک بَدَنَہ (اونٹ یا گائے) میں مرد اور عورت دونوں شریک نہ ہوں۔ بلکہ ہر ایک کو الگ بَدَنَہ کی ہدی کرنی چاہئے" اور دردیر کہتے ہیں: "ہدی خواہ واجب ہو یا تطوع، اس میں اشتراک صحیح نہیں۔ نہ ذات میں نہ اجر میں، اگر دو افراد نے اشتراک کیا تو دونوں کی ہدی جائز نہیں ہوئی" اھ دسوقی کہتے ہیں: "پس ہدی کا معاملہ قربانی سے مختلف ہے کہ قربانی کے اجر میں اشتراک صحیح ہے الخ" پوری تفصیل اس میں دیکھی جائے۔

بحث سوم: یہ گائے ہدی کی تھی یا قربانی کی روایات میں دونوں الفاظ وارد ہیں، جن کی تفصیل اوجز میں ہے، حافظ فرماتے ہیں: "بظاہر یہ راویوں کا تصرف ہے، کیونکہ ابوہریرۃؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ گائے ان ازواج کی جانب سے ذبح کی گئی جنہوں نے عمرہ کیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کی روایت قوی ہو جاتی ہے، جنہوں نے ہدی کا لفظ

روایت کیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ یہ ہدی تمتع کی تھی۔ اور اس میں امام مالکؒ کے اس قول کے خلاف کوئی دلیل نہیں کہ "اہل منیٰ کے ذمہ قربانیاں نہیں" ان کے علاوہ اور بھی بحثیں ہیں جن کی تفصیل اوجز میں ہے،

حجۃ الوداع میں آپ نے بکری بھی ذبح کی یا نہیں؟

یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر بکریاں بھی ذبح کی تھیں یا نہیں؛ چنانچہ حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث سے، جو آگے آتی ہے، بظاہر اثبات معلوم ہوتا ہے، شیخ ابن قیمؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر کہا جائے کہ تم اس حدیث کا کیا کروگے جو صحیحین میں حضرت ابو بکرہؓ سے مروی ہے اور جس میں منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ یوم النحر کا ذکر ہے اور اس کے آخر میں بروایت مسلم یہ لفظ ہیں: "پھر آپ لوٹ کر آئے دو سیاہ مینڈھوں کی طرف، پس ان کو ذبح کیا۔ اور بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرف، پس اس کو ہمارے درمیان تقسیم فرمایا" اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت انسؓ کی حدیث سے، جو صحیح بخاری کے متعدد مواضع میں مروی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ کا واقعہ ہے:

جواب یہ ہے کہ لوگوں نے اس سلسلہ میں دو طریق اختیار کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس موقعہ پر حضرت انسؓ کا بیان صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دو مینڈھے ذبح کئے تھے۔ اور یہ کہ آپ عید کی نماز سے فارغ ہوکر دو مینڈھوں کی طرف لوٹے، چنانچہ حضرت انسؓ نے مکہ میں اونٹ ذبح کرنے اور مدینہ میں مینڈھے ذبح کرنے کے واقعہ کو ایک دوسرے سے ممیز کرکے بیان کیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے ہیں، اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جتنے حضرات نے منیٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا ذکر کیا ہے انہوں نے صرف اونٹوں کا نحر ذکر کیا ہے، یہی ہدی آپ ساتھ لے کر گئے تھے۔ اور ان کا نحر کرنا افضل تھا۔ بجائے اس کے کہ جو بکریاں آپ ساتھ نہیں لے گئے انہیں ذبح کرتے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے قصۂ حجۃ الوداع میں ذکر کیا ہے کہ "آپ رمی کرکے واپس ہوئے تو اونٹوں کا نحر کیا" دراصل بعض راویوں کو اس میں اشتباہ ہوگیا۔ چونکہ مینڈھوں کے ذبح کرنے کا واقعہ عید کے دن کا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے خیال کرلیا کہ یہ منیٰ کا واقعہ ہے۔ دوسرا طریقہ ابن حزم اور ان کے ہم مسلک لوگوں کا ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور دونوں عمل جدا جدا ہیں۔ حضرت ابو بکرہؓ نے مکہ کی قربانی کا ذکر کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے مدینہ کی قربانی کا ــــ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے یوم النحر میں بکریوں کو ذبح کیا۔ اور گائے اور اونٹوں کا نحر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی دی تھی، یہ صحیحین میں ہے اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر میں حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح کی تھی، اور سنن میں ہے کہ آپ نے آل محمد کی جانب سے ایک گائے نحر کی تھی۔ ابن حزم کا مذہب ہے کہ حاجی کے لئے ہدی کے ساتھ قربانی بھی مشروع ہے۔ اور صحیح۔ انشاء اللہ پہلا طریقہ ہے۔ اور حاجی کے لئے ہدی مقیم کی قربانی کا حکم رکھتی ہے، کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل نہیں کیا نہ آپکے صحابہ کرامؓ سے، کہ انہوں نے ہدی اور قربانی کو جمع کیا ہو، بلکہ ان کی ہدی یہی قربانی تھی۔ پس یہ منیٰ میں ہدی ہے اور دوسری جگہ میں قربانی۔ رہا حضرت عائشہؓ کا یہ بیان کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی تو اس میں ہدی پر قربانی کا اطلاق کیا گیا ہے" ابن قیمؒ کا کلام ختم ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوبکرہؓ کی یہ حدیث امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نوجگہ روایت کی ہے کہیں مختصر کہیں مطول۔ مگر اسی کے کسی طریق میں مینڈھوں کے ذبح کرنے کا ذکر میں نے نہیں دیکھا۔ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں: "قاضی کہتے ہیں کہ دارقطنی نے کہا ہے کہ راوی کا یہ قول "پھر آپؐ لوٹے الخ" یہ ابن عون کا وہم ہے، دراصل یہ جملہ ابن سیرین نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے، مگر ابن عون نے اسے ابن سیرین کی سند سے ابوبکرہ کی اس حدیث میں ذکر کر دیا۔ قاضی کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث ابن عون سے روایت کی ہے مگر اس میں یہ فقرہ ذکر نہیں کیا، غالباً انہوں نے اسے عمداً ترک کر دیا ہے۔ اور یہی حدیث مسلم شریف کی کتاب الدیات میں ایوب اور قرہ نے ابن سیرین سے روایت کی ہے انہوں نے بھی یہ زائد فقرہ نقل نہیں کیا، قاضی کہتے ہیں کہ بظاہر زائد فقرہ خطبۂ عید الاضحیٰ کے سلسلہ میں کسی اور حدیث کا تھا، مگر راوی کو وہم ہوا اور اس نے اس کو خطبۂ حج میں ذکر کر دیا۔ یا یہ دو حدیثیں تھیں جو ایک دوسری میں ملا دی گئیں۔ امام مسلمؒ نے "الضحایا" میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث بروایت ایوب وہشام عن ابن سیرین روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (عید کی) نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پس حکم دیا کہ جو لوگ نماز سے پہلے قربانی کر چکے ہیں (ان کی قربانی صحیح نہیں ہوئی اس لئے) وہ دوبارہ قربانی کریں۔ اس حدیث کے آخر میں ہے "پھر آپ لوٹ کر گئے دو سیاہ مینڈھوں کی طرف الخ" پس یہی صحیح ہے اور اس سے اشکال رفع ہو جاتا ہے" انتہیٰ۔

: قال، فلما اکمل نحرہ استدعی بالحلاق،

ترجمہ: پس جب نحر کا عمل پورا کر لیا تو حلاق کو طلب فرمایا،

کیا مسافر اور حاجی کے ذمہ قربانی واجب ہے

اور حاجی کی قربانی کا مسئلہ اختلافی ہے، چنانچہ لامع کے حاشیہ میں ہے کہ عینی کہتے ہیں: "کیا مسافر کے ذمہ بھی قربانی واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ یہ سب لوگوں کے لئے سنت ہے۔ منیٰ میں حاجی پر بھی۔ اور امام مالکؒ کا قول ہے کہ اس کے ذمہ قربانی نہیں۔ اور سوائے منیٰ میں حج کرنے والے کے کسی کو اس کے ترک کرنے کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں۔" اھ اور موفق "کتاب الحج" میں کہتے ہیں: "جب یوم النحر میں جمرۂ عقبہ کی رمی سے فارغ ہو تو ٹھہرے نہیں، بلکہ فوراً واپس آ جائے، اب سب سے پہلے جو کام اسے کرنا ہے وہ ہدی کا نحر ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہدی ہو، خواہ واجب ہو یا نفل کی۔ پس اگر ہدی ساتھ نہ لایا ہو، اور اس کے ذمہ ہدی واجب ہو تو خرید لے اور اگر اس کے ذمہ واجب نہیں تو بہتر ہے کہ قربانی کا جانور خرید کر قربانی کرے۔" انتہیٰ

اونٹ اور گائے میں صحابہ کا اشتراک

اور صحابہؓ نے گائے اور اونٹوں میں شرکت کی تھی: صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ "ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ پس ہم نے اونٹ کا سات آدمیوں کی جانب سے نحر کیا اور گائے بھی سات کی جانب سے ذبح کی۔" امام مسلمؒ نے اس مضمون کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔

حلاق کے نام میں اختلاف

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا عمل پورا کر لیا تو حلاق کو طلب فرمایا۔ شیخ ابن قیمؒ کی تصریح کے مطابق یہ معمر بن عبداللہ بن حنظلہ بن عوف تھے۔ اور بذل میں ہے کہ "نوویؒ کہتے ہیں کہ حلاق کے نام میں اختلاف ہے، پس صحیح اور مشہور یہ ہے کہ ان کا نام معمر بن عبداللہ عدوی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ معمر بن عبداللہ تھے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا نام خراش بن امیہ بن ربیعہ الکلبی ہے۔" اھ اور زرقانی نے شرح مواہب میں ان دونوں ناموں پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور دونوں کے بارے میں روایات نقل کی ہیں۔ اور پہلا نام معمر بن عبداللہ بن نضلہ ذکر کیا ہے، یعنی "حنظلہ" کے بجائے "نضلہ"۔ اور حافظؒ نے بھی فتح میں "نضلہ" ہی ذکر کیا ہے۔ پس "البدی" میں حنظلہ کا لفظ تصحیف ہے اور زرقانی نے اس کو بفتح نون اور سکون

فحلق رأسه وقسم شعره۔

ترجمہ: پس اس نے آپ کا سر کا حلق لیا۔ اور اپنے موئے مبارک تقسیم فرما دیئے۔

ضاد کے ساتھ ضبط کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ بڑی عمر کے صحابی تھے، مہاجرین حبشہ میں شامل تھے۔ اور کہا کہ " ابن السکن کا بیان ہے کہ خراش بن امیہ صرف ایک حدیث کے راوی ہیں۔ اور وہ یہ کہ میں نے عمرۃ القضاء میں مروہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کیا تھا" ابن الکلبی کہتے ہیں کہ انہوں نے عمرۃ القضاء میں حلق کیا تھا یا عمرہ حدیبیہ میں" اھ اور حافظ فرماتے ہیں" حلاق کے نام میں اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ معمر بن عبد اللہ تھے، جیسا کہ بخاریؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ خراشؓ بن امیہ تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خراشؓ نے عمرۂ حدیبیہ میں حلق کیا تھا" اھ ابن ہشام نے عمرۂ حدیبیہ کے بارے میں ابن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری اطلاع کے مطابق آپ کا حلق خراش بن امیہ بن الفضل الخزاعی نے کیا تھا" اھ ——— پس اس نے آپ کے سر کا حلق کیا، اور ناخن تراشے اور لبوں اور رخساروں کے بال لئے۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

موئے مبارک کی تقسیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک تقسیم فرما دیئے۔ جیسا کہ روایات میں معروف ہے اور طبقات میں ہے کہ" آپ نے اپنے موئے مبارک اور ناخنوں کو دفن کرنے کا حکم فرمایا" آھ ممکن ہے پہلے آپ نے دفن کرنے کا حکم فرمایا ہو پھر جب صحابہؓ کا شدید اشتیاق دیکھا کہ وہ موئے مبارک حاصل کرنا چاہتے ہیں تو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ طبقات ہی میں ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حلاق آپ کا حلق کر رہا ہے، اور آپ کے صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جو بال بھی گرے کسی آدمی کے ہاتھ ہی میں گرے۔ الخ اور اگر تطبیق کے لئے یہ توجیہہ نہ کی جائے تو صحیح بخاری کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ (ق) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف روایات کے مطابق ابوطلحہ کو دائیں یا بائیں جانب کے موئے مبارک عطا فرمائے۔ (ش) اس امر میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی جانب ابوطلحہ کو مرحمت فرمائی اور کونسی جانب لوگوں میں تقسیم فرمائی۔ درصورت اول خود ابوطلحہ کو عطا فرمائے یا ان کی اہلیہ ام سلیم کو؟ اس سلسلہ میں شیخین وغیرہ کی روایات مختلف ہیں جیسا کہ شیخ ابن قیمؒ، صاحب البدایہ والنہایہ اور زرقانی نے شرح مواہب میں تفصیل سے ذکر کی ہیں شیخ قدس

سرہٗ نے بذل میں شیخ ابن قیمؒ کے کلام کا خلاصہ ذکر کیا ہے اور میں نے تلخیص بذل میں خلاصہ کا خلاصہ دیا ہے۔ جو بہت ہی مختصر ہے اور وہ اس مختصر کے مناسب ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "اس کا قول: "وہ ابوطلحہ کو دیئے" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "ام سلیم کو دیئے" پس احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کو دیئے ہوں کہ وہ اپنے شوہر ابوطلحہ کو دے دیں۔ غالباً ابوطلحہ اس وقت وہاں موجود نہ ہوں گے۔ بلکہ موئے مبارک کی تقسیم میں مشغول ہوں گے۔ شیخ قدس سرہٗ کا رجحان اسی طرف ہے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپؐ نے ابوطلحہ کو دیئے ہوں تاکہ وہ ام سلیم کے سپرد کر دیں کہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ رہا دائیں، بائیں کا اختلاف! تو شیخ ابن قیم نے اس کو مفصل لکھا ہے۔ ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ مقدسی کا رجحان اس طرف ہے کہ ابوطلحہ کو دائیں جانب عطا فرمائی، اور مقدسی نے اس کو ابن عون کی روایت سے ترجیح دی ہے جو صحیح بخاری میں ان الفاظ سے مروی ہے: "ابوطلحہ پہلے شخص تھے جنہوں نے آپؐ کے موئے مبارک حاصل کئے" اور حافظ ابن قیم کا رجحان یہ ہے کہ ابوطلحہ کو خود ان کی ذات کے لئے بائیں جانب عطا فرمائی تھی۔ اور وہ بخاری کی روایت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابوطلحہ کو دائیں جانب میں سے بھی حصہ ملا تھا۔ اور بائیں جانب تو خاص ان ہی کے لئے مخصوص تھی۔ ابن قیم نے اپنے قول کی تائید میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن میں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب تقسیم فرمائی تھی۔ اور بائیں جانب ابوطلحہ کو ان کی ذات کے لئے عنایت فرمائی تھی۔ اس بنا پر ابن قیمؒ کے نزدیک ابوداؤد کی روایت راجح ہے، جس میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلّاق کو بلایا اس نے آپؐ کے سر کی دائیں جانب کے بال اتارے۔ پس آپؐ اردگرد لوگوں کے درمیان ایک ایک دو دو بال تقسیم فرمانے لگے" الخ اسی طرح شیخ قدس سرہٗ نے بذل میں اس روایت کو اصل قرار دیا ہے۔ اور مسلم شریف کی وہ روایت جس کے الفاظ یہ ہیں: "آپ نے دائیں جانب حلاق کی طرف کی، اس نے دائیں جانب حلق کیا، آپؐ نے ابوطلحہ کو بلا کر یہ بال ان کو دے دیئے۔ پھر حلاق کی طرف بائیں جانب کی اور اسے بال اتارنے کا حکم فرمایا۔ اس نے بائیں جانب کے بال اتارے وہ آپؐ نے ابوطلحہ کو دے کر فرمایا یہ لوگوں میں تقسیم کر دو۔" شیخ نے اس کی یہ توجیہ فرمائی ہے کہ اس روایت میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے، یا یہ کہا جائے کہ "اس کو تقسیم کر دو۔" کی ضمیر قریب کی طرف نہیں بلکہ بعید کی طرف راجع ہے (یعنی جو بال پہلے اتارے گئے تھے ان کو تقسیم کرنے کا حکم فرمایا) پس غور کر لو۔" تلخیص بذل کا مضمون ختم ہوا۔

اور حافظؒ روایات کا کچھ اختلاف ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "اور ان روایات میں تعارض نہیں۔ بلکہ ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ آپؐ نے دونوں جانب کے بال ابوطلحہ کو دیے، دائیں جانب کے تو ابوطلحہؓ نے آپؐ کے حکم سے تقسیم کردیئے اور بائیں جانب کے انہوں نے آپؐ کے حکم سے اپنی بیوی اُم سُلیم کو دے دئے۔ اور امام احمدؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے "تاکہ وہ ان کو اپنی خوشبو میں ڈال لیا کریں"۔ الخ۔

آپؐ کے پسینہ مبارک کی خوشبو

میں کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم سلیم کو خوشبو میں موئے مبارک ڈالنے کا جو حکم فرمایا غالبًا اس کی وجہ وہ روایت ہے جو جمع الوسائل میں صحیح مسلم سے نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اُم سُلیمؓ کے ہاں آرام فرمارہے تھے، آپؐ کو پسینہ آیا، اُم سُلیم آپؐ کا پسینہ صاف کرکے شیشی میں جمع کرنے لگیں، آپؐ بیدار ہوئے تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا کرتی ہو؟ اُم سُلیم نے عرض کیا کہ یہ آپؐ کا پسینہ مبارک ہے، ہم اس کو اپنی خوشبو میں ڈالیں گے۔ اور یہ سب سے عمدہ خوشبو ہے" اھ جب آپؐ کے پسینہ کا یہ حال ہے تو آپ کے موئے مبارک کی عطر بیزی کا کیا پوچھنا!

موئے مبارک کی تقسیم کی حکمت اور ابوطلحہؓ کی تخصیص کی وجہ

اور زرقانی کہتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک صحابہ کرامؓ کے درمیان اس لئے تقسیم فرمائے تاکہ ان کے لئے دائمی برکت کا باعث اور سامان تسلی ہو۔ گویا اس سے قُربِ اجل کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اور ابوطلحہؓ کو موئے مبارک کی تقسیم پر مامور فرمانے میں اسی مضمون کی طرف اشارہ تھا، کیونکہ ابوطلحہ ہی نے آپؐ کی قبر مبارک تیار کی، لحد بنائی، اور اس میں کچی اینٹوں کی چنائی کی۔ اور اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ امام کبیر بعض حضرات کو عطیہ اور ہدیہ وغیرہ کی تقسیم پر مامور کرسکتا ہے" اھ شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "آپ نے وہ موئے مبارک ابوطلحہؓ کو، جو اُم سُلیم والدۂ انس بن مالک کے شوہر تھے۔ عطا فرمائے، اس سے ان حضرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکابر کے بالوں کے ساتھ اور اسی طرح لباس وغیرہ کے ساتھ تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اور یہاں سے یہ نکتہ بھی استنباط کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے معاملہ میں افاضل کی تقدیم ضروری نہیں، چنانچہ

وقسم اظفارہٗ

ترجمہ: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔

اس موقع پر حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور دیگر افاضل صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ مگر جس قدر موئے مبارک ابوطلحہؓ کو عطا فرمائے کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے، البتہ اگر اس سے ان کی کبیدگی کا اندیشہ ہو تو ایسا کرنا مناسب نہیں۔" اھ

حلق نسک ہے یا صرف ممنوع اشیاء کو مباح کرنے کا ذریعہ

پھر حلق نسک (عبادت) ہے یا محض ممنوع اشیاء کو مباح کرنے کے لئے ہے؟ یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ جس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ جمہور علماء پہلی رائے پر ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے "صحیح" میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے "باب الحلق والتقصیر عند الاحلال"، حافظؒ فرماتے کہ امام بخاریؒ اس ترجمۃ الباب سے بتانا چاہتے ہیں کہ حلق عبادت ہے۔ کیونکہ انہوں نے "حلال ہونے کے وقت حلق وتقصیر" کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی حلق خود تحلل نہیں بلکہ حلال ہونے کے وقت کیا جاتا ہے، گویا انہوں نے اس مدعا پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا ثواب کے کام پر ہوتی ہے۔ اور ثواب عبادت پر ہی ہوتا ہے۔ نہ کہ مباحات پر۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلق کو قصر سے افضل قرار دینا بھی اسی طرف مشعر ہے۔ کیونکہ مباحات میں باہمی تفاضل نہیں ہوتا ہے۔ اور جمہور حلق کے عبادت ہونے کے قائل ہیں۔ اور شافعیہ کے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔" اور نوویؒ شرح مہذب میں فرماتے ہیں کہ ابن منذر وغیرہ کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حلق کے عبادت نہ ہونے کے صرف امام شافعیؒ قائل ہیں، اور امام احمد سے بھی ایک روایت ہے۔ اور امام ابویوسفؒ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ موفق کہتے ہیں امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ عبادت نہیں، بلکہ احرام کی بنا پر جو چیزیں ممنوع اور حرام تھیں محض ان کو مباح کرنا ہے۔" انتہی من الاوجز مختصراً۔

آپؐ کے ناخن کی تقسیم

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ناخن تقسیم فرمائے۔ اور "الہدی" میں مسند امام احمد کی روایت سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر کی بائیں جانب کے موئے مبارک ابوطلحہ کو دیئے، پھر ناخن تراشے اور ان کو لوگوں پر تقسیم فرما دیا، اور ایک روایت میں محمد بن زید سے مروی ہے کہ ان کے والد نے ان سے بیان کیا کہ وہ قریش کے ایک آدمی کے ساتھ قربانگاہ

(قلت)، ثم لبس ثيابه وتطيب (قال) ثم افاض الى مكة قبل الظهر راكباً (قلت) على راحلته

ترجمہ: (ش) پھر آپؐ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی (ق)، پھر آپؐ مکہ کی جانب روانہ ہوئے ظہر سے پہلے، سوار ہو کر (ش) اپنی اونٹنی پر،

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے، اور آپؐ قربانی کے جانور تقسیم فرما رہے تھے، مگر ان کو کچھ نہ ملا، نہ ان کے رفیق کو، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے میں سر کا حلق کرایا، پس وہ آپؐ کی خدمت آئے اور ان میں سے کچھ بال چند افراد پر تقسیم فرمائے، اور آپؐ نے اپنے ناخن اتارے، پس وہ ان کے رفیق کو عطا فرمائے۔" انتہی۔

(ق) "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی۔" اھ شیخ ابن قیمؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سعی پوری کرنے کے بعد مروہ کے پاس یہ دعا فرمانا پہلے گذر چکا ہے۔ اور اسی جگہ یہ بحث بھی گذر چکی ہے۔ کہ یہ قصہ حدیبیہ کا ہے یا حجۃ الوداع کا؟ اور بر تقدیر دوم مروہ کے پاس کا ہے یا منیٰ کا؟ اور یہ کہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ دعا دونوں موقعوں پر فرمائی۔ لیکن حجۃ الوداع میں مروہ کے پاس فرمائی یا منیٰ میں؟ تو اس نارہ کے نزدیک مروہ کے پاس ہونا اوجہ ہے کیونکہ وہاں حلق کرا کر حلال ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا کمال اتباع تھا، لیکن منیٰ میں حلق کرانے والوں کی کوئی تخصیص نہ تھی کہ ان کے لئے تین بار دعا فرماتے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنين محلقين رؤوسكم ومقصرين لا تخافون" پس وہاں تقصیر میں بھی ارشاد خداوندی: ومقصرین کی پیروی تھی۔

طوافِ افاضہ کیلئے تشریف لیجانا

(ش) پھر آپؐ نے اپنے کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔ اس سلسلہ کی روایات صاحب البدایہ والنہایہ نے تفصیل سے ذکر کی ہیں۔ (ق) پھر آپؐ اسی دن بروز ہفتہ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اور اس پر گفتگو آ گے آتی ہے کہ کیا آپؐ نے رات کے قریب تک طواف مؤخر کیا؟ ظہر سے پہلے اور اس پر گفتگو آگے آتی ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منیٰ میں؟ سوار ہو کر۔ (ش) اپنی اونٹنی پر، جیسا کہ البدایہ والنہایہ

ہیں متعدد روایات میں اس کی تصریح ہے۔ اور ابو داؤد نے اپنی سند سے حضرت غرفہ بن حارث کندی سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "میں حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس ابو الحسن (حضرت علیؓ) کو بلاؤ۔ بعد ازاں پوری حدیث ذکر کی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں کا مل کر اونٹوں کا نحر کرنا مذکور ہے۔ اور اس کے آخر میں ہے۔ پس جب فارغ ہوئے تو اپنی خچر پر سوار ہوئے اور حضرت علی کو اپنے پیچھے سوار کیا" صاحب البدایۃ والنہایہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "ابو داؤد اس کے ساتھ متفرد ہیں، اور اس کی سند اور متن میں غرابت ہے"۔ ابو داؤد کی اس حدیث پر یہ اشکال ہے کہ صحیح مسلم میں ابو داؤد کی کتاب الحج "باب نبیذ السقایہ" میں بکر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کیا قصہ ہے کہ اس گھرانے کے لوگ نبیذ پلاتے ہیں؟ اس کا سبب بخل ہے یا احتیاج؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر ہمارے پاس تشریف لائے، آپؐ کے پیچھے اسامہ بن زید سوار تھے الخ" اس حدیث سے اسامہ بن زیدؓ کا آپؐ کے پیچھے سوار ہونا ثابت ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ اسامہ کا پیچھے سوار ہونا فتح مکہ میں تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے اس کی تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اعلیٰ مکہ سے اپنی اونٹنی پر تشریف لائے۔ اور اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ سوار کر رکھا تھا الخ یا یہ کہا جائے کہ ابو داؤد کی روایت میں غرابت ہے، جیسا کہ صاحب البدایہ والنہایہ نے کہا ہے۔

جن حضرات کو آپ کے ساتھ سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا ان کے ناموں کی فہرست

صاحب نسیم الریاض نے شرح شفا میں ان حضرات کے ناموں کی فہرست ذکر کی ہے، جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہ یہ ہیں، اسامہ[1] بن زید عرفہ سے واپسی میں، حضرت ابو بکر صدیقؓ[2] سفر ہجرت میں، عثمان[3]، علیؓ[4] حجۃ الوداع میں عبد اللہ بن جعفر[5]، آپؐ کے نواسے[6] بنو ہاشم کے دو لڑکوں[7،8] کے ساتھ[ف]۔ حضرت عباسؓ کے تینوں صاحبزادے[11] حسن[12]، حسین[13]، معاویہ[14]، معاذ بن جبل[15]، ابوذر[16]، زید بن حارثہ[17]، ثابت بن ضحاک[18]۔ شرید بن سوید[19]، سلمہ بن اکوع[20]، زید بن سہل[21]، ابو طلحہ[22]، سہیل بن بیضا[23] آپ کے نواسے علی بن زینب[24]، عبد اللہ بن زبیر[25]، بنو مطلب[26] کا ایک لڑکا۔ اسامہ بن عمیر[27]، صفیہ بنت حیی[28]۔ ابو الدرداء[29]، آمنہ بنت ابی الصلت[30]، ابو ایاس[31]، ابو ہریرہ[32]، قیس بن سعد[33]

ف کذا فی الاصل۔ وسبطہ مع غلامین من بنی ہاشم۔ مترجم۔

فطاف طواف الافاضة (قلت)، راكباً۔

ترجمہ :۔ پس طواف افاضہ کیا (ش) سواری پر۔

خوات بن جبیر، جبریل علیہ السلام براق پر شب اسراء میں، ام جبلیہ جہنیہ۔ زید بن ارقم۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم، اور ابن مندہ نے بعض دیگر حضرات کا بھی اضافہ کیا ہے۔" انتہی مختصراً۔

طواف افاضہ

پس طواف افاضہ کیا۔ اس کو طواف زیارۃ اور طواف صدر بھی کہتے ہیں۔ کذا فی البدی۔ اور مختصر الخلیل میں ہے: "مکروہ ہے یہ کہ کہا جائے طواف زیارت یا کہا جائے کہ زیارت کی ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی۔" دردیر کہتے ہیں۔ "کیونکہ زیارت کے لفظ سے استغناء مفہوم ہوتا ہے اور غالباً یہ کسی گذشتہ زمانے میں ہوگا، مگر آج کل یہ لفظ تعظیم کے لئے استعمال ہوتا ہے:" اھ

(ش) سواری پر۔ سواری پر طواف کرنے کی بحث طواف قدوم میں گذر چکی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ مسجد میں بول و براز سے محفوظ رہی

اور ارواح ثلاثہ میں ہمارے شیخ المشائخ شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہو کر طواف فرمایا تھا، جس سے مقصود تعلیم افعالِ طواف تھی اور لوگوں کے سوال کا جواب دینا اور اس حالت میں آپ کی اونٹنی نے نہ جگالا، نہ مینگنیاں کیں۔ اور نہ پیشاب کیا۔ پس حرمتِ مسجد بھی محفوظ رہی اور مقصودِ تعلیم بھی حاصل ہو گیا۔" اھ اور حافظ فرماتے ہیں کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سواری پر طواف کرنا اس ضرورت کی بنا پر تھا کہ لوگ آپ سے مناسک سیکھ سکیں۔ اسی بنا پر جن حضرات نے آپ کے خصائص کو جمع کیا ہے انہوں نے اس کو منجملہ خصوصیاتِ نبویہ کے شمار کیا ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس وقت آپ کی اونٹنی بطور آپ کی کرامت کے۔ بول و براز سے محفوظ رہی ہو۔ اس لئے دوسرے مویشیوں کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔" ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: "اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی ناقہ سدھائی ہوئی تھی، اس لئے اس کے چلنے کے دوران تلویث کا خطرہ نہیں تھا۔ ممکن ہے یہی حال ام سلمہؓ کے اونٹ کا بھی ہو۔" اھ

(ق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی طواف نہیں کیا۔ اور اس طواف کے ساتھ سعی نہیں کی۔" شیخ ابن قیمؒ کے نزدیک یہی صحیح ہے۔ اور اس امر کی تین جماعتوں نے مخالفت کی ہے۔ اول وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آپ نے دو طواف کئے، طوافِ قدوم اور طوافِ زیارت۔ دوم وہ جماعت

جو کہتی ہے کہ آپؐ نے اس طواف کے ساتھ سعی بھی کی ۔ کیونکہ آپؐ قارن تھے، سوم وہ جماعت جن کا خیال ہے کہ آپؐ نے اس دن طواف نہیں کیا بلکہ طواف کو رات تک مؤخر کیا۔ شیخ ابن قیمؒ ان کے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اور اس شخص کو وہم ہوا جس نے یہ کہا کہ آپؐ نے دو مرتبہ طواف افاضہ کیا، ایک بار دن میں اور ایک بار رات میں" (ش) اور اس پر گفتگو عنقریب آتی ہے کیونکہ اس کا منشا دبخاری کی روایت ہے۔

کیا آپؐ نے طواف افاضہ کے بعد سعی کی تھی؟

اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی بھی کی تھی۔ کیونکہ انکا مسلک یہ ہے کہ قارن کے ذمہ دو طواف اور دو سعی ہیں۔ اس کی تفصیل اول رسالہ میں گذر چکی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی نوعیت میں اولام کا بیان آیا تھا۔ اور ائمہ ثلاثہ کا قول ہے کہ قارن کے ذمہ صرف ایک طواف اور ایک سعی ہے۔ شیخ ابن قیمؒ کا کلام اسی پر مبنی ہے۔ اور وہ اس کے خلاف کو وہم کہتے ہیں۔

اور "القریٰ لقاصد ام القریٰ" میں بحوالہ مسند احمد ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا، آپؐ اپنی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، طواف سے فارغ ہوئے تو زمزم پر گئے، آپؐ کے بنو عم (چچیرے بھائی) پانی کھینچ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا مجھے دو۔ ڈول آپؐ کو دیا گیا، آپؐ نے نوش فرمایا، پھر نکلے، پس صفا مروہ کا طواف کیا" پس یہ حدیث اس باب میں صریح ہے کہ آپؐ نے طوافِ افاضہ کے بعد سعی کی، کیونکہ طوافِ قدوم پیدل تھا، جیساکہ پہلے گذر چکا ہے۔

کیا آپؐ نے طواف افاضہ رات تک مؤخر کیا تھا

(ق) "اور ابوداؤد اور نسائی میں جو حدیث بروایت ابوالزبیر حضرت عائشہؓ اور حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کا طواف رات تک مؤخر کیا، یہ حدیث معلول ہے"۔ اس کے علل کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "بظاہر راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ رات تک تاخیر کا قصہ طواف وداع کا ہے" بعد ازاں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ اور یہ جو حدیث عائشہ و جابرؓ کا لفظ آیا ہے یہ کاتب کی غلطی ہے۔ ورنہ ابوداؤد میں ابوالزبیر کی حدیث حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور خود حافظ ابن قیمؒ نے بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ابوالزبیر کے سماع پر بحث کی ہے، اور بحث میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں آتا۔ اسی طرح امام بخاری نے "صحیح" میں تعلیقاً یوں ذکر کیا ہے: "ابوالزبیر نے عائشہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے طواف زیارۃ

کو رات تک مؤخر کیا" اھ اور علماء نے ابوالزبیر کی اس حدیث میں اختلاف کیا ہے، اور حافظ ابن قیمؒ نے اسے ضعیف قرار دینے پر مفصل کلام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "یہ حدیث واضح طور پر غلط ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل معروف کے خلاف ہے، جس میں آپؐ کے حج سے واقفیت رکھنے والوں کو ذرا بھی شک نہیں" اور امام ترمذی کا قول۔ جو ان کی کتاب العلل میں ہے۔ نقل کیا ہے کہ انہوں نے (امام ترمذیؒ نے) امام بخاریؒ سے دریافت کیا کہ ابوالزبیر کا سماع حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے؟ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ ابن عباس سے تو ثابت ہے اور حضرت عائشہؓ سے ان کا سماع محل نظر ہے، اور ابن قطان کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں، پوری تفصیل ترمذیؒ کی کتاب العلل میں ہے۔ اور بحث کے آخر میں شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ دراصل غلطی طواف کے نام میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف وداع کو آخر شب تک مؤخر کیا تھا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ یہاں حضرت عائشہؓ کی طویل حدیث جس میں ان کے اپنے بھائی کے ساتھ عمرۂ تنعیم کا ذکر ہے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: "بغیر کسی شک و شبہ کے ٹھیک طور پر یہی طواف ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر شب تک مؤخر کیا تھا۔ پس ابوالزبیر نے یا ان سے روایت کنندہ نے غلطی سے بجائے طواف وداع کے طواف زیارۃ کا لفظ ذکر کر دیا" انتہی مختصراً۔

اور صاحب البدایہ والنہایہ ان روایات کے طرق کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اگر اس کی تاویل یہ کی جائے کہ آپؐ نے طواف زیارت کو مابعد زوال تک مؤخر کیا، گویا رات سے مراد شام ہے تو یہ روایت صحیح ہے اور اگر رات سے مراد مابعد غروب لیا جائے تو یہ بہت ہی بعید اور روایات صحیحہ کے مخالف ہے۔ اور جس طواف کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گئے تھے وہ طواف وداع ہے، بعض راوی اس کو بھی طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں: یا اس سے مراد زیارت محضہ کا طواف ہے، جو طواف وداع سے قبل اور طواف صدر یعنی طواف فرض کے بعد ہوگا کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی راتوں میں ہر رات زیارت بیت اللہ کے لئے آتے تھے۔ مگر یہ تاویل بھی بعید ہے" انتہی مختصراً۔

اور شیخ بذل میں فرماتے ہیں: "اس کی یہ تاویل ممکن ہے کہ حدیث کا اصل لفظ وہ تھا جو امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ یعنی "آپ نے مؤخر کیا زیارت کو رات تک" اور "زیارت" سے

او طوافِ زیارۃ نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ تھی۔ مگر کسی راوی نے اس سے یہ سمجھ کر کہ مراد طواف زیارت ہے۔ اس کو یوں روایت کر دیا کہ "مؤخر کیا طواف یوم النحر کو رات تک" اور امام بخاریؒ نے بصیغہ "تمریض ذکر کیا ہے کہ: اور ذکر کیا جاتا ہے بواسطہ ابوحسان کے ابن عباسؓ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کے ایام میں بیت اللہ کی زیارت کیا کرتے تھے"۔ گویا امام بخاریؒ حدیث ابوالزبیر میں ذکر شدہ لفظ زیارت کو طواف زیارت پر نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ پر محمول کرتے ہیں"۔ اھ اور میرے حاشیۂ بذل میں ہے کہ "ابن حجر نے شرح منہاج میں یہ تاویل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کا طواف مؤخر کیا، اور خود بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے"۔ اھ اور ملا علی قاریؒ نے ابن حجر کی مذکورہ بالا توجیہ کو نووی سے نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس تاویل پر کوئی دلالت نہیں نہ لفظاً نہ معناً، نہ حقیقۃً نہ مجازاً۔ مزید برآں یہ کہ اس کلام کے بین السطور یہ عجیب و غریب بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طوافِ زیارت کے لئے دوسری بار آئے، پس سب سے بہتر یہ توجیہ ہے کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپؐ نے رات تک تاخیر زیارت کو مطلقاً جائز رکھا ہے یا اپنی ازواج مطہرات کو رات تک طواف مؤخر کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابن حجر کا یہ کہنا کہ "خود آپؐ بھی ان کے ساتھ تشریف لے گئے"، صحیح نہیں۔ کیونکہ ازواج مطہرات کی معیت میں آپؐ کا دوبارہ ذات میں آنا ثابت نہیں"۔ اھ لیکن شیخ ابن ہمام کا رجحان یہی ہے جیسا کہ ابھی آتا ہے، اور امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اس زیارت کو نفلی طواف پر محمول کیا ہے۔

اور شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "قولہ: اُخّر طواف الزیارۃ الخ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ خود آپؐ نے رات کے وقت طواف کیا تو مسلّم نہیں۔ کیونکہ اہل علم متفق ہیں کہ آپؐ نے ظہر سے قبل طواف کیا تھا۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ دوسروں کے لئے اس کے وقت کو رات تک مؤخر فرمایا، یعنی رات تک طواف کو جائز قرار دیا تو ظاہر ہے کہ طواف زیارت کو بارہ تاریخ تک مؤخر کرنا ہمارے نزدیک بلا کراہت اور بغیر وجوب دم کے جائز ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ۱۳ر تاریخ تک۔ پس "رات تک تاخیر" کے کوئی معنیٰ نہ ہوئے۔ اس لئے حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ طواف زیارت کے وقت مستحب کو رات تک مؤخر کیا۔ اس کے بعد وقت مستحب باقی نہیں رہتا"۔ اھ اور اس کے

(قال) ثم اتی زمزم

ترجمہ: (ق) پھر زمزم پر آئے،

حاشیہ میں دُرِّ مختار سے نقل کیا ہے کہ "یوم نحر میں طواف کر لینا افضل ہے۔ اور قربانی کے تین دنوں میں سے کسی دن کر لینا واجب ہے۔ پس اگر ایام نحر اور ان راتوں سے مؤخر کر دیا تو مکروہ تحریمی ہے اور ترک واجب کی وجہ سے دم لازم ہوگا"۔ انتہیٰ مختصراً۔

گذشتہ بالا بحث سے سات جواب نکل آئے۔ اوّل یہ کہ حدیث صحیح نہیں، بلکہ معلول ہے۔ یہ ابن قطان نے ذکر کیا ہے۔ دوم یہ کہ راوی سے طواف کے نام میں غلطی ہوئی۔ طواف وداع کے بجائے طوافِ زیارۃ کہہ دیا۔ یہ حافظ ابن قیمؒ نے ذکر کیا ہے۔ سوم یہ کہ رات سے مراد مابعد غروب نہیں بلکہ مابعد زوال ہے۔ چہارم یہ کہ بعض راوی طواف وداع کو طواف زیارت سے تعبیر کر دیتے ہیں، گویا طواف زیارت طواف وداع کا غیر معروف نام ہے۔ پنجم یہ کہ اس سے طواف فرض مراد نہیں بلکہ طواف محض اور طواف نفل مراد ہے یہ تینوں جواب ابن کثیرؒ نے ذکر کیے ہیں۔ اور آخری جواب امام سرخسیؒ کا مختار ہے۔ اور یہی امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے۔ ششم یہ کہ ازواج مطہرات کے طواف کی تاخیر مراد ہے۔ یہ جواب نوویؒ نے شرح مہذب میں اور ان کی اتباع میں ابن حجر مکیؒ نے شرح منہاج میں ذکر کیا ہے۔ ہفتم یہ کہ طواف زیارت کی رات تک تاخیر کو جائز رکھنا مراد ہے۔

طواف افاضہ کے بعد زمزم پر تشریف لانا

(ق) پھر طواف پورا کرنے کے بعد زمزم پر آئے، وہ لوگ پانی نکال رہے تھے، پس فرمایا کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے تو میں اتر کر تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔ پھر انہوں نے آپؐ کو ڈول پکڑا دیا، پس آپؐ نے نوش فرمایا۔ کذا فی الہدیٰ۔ اور تلخیص بذل میں ہے کہ "نوویؒ کہتے ہیں کہ آپؐ کا ارشاد "اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے" الخ یعنی اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میرے عمل کو دیکھ کر لوگ یہ اعتقاد کر بیٹھیں گے کہ یہ بھی منجملہ مناسک حج کے ہے، پس اس کوشش میں تم پر چڑھ آئیں گے۔ اور تمہیں پانی نکالنے سے ہٹادیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا"۔ اور یہ واقعہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں مذکور ہے اور اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ طبقات میں حضرت عطاء سے روایت ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طواف افاضہ

فشرب قائماً۔

ترجمہ: پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

کیا تو اپنے لئے خود ڈول نکالا، اس میں آپؐ کے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا، پھر نوش فرما کر ڈول کا باقی ماندہ پانی کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور ارشاد فرمایا، کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ اس کے نکالنے میں تم پر غالب آجائیں گے تو میرے سوا کوئی اس سے پانی نہ نکالتا۔" اس حدیث سے صاحب ہدایہ نے استدلال کیا ہے کہ خود نکالنا مستحب ہے۔ اور اس کے حاشیہ میں بنایہ سے نقل کیا ہے کہ "اس حدیث کو طبرانی و احمد اور ابن سعد نے روایت کیا ہے۔" اھ اور زیلعی نے تخریج میں اس کے طرق کو مفصل ذکر کیا ہے۔ شیخ ابن ہمام کہتے ہیں کہ "ان دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ ابن سعد کی روایت کا قصہ طواف وداع کے بعد کا ہے اور حضرت جابرؓ کی حدیث کا واقعہ طواف افاضہ کے بعد کا ہے۔ اور اس کے الفاظ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ "پس آپؐ بیت اللہ گئے۔ ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی پس بنی عبدالمطلب کے پاس آئے، وہ لوگ پانی نکال رہے تھے" الخ اور آپؐ کا طوافِ وداع رات کے وقت ہوا تھا۔ اور حدیث پر ایک اشکال اس روایت سے بھی ہوتا ہے جو ازرقی نے تاریخ مکہ میں نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مستورات کی معیت میں رات کے وقت بیت اللہ پہنچے، پس اپنی اونٹنی پر طواف کیا، ہاتھ کی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے تھے، پھر زمزم پر آئے اور فرمایا تم پانی نکالتے رہو اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔ پھر آپؐ کے حکم سے پانی کا ڈول نکالا گیا، پس آپؐ نے نوش فرمایا" الخ الا یہ کہ اس روایت کو اس پر محمول کیا جائے کہ ازواج مطہرات طواف افاضہ کیلئے بوقتِ شب تشریف لے گئیں تھیں، آپؐ بھی ان کے ہمراہ گئے تھے "واللہ اعلم" انتہیٰ۔

پس کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ کھڑے ہو کر پانی پینے میں علماء کا بہت ہی

کھڑے ہو کر پانی پینا

اختلاف ہے اور اوجز میں اس پر بہت ہی بسط سے کلام کیا ہے۔ اور اس کی تلخیص حاشیۂ لامع میں ذکر کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ علماء کے اس میں چند اقوال ہیں۔ اوّل یہ کہ نہی زمزم اور وضو کے باقی ماندہ پانی کے ماسوا کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ہمارے بعض احناف کے ہاں مختار ہے۔ مثلاً صاحب نہیہ۔ در مختار وغیرہ۔ دوم یہ کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ضرورت کی بنا پر تھا۔ کہ وہاں بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہوگی۔ سوم یہ کہ جواز کی حدیث منسوخ ہے۔ ابن حزم کا رجحان اسی طرف ہے۔ چہارم یہ کہ نہی کی حدیث منسوخ ہے۔ اثرم اسی طرف مائل ہیں۔ اور نوویؒ نے اس پر شدید ردّ کیا ہے۔ پنجم

ثم رجع الی منی۔

ترجمہ: پھر منیٰ واپس آگئے

یہ کہ نہی تنزیہہ کے لئے ہے۔ اور فعل جواز کے لئے یہ نووی اور سیوطی وغیرہ کا مختار ہے۔ اور اکثر احناف نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ حلبی نے اسپر اجماع نقل کیا ہے یشتم: امام طحاوی نے اِس کو اختیار کیا ہے کہ نہی حضرت کی بنا پر ہے پس یہ امر شرعی نہیں بلکہ ارشادی وطبی ہے۔" انتہی۔

عینیؒ نے امام طحاویؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہی امام طحاوی کی معانی الآثار اور مشکل الآثار میں مذکور ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے امام طحاویؒ سے جو نقل کیا ہے کہ نہی اس صورت پر محمول ہے جب کہ پانی پیتے وقت بسم اللہ نہ پڑھے۔ تو یہ شاید ان دو کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہوگا۔ اور شیخ قدس سرہٗ لامع میں فرماتے ہیں کہ "نہی اس صورت میں ہے کہ کھڑے ہوکر پانی پینا نقصان دہ ہو، اور زمزم مضر نہیں۔ کیونکہ اس میں ضرر کا شائبہ تک نہیں؟ پس زمزم کھڑے ہوکر پینا جائز ہوا"۔

آب زمزم کی فضیلت

اور لامع کے حاشیہ میں زمزم کی فضیلت کی روایات تفصیل سے ذکر کی ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آپؐ کا سینہ مبارک آبِ زمزم سے دھویا، اور اسی میں ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ زمزم کا پانی دنیا کے ہر پانی سے افضل ہے سوائے اس پانی کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتان مبارک کے درمیان سے پھوٹ نکلا تھا۔ رہا یہ سوال کہ کیا آبِ زمزم آبِ کوثر سے بھی افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کا قول نفی میں ہے"

مگر محققین اس طرف گئے ہیں کہ آبِ زمزم آبِ کوثر سے افضل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شب معراج میں فرشتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک آبِ زمزم سے دھویا تھا۔ اگر آبِ کوثر افضل ہوتا تو یقیناً وہی لایا جاتا۔ پوری تفصیل اسی جگہ دیکھی جائے۔

آنحضرتؐ نے یوم نحر کی ظہر مکہ میں پڑھی یا منیٰ میں؟

پھر آنحضرتؐ منیٰ واپس آگئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی یا منیٰ میں واپس آکر؟ چنانچہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ظہر منیٰ میں پڑھی، یہ حدیث ابن قیمؒ نے اسی طرح صحیحین سے نقل کی ہے، مگر حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الدرایہ میں اور صاحب مشکوٰۃ نے صرف مسلم کی طرف منسوب کی ہے۔ نیز بیہقی نے "السنن" اور "المعرفت" میں صرف مسلم کی طرف

منسوب کی ہے، جیسا کہ زیلعی میں ہے۔ نیز ابن ہمام نے بھی صرف صحیح مسلم کی طرف منسوب کی ہے اور صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی۔ اور یہی قول حضرت عائشہؓ کا ہے۔ اب ایک جماعت نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے، اور ایک جماعت نے دوسری کو۔ اور شیخ ابن قیمؒ نے منیٰ میں ظہر پڑھنے کو راجح کہا ہے۔ اور مکہ میں ظہر پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے۔ موصوف نے حسب عادت اس پر خوب بسط سے کلام کیا ہے اور فریقین کے دلائل اور ان کے وجوہ ترجیح کو مفصل بیان کیا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ "یہ بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ دونوں روایتیں صحیح ہیں: اور ایک لامحالہ وہم ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ صحیح کیا ہے"۔ اھ اور عینی شرح ہدایہ میں کہتے ہیں کہ "ایک روایت وہم ہے۔ مگر اس کی تعیین معلوم نہیں"۔ اور اسی طرح ابن سید الناس نے بھی کہا ہے۔ جیسا کہ زیلعی نے نقل کیا ہے کہ ایک روایت لامحالہ وہم ہے۔ نیز حافظؒ نے درایہ میں ابن حزم سے نقل کیا ہے کہ ایک روایت وہم ہے اور زیلعی نے ابن حزمؒ کے کلام میں یہ اضافہ کیا ہے کہ "ایک روایت وہم ہے البتہ چند وجوہ سے اغلب یہ ہے کہ آپؐ نے ظہر مکہ میں پڑھی"۔ یہاں اس کی وجوہ ذکر کیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر پڑھی ہو اور بیان جواز کے لئے منیٰ میں دوبارہ پڑھی ہو۔ صاحب البدایہ والنہایہ نے یہی تطبیق ذکر کی ہے۔ مگر یہ شافعیہ کے مذہب پر صحیح ہے کیوں کہ ان کے نزدیک فرض پڑھنے والے کا نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتدا کرنا صحیح ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں "ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال سے قبل طواف افاضہ کیا، پھر ظہر کی نماز اول وقت میں مکہ میں پڑھی، پھر منیٰ لوٹ کر صحابہ کرامؓ کی درخواست پر ان کے ساتھ وہاں دوبارہ پڑھی، گویا منیٰ میں آپؐ کی نماز نفل تھی"۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسی صورت پر محمول نہ کیا جائے جس کے جواز میں اختلاف ہو، بلکہ یہ تاویل کی جائے کہ آپؐ نے مکہ میں وہ گانہ طواف وقت ظہر میں ادا کیا اور منیٰ واپس آکر ظہر کی نماز پڑھی۔ یا یہ کہا جائے کہ دونوں روایتیں تعارض کی وجہ سے ساقط ہیں۔ پس ترجیح اس کو ہوگی کہ آپؐ نے مکہ میں ظہر پڑھی کہ وہاں افضل تھی۔ اور تنگئ وقت اسکی مؤید ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلوع آفتاب کے قُبَیل مزدلفہ سے چلے۔ منیٰ میں رمی کی۔ سو اونٹ نحر کئے۔ ان کا گوشت پکایا کھایا۔ پھر مکہ گئے، طواف اور سعی کی۔ ظاہر ہے کہ ظہر کا وقت مکہ ہی میں آیا ہوگا۔ اور یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ آپؐ بلا ضرورت اس کو مستحب وقت سے مؤخر کر دیتے،

فبات بها

ترجمہ: پس رات وہاں رہے۔

اور یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ واللہ اعلم" اتھ اور اجزاء میں ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجۃ اللہ" میں "مکہ میں نماز" کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ابن ہمام نے فتح میں اس کو راجح کہا ہے۔ اور صاحب ہدایہ اور مبسوط نے صرف آپؐ کے منٰی میں نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور مکہ میں نماز پڑھنے کی روایت ذکر نہیں کی۔ اور شارح لباب نے مکہ میں نماز پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اس کے نسخوں میں جو ہمارے پاس ہیں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔

حضرت اُم سلمہ کا رات کو طواف کرنا

(ق) ابن حزم کہتے ہیں کہ مسلم کی روایت کے مطابق حضرت ام سلمہؓ نے اس دن اپنے اونٹ پر طواف کیا کیونکہ وہ بیمار تھیں۔ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ اسی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سورۂ طور کی قراءت کرنے کا ذکر بھی ہے، دن کے وقت ام سلمہؓ نے آپؐ کی قراءت کیسے سن لی؟ اس لئے یہ وہم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ام سلمہؓ کا یہ طواف، طوافِ وداع تھا جس کو شیخ ابن قیمؒ نے دلائل کے ساتھ خوب بسط سے بیان کیا ہے، اور حافظؒ نے فتح میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں یہ مصرح ہے اور صاحب البدایہ والنہایہ نے بھی اس پر جزم کیا ہے اور کہا ہے کہ "یوم النحر" کا لفظ راوی کی غلطی ہے، مزید تفصیل اوجز میں ہے۔

ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں گذارنے کا حکم

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ لوٹ آئے پس ایام تشریق کی راتیں منیٰ میں رہے۔ زوال آفتاب کے بعد جمرات کی رمی کرتے۔ کذا فی الزرقانی۔ پس رات وہاں رہے، جمہور کے قول کے مطابق منیٰ میں رہنا واجب ہے۔ اور امام شافعیؒ کا ایک قول اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ سنت ہے، یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔ اور منیٰ کی شب گذاری ترک کرنے پر دم کا واجب ہونا یا نہ ہونا اسی اختلاف پر مبنی ہے۔ اور "رات رہنا" جب ہی ہوگا جب رات کا بیشتر حصہ وہاں رہے۔ کذا فی الاوجز۔ اور اوجز میں ایک اور جگہ یہ تفصیل مذکور ہے کہ منیٰ کی شب گذاری کے ترک پر دم واجب ہوگا یا صدقہ وغیرہ،

فلما زالت الشمس مشی الی الجمرات، فبدا بالجمرة الاولیٰ ثم رمی الثانیة،

ترجمہ: پس جب زوال ہوا تو جمرات کیطرف چلے۔ پس جمرۂ اولیٰ سے ابتداء کی پھر دوسرے کی رمی کی

ایام تشریق میں رمی کا وقت

(ق) پس جب (گیارہویں تاریخ کی) صبح ہوئی تو آپؐ نے زوال آفتاب کا انتظار فرمایا۔ (ش) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک یوم النحر کے بعد کی رمی زوال سے پہلے جائز نہیں۔ اس کی تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کی تلخیص حاشیۂ لامع میں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "ایام تشریق کی رمی کا وقت باتفاقِ ائمہ زوال آفتاب کے بعد ہے۔ البتہ ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی میں امام ابو حنیفہؒ کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس دن کی رمی بطور استحسان۔ زوال سے قبل بھی صحیح ہے، امام اسحاق بھی اسی کے قائل ہیں، اور یہی ایک روایت امام احمد سے مروی ہے۔

رہا رمی کا آخری وقت؟ پس وہ بالاتفاق ایام تشریق کا آخری دن ہے۔ اگرچہ وقت مستحب، وقت کراہت، وقت جواز اور درصورت تاخیر وجوب دم میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل ان کی کتب فروع سے اوجز میں نقل کی گئی ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیۂ بذل میں اس طرح ہے: "ائمہ ستہ کے نزدیک ایام تشریق کی رمی زوال سے قبل بطور ادا جائز نہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صرف یوم نفر ثانی اس سے مستثنیٰ ہے۔ پھر امام شافعیؒ، امام احمد اور صاحبین کے نزدیک چوتھے دن کے غروب تک رمی کرسکتا ہے، اس کیلئے نہ کوئی معین وقت ہے نہ دم واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہر دن کی رمی کا وقت مستحب غروب تک ہے۔ اس کے بعد طلوع فجر تک وقتِ اباحت ہے۔ غیر معذور کو اس وقت رمی کرنا مکروہ ہے۔ مگر دم واجب نہیں۔ اور طلوع فجر کے بعد چوتھے دن کے غروب تک قضا ہے، جس میں دم واجب ہوگا۔ اور امام مالک کے نزدیک ہر دن کی رمی کا وقتِ ادا غروب تک ہے۔ اور اگر رات کو رمی کی تو دم واجب ہوگا" اھ اور یوم نحر کی رمی کے وقت میں اختلاف اپنی جگہ گذر چکا ہے۔

پس جب زوال ہوا تو جمرات کی طرف پیدل چلے اور سوار نہیں ہوئے۔ قبل ازیں رمی جمرۂ عقبہ کے بیان میں یہ بحث گذر چکی ہے۔ کہ پیدل رمی کرنا افضل ہے یا سوار ہو کر۔ پس جمرہ اولیٰ سے ابتداء کی اور اس کے بعد دیر تک دعاء فرماتے رہے، جو سورۂ بقرہ کی مقدار کے برابر تھی۔ پھر دوسرے کی رمی کی۔ یہاں بھی اسی طرح طویل دعا فرمائی جس طرح جمرۂ اولیٰ کے پاس کی تھی۔ اور زرقانی میں ہے کہ "جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ ثانیہ کے پاس دیر تک ٹھہرے۔ البتہ پہلے کے پاس زیادہ ٹھہرے" اور ان دونوں جمروں کے

ثم رمی الثالثۃ۔

پھر تیسرے کی رمی کی۔

پاس کتنی دیر ٹھہرے؟ اس میں سلف کا اختلاف ہے جس کی تفصیل حاشیۂ لامع میں اوجز سے نقل کی گئی ہے۔ اور اس میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: "اگر وقوف اور دعا کو ترک کر دیا تو سنت کو ترک کر دیا مگر اس کے ذمہ کوئی چیز لازم نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ میں امام ثوریؒ کے علاوہ کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ کچھ غلہ بطور فدیہ دیدے۔ اور اگر دم دیدے تو میرے نزدیک بہت ہی اچھا ہوگا۔" اور اوجز میں ہے کہ جمرۂ اولیٰ وثانیہ کے پاس قیام کرنا بخاری شریف میں بروایت سالم بن عبداللہ عن ابیہ مرفوعاً وارد ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں آیا ہے، اور حافظؒ نے ابن قدامہ کے حوالے سے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور ائمہ اربعہ کی کتابوں میں پہلے دو جمروں کے پاس طویل قیام کی تصریح موجود ہے، جیساکہ اوجز میں ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔

ان دو جمروں کے پاس دعا میں ہاتھ اٹھانا

اور یہاں ایک اور اختلافی مسئلہ ہے کہ ان دونوں جمروں کے پاس دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟ اوجز میں اس پر بہت ہی تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ابن منذر کہتے ہیں: "مجھے معلوم نہیں کہ جمرہ کے پاس ہاتھ اٹھانے سے کسی نے انکار کیا ہو۔ بجز اس کے جو ابن قاسم نے امام مالک سے نقل کیا ہے۔" الخ یہ طویل بحث اوجز میں دیکھ لی جائے۔ اس میں یہ اختلاف بھی ذکر کیا ہے کہ اس موقعہ پر اسی طرح ہاتھ اٹھائے جائیں جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں یا قبلہ کی طرف؟

کیا تینوں جمرات کی رمی میں ترتیب واجب ہے

پھر تیسرے کی رمی کی تینوں جمرات کی رمی میں ترتیب واجب ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ موفق کہتے ہیں: "ان جمرات میں ترتیب واجب ہے، پس اگر ترتیب الٹ دی اور پہلے جمرۂ عقبہ کی رمی کی، پھر ثانیہ کی اور پھر اُولیٰ کی تو صرف اُولیٰ کی رمی صحیح ہوگی۔ امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے اور امام شافعیؒ اور امام مالک بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور حسن اور عطاء کہتے ہیں کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ترتیب الٹ ڈالی تو اعادہ کرے۔ اور اگر اعادہ نہیں کیا تب بھی رمی صحیح ہوگئی۔"

ولم يقف عندهٗ

ترجمہ: اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے۔

جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے

اور اس کے پاس نہیں ٹھہرے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے جیسا کہ اوجز میں محلّٰی سے نقل کیا ہے اور موفق کہتے ہیں: "اس کے پاس ٹھہرنا مسنون نہیں۔ کیونکہ ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس نہیں ٹھہرے تھے۔" اسی طرح ام جندبؓ اور عائشہؓ کی روایت میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ترجمۃ الباب قائم کیا: "باب من رمی جمرۃ العقبۃ ولم یقف" (جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد نہ ٹھہرنے کا بیان)، حافظؒ فتح میں فرماتے ہیں: "کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں"، میں کہتا ہوں کہ اجماع کی حکایت مشکل ہے کیونکہ حصن میں بروایت ابن ابی شیبہ حسن بصری سے مرفوعًا مروی ہے کہ "تمام جمرات کے پاس دعا کرے اور کسی کی تعیین نہ کرے"۔ الایہ کہ کہا جائے کہ یہ قول شاذ ہے اس لئے علمائے کرام کے نزدیک لائق التفات نہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ اس قول سے مراد وہ ہے جو ملا علی قاری نے شرح لباب میں ذکر کیا ہے کہ تمام ایام رمی میں جمرۂ عقبہ کے پاس دعاء کے لئے نہ ٹھہرے بلکہ بغیر ٹھہرنے کے دعاء کرلے۔ اور محلّٰی میں ہے کہ پہلے دو جمروں کے پاس ٹھہرے اور جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرنے میں حکمت یہ ہے کہ دعاء وسطِ عبادت میں واقع ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ جمرۂ عقبہ لوگوں کی گذرگاہ میں واقع ہے اس لئے وہاں ٹھہرنے سے لوگوں کا راستہ بند ہوجائے گا۔ عمومًا اہل علم نے دوسری وجہ کو اختیار کیا ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ اور صاحب ہدایہ نے پہلی وجہ یعنی دعاء کے وسطِ عبادت میں واقع ہونے کی حکمت کو جیسا کہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں ابن حجر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جمرۂ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرے، نہ یوم نحر میں نہ اس کے بعد۔ کیونکہ اس کی جگہ تنگ ہے۔ ٹھہرنے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ لیکن یہ تعلیل زمانہ گذشتہ کے اعتبار سے ہے البتہ اگر یہ علت ذکر کی جائے کہ اس سے فارغ ہو کر نہ ٹھہرنے میں قبولیت کی نیک فالی ہے۔ تو بعید نہ ہوگا" اھ حاصل یہ کہ رمی عقبہ کے بعد نہ ٹھہرنا روایات مرفوعہ وموقوفہ سے ثابت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اجماعی ہے۔ البتہ اس کے سبب میں اقوال مختلف ہیں، بعض کے نزدیک دعاء کا وسطِ عبادت میں واقع ہونا اس کا سبب ہے۔ بعض کے نزدیک جگہ کا تنگ ہونا۔ اور بعض کے نزدیک قبولیت کی نیک فالی۔ کذا فی الاوجز۔

(قلت) وهل كان يأتي مكة كل ليلة۔

ترجمہ: (ش) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟۔

آنحضرتؐ نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے یا بعد میں؟

(ق) آنحضرتؐ نماز ظہر سے پہلے رمی کرتے تھے یا بعد میں؟ غالب ظن یہ ہے کہ ظہر سے قبل کرتے تھے۔ کذا فی الہدیٰ ـــــ اور ابن قیمؒ نے اس کے وجوہ ترجیح کو بسط سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج میں ٹھہر کر دعا کرنے کے چھ مواقع پیش آئے ـــــ اوّل: صفا پر۔ دوم مروہ پر۔ سوم: عرفہ میں۔ چہارم: مزدلفہ میں۔ پنجم: جمرۂ اولیٰ کے پاس۔ ششم جمرۂ ثانیہ کے پاس۔

منیٰ کی راتوں میں ہر رات مکہ آنا

(ش) اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (منیٰ سے) ہر رات مکہ آیا کرتے تھے؟ حافظ ابن قیمؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور اس کو اوہام میں شمار کیا ہے۔ اور موفق کہتے ہیں "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایام منیٰ میں ہر دن بیت اللہ کی زیارت کیا کرے اور بعض اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ (مکہ نہ آئے بلکہ) منیٰ ہی میں مقیم رہے کیونکہ یہ منیٰ کے دن ہیں اور (ابو عبداللہ (امام احمد) نے ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات مکہ جایا کرتے تھے" اھ حضرت ابن عباس کی یہ حدیث امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقًا یذکر (ذکر کیا جاتا ہے) کے لفظ سے ذکر کی ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ اس کو طبرانی نے بسند متصل روایت کیا ہے" اس کی تنقیح پر مفصل کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں" اور ایک مرسل روایت اس کی مؤید ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے طاؤس کے والد سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات بیت اللہ جاتے تھے" اھ میں کہتا ہوں کہ امام سرخسیؒ کا رجحان اسی کی طرف ہے اور حافظ کا بھی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رات تک تاخیرِ طواف کی حدیث کے ذیل میں قریب ہی گذر چکا ہے۔

وسط ایام تشریق کا خطبہ

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو خطبے دئے۔ ایک خطبہ یوم نحر کو۔ جو پہلے گذر چکا ہے۔ اور دوسرا خطبہ وسط ایام تشریق میں۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ یوم النحر سے اگلے دن تھا" اھ (ش) حنفیہ اور مالکیہ اسی کے قائل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بارہ تاریخ تھی جیسا کہ یہ شافعیہ اور حنابلہ کا قول ہے۔ اور خطباتِ حج میں ائمہ کا اختلاف ساتویں تاریخ کے خطبہ کی بحث میں گذر چکا ہے اور حنفیہ اور ان کے موافقین نے ۱۱ ذی الحجہ کے خطبے پر ابو داؤد کی حدیث سے

استدلال کیا ہے کہ سراء بنت نبہان کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "یوم الرؤس کو خطبہ دیا"۔ اور حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ "یوم الرؤس، بالاتفاق یوم النحر سے اگلا دن ہے"۔ اور زرقانی کہتے ہیں کہ یوم الرؤس بضم راء وہمزہ۔ یہ گیارہ ذی الحجہ کا نام ہے کیونکہ لوگوں کا معمول تھا کہ یوم النحر کو قربانیاں کیا کرتے، اور اس رات قربانی کے سروں کو پکاتے اور صبح سویرے اٹھ کر کھایا کرتے تھے"۔ اھ اور شرح مناسک نووی میں بروایت طبقات ابن سعد عمرو بن یثربی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کے اگلے دن ظہر کے بعد خطبہ دیا۔ جیسا کہ میرے حاشیۂ بذل میں ہے۔ اور البدایہ والنہایہ میں یوم النحر کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد کا دن "یوم القر" کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس میں قرار پکڑتے تھے۔ اور اس کو "یوم الرؤس" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں قربانی کے سر پکانے کھانے کا معمول تھا۔ یہ ایام تشریق کا پہلا دن ہے اور ایام تشریق کے دوسرے دن (۱۲ ذی الحجہ) کو "یوم النفر الاول" کہتے ہیں، کیونکہ اس دن منیٰ سے رخصت ہونا جائز ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسی دن کو "یوم الرؤس" کہا جاتا ہے"۔ اھ میں کہتا ہوں کہ روایات میں جو آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وسط ایام تشریق میں خطبہ دیا ہے اس سے ۱۱ ذی الحجہ مراد ہے کیونکہ سراء بنت نبہان کی روایت میں، جو ابھی ابوداؤد کے حوالے سے قریب ہی گذری ہے۔ یہ لفظ ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یوم الرؤس میں خطبہ دیا، پس فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم۔ فرمایا: کیا یہ وسط ایام تشریق نہیں؟" الخ اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ابن حزم کہتے ہیں: "روایت میں آتا ہے کہ آپ نے یوم الرؤس کو خطبہ دیا۔ اور اہل مکہ سے بلا اختلاف منقول ہے کہ یہ یوم النحر سے اگلا دن ہے اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ نے اوسط ایام تشریق میں خطبہ دیا، پس احتمال ہے کہ اوسط بمعنیٰ اشرف ہو، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا"۔ انتہیٰ۔

آنحضرت کا قرب وصال کو محسوس کر لینا

(ق) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے ذکر کیا ہے کہ یہ سورۃ: "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وسط ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ نے جانا کہ یہ وداع کا پیغام ہے (ش) اور البدایہ والنہایہ میں ۱۱ھ کے حوادث میں ہے: "اس سال کا حادثۂ عظمیٰ اور فاجعۂ کبریٰ سید اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ ہے۔ اور اسی ذیل میں آیت کریمہ: الیوم اکملت لکم دینکم الآیہ عرفہ کی شام کو نازل ہوئی اور ہم نے بسند جید روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطابؓ

(قال) واستأذنه العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یبیت بمکۃ۔ واستأذنہ رعاء الابل

ترجمہ: (ق) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے مکہ میں رات رہنے کی اجازت چاہی۔ اور اونٹ چرانے والوں نے بھی آپ سے اجازت چاہی۔

رو پڑے، رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کمال کے بعد صرف نقصان رہ جاتا ہے۔ گویا ان کو محسوس ہو گیا کہ اس آیت میں وصال نبوی کی خبر ہے۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا، چنانچہ مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمرۂ عقبہ کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: "مجھ سے اپنے مناسک حاصل کر لو۔ شاید میں اس سال کے بعد حج نہیں کروں گا" اور حافظ بزار اور حافظ بیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ جب یہ سورۃ اذا جاء نصر اللہ والفتح" ایام تشریق میں نازل ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچانا کہ یہ پیغام وداع ہے، پس اپنی ناقہ قصواءؐ کی تیاری کا حکم فرمایا۔ پس وہ تیار کی گئی۔ اس کے بعد اس دن کے خطبہ کا ذکر کیا۔ اسی طرح جب عمر بن خطابؓ نے ابن عباسؓ سے اس سورۃ کی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی اس سے یہی سمجھتا ہوں جو کچھ تم نے سمجھا ہے، جیسا کہ بخاری کی متعدد روایات میں مروی ہے۔" الخ میں کہتا ہوں کہ اس امر میں روایات مختلف ہیں کہ یہ سورۃ کس وقت اور کس جگہ نازل ہوئی، جیسا کہ خطبہ یوم النحر میں گذر چکا۔

حضرت عباسؓ کا مکہ میں رات کو رہنے کی اجازت مانگنا

(ق) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سقایت زمزم کی خاطر آپ سے منیٰ کی راتیں مکہ میں رہنے کی اجازت چاہی۔

چنانچہ آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ یہ اختلاف قریب ہی گذر چکا ہے کہ منیٰ میں رات رہنا واجب ہے یا سنت؟ اور حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سنت ہے، اس لئے حضرت عباسؓ اور دیگر حضرات کے ترک مبیت میں ان کے نزدیک کوئی اشکال نہیں۔ اور جو حضرات وجوب کے قائل ہیں۔ ان کے مسلک پر اشکال لازم آتا ہے، جسکا بیان ابھی آتا ہے۔

اونٹوں کے چرواہوں کا منیٰ سے باہر رات گذارنے کی اجازت طلب کرنا

اور اونٹ چرانے والوں نے بھی آپ سے منیٰ سے باہر رات گذارنے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ آپ نے ان کو بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

کیا یہ اجازت تمام معذوروں کو شامل ہے

اور اوجز میں ہے کہ یہ اختلاف تو پہلے گذر چکا ہے کہ منیٰ میں رات رہنا واجب ہے یا سنت؟ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ چرواہوں کو یہ معاف ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معافی صرف چرواہوں اور زمزم پلانے والوں سے مخصوص ہے یا تمام اصحاب عذر کو شامل ہے؟ اور امام بخاری کا ایک ترجمۃ الباب یہ ہے، "باب ہل یبیت اصحاب السقایہ او غیرہم بمکۃ لیالی منیٰ" حافظ فرماتے ہیں کہ "او غیرہم" سے مقصود وہ لوگ ہیں جن کو مرض یا مشغل کا عذر ہو مثلاً لکڑ ہارے اور چرواہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا سقایت کی اجازت حضرت عباسؓ کے ساتھ خاص ہے یا اس کا مدار ان اوصاف پر جو اس حکم میں معتبر ہیں؟ - پس بعض کا قول ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ سے خاص ہے، یہ تو جمود ہے، اور بعض کا قول ہے کہ اس حکم میں حضرت عباسؓ کے ساتھ ان کی آل، اور بقول بعض انکی قوم بنو ہاشم بھی داخل ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ ہر وہ شخص جو سقایت کا محتاج ہو اس کے لئے یہی حکم ہے۔ اور صحیح یہی ہے کہ حکم کو عام رکھا جائے۔ اور اس کی علت پینے والوں کے لئے پانی جمع کرنا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہ حکم صرف پانی کے ساتھ مخصوص ہے یا کھانا وغیرہ، جو اس کے ہم معنی ہیں، وہ بھی اسی کے ساتھ ملحق ہیں۔ یہ محل احتمال ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ صرف چرواہے اہل سقایت کے حکم میں ہیں۔ اور یہی امام احمدؒ کا قول ہے، اسی قول کو یعنی اس حکم کے اہل سقایت اور چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہونے کو ابن منذر نے اختیار کیا ہے اور امام احمد سے معروف روایت یہ ہے کہ یہ حکم صرف حضرت عباسؓ کے لئے مخصوص ہے، اور مالکیہ کہتے ہیں کہ چرواہوں کے علاوہ باقی سب امور میں دم واجب ہوگا۔" انتہی مختصراً من الاوجز۔

اور منیٰ میں رات رہنے کے مسئلہ میں مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ شافعیہ حنابلہ، اور مالکیہ کے نزدیک چرواہوں اور زمزم نکالنے والوں کے لئے اس کا ترک جائز ہے۔ پھر مالکیہ کی ایک جماعت۔ دردیر وغیرہ کا قول یہ ہے کہ رخصت صرف اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور شافعیہ کی ایک جماعت مثلاً ابو اسحٰق کی المہذب، اور امام غزالی کی الوجیز سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور مالکیہ کی ایک جماعت مثلاً ابن شاش، ابن حاجب اور ابن عرفہ کا قول ہے کہ یہ اجازت چرواہوں کے علاوہ دوسروں کو بھی عام ہے، زرقانی نے اسی کو اختیار کیا ہے ۔۔ اور آیا اہل

ولم يتعجل فى يومين

ترجمہ: اور آپ نے دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل نہیں کی۔

اعذار، مثلاً مریض اور وہ شخص جس کے مال ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو وغیرہ کا حکم بھی یہی ہے۔؟ اس میں شافعیہ کی دو روایتیں ہیں، دونوں میں صحیح تر روایت اثبات میں ہے۔ اور یہی حنابلہ کا قول ہے۔ اور دوسری کا جواب نفی میں ہے، اور یہی مالکیہ کا قول ہے۔ اور کیا یہ حکم حضرت عباسؓ کے ساتھ خاص ہے؟ رافعی کہتے ہیں کہ اہل سقایت کی رخصت عباسیہ کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ معنیٔ علتِ حکم ان کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل ہے۔ اور امام مالکؒ و ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ یہ اولاد عباس کے ساتھ خاص ہے۔ اور یہی ایک وجہ روایت، ہمارے اصحاب کے لئے بھی ہے اور بعض، بنو ہاشم سے اختصاص کو نقل کرتے ہیں۔ کذا فی الاوجز مع زیادة عن غیرہ۔

چرواہوں کو دو دن کی رمی جمع کرنے کی اجازت (ق) اور آپؐ نے اونٹوں کے چرواہوں کو رخصت دی کہ وہ یوم نحر کی رمی کر لیں اور یوم نحر کے بعد دو دن کی رمی ایک ہی دن کر لیا کریں۔ الخ (ش) شیخ ابن قیمؒ کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ چرواہوں کو اختیار تھا کہ چاہے دو دن کی رمی پہلے دن کر لیا کریں۔ یا دوسرے دن۔ یعنی جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کا اختیار تھا۔ اس سلسلہ میں روایات حدیث مختلف ہیں۔ جیسا کہ ترمذی، ابوداؤد، مؤطا مالکؒ اور موطا محمدؒ میں ہے۔ اور بذل، کوکب اور اوجز میں ان روایات کی اور اقوال ائمہ کی توجیہ تفصیل سے ذکر کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیل اوجز میں ہے۔ اور اس کا خلاصہ میرے حاشیۂ بذل میں یہ ہے کہ ابن حزم وغیرہ کا قول ہے کہ انہیں جمع تقدیم و تاخیر دونوں کا اختیار ہے۔ اور ائمہ ستہ کا اتفاق ہے کہ جمع تقدیم جائز نہیں اور جمع تاخیر کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دم لازم آئیگا۔ باقی چار ائمہ کے نزدیک نہیں۔" انتہی۔

آنحضرتؐ نے ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی بھی فرمائی اور آپؐ نے دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل نہیں کی بلکہ تیسرے دن تک تاخیر فرمائی، یہاں تک کہ ایام تشریق کی رمی بھی پوری فرمائی۔ اور ائمہ کا اجماع ہے کہ جو شخص بارہ تاریخ کو منیٰ سے واپس آنا چاہے آسکتا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "پس جس نے دو دن میں (مکہ آنے میں) تعجیل کی اس

وافاض یوم الثلاثاء۔

ترجمہ: اور منگل کے دن منیٰ سے چلے۔

کے ذمہ کچھ گناہ نہیں۔ اور جس نے (تیسرے دن) تاخیر کی اس کے ذمہ بھی کچھ گناہ نہیں۔" الایہ۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ امام جلدی آئے۔ رہے امام کے علاوہ دوسرے لوگ، تو آفاقی کیلئے جلدی آجانا جائز ہے اور اہل مکہ کے بارے میں امام مالک کے اقوال مختلف ہیں: ایک قول یہ کہ اس کے لئے مناسب نہیں۔ اور ایک قول یہ کہ وہ آفاقی کی مثل ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: "اہل علم کا اجماع ہے کہ جو شخص منیٰ سے نکل کر حرم سے رخصت ہونا چاہے اور اسے مکہ میں نہ رہنا ہو وہ ایام تشریق کے دوسرے دن زوال کے بعد منیٰ سے جا سکتا ہے۔ اور اگر مکہ میں رہنا چاہے تو امام احمد فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ جو شخص منیٰ سے بارہ تاریخ کو آجائے وہ مکہ میں ٹھہرے اور نوویؒ اپنے مناسک میں کہتے ہیں "بارہ تاریخ کو منیٰ سے آجانا اگرچہ جائز ہے لیکن تیسرے دن تک تاخیر افضل ہے۔" ابن حجر مکی اس کی شرح میں کہتے ہیں کہ تاخیر افضل ہے الایہ کہ کوئی عذر ہو اور اس میں امام اور غیر امام یکساں ہیں۔ اھ احکام سلطانیہ میں ہے کہ "امام کے لئے نفر اول جائز نہیں۔ کیونکہ وہ متبوع ہے۔ اس کو مناسک پورے کرنے کے بعد ہی آنا ہوگا۔" اھ اور ہدایہ میں ہے کہ "پہلے دن (۱۲) تاریخ کو بھی آسکتا ہے، مگر افضل یہ ہے کہ ۱۳ تک ٹھہرے۔" نیز اوجز میں ہے کہ موفق کہتے ہیں: "اگر (۱۲) تاریخ کو) منیٰ سے نکلنے سے قبل آفتاب غروب ہو جائے تو نہ نکلے، خواہ کوچ کر چکا تھا یا اپنی جگہ میں مقیم تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لئے نکلنا جائز نہیں۔ یہی قول امام مالکؒ و امام شافعیؒ کا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن کی صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے جا سکتا ہے۔"

منیٰ سے محصب کی طرف روانگی

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے دن کی رمی کر کے منگل کے دن ظہر کے بعد منیٰ سے چلے "الہدیٰ" میں اسی طرح ہے، اور قسطلانی نے مواہب میں اس کی پیروی کی ہے۔ اور مراد اس سے زوال کے بعد اور نماز ظہر سے پہلے چلنا ہے۔ صحیح بخاری کا ترجمۃ الباب ہے: باب من صلی العصر یوم النفر بالابطح، امام بخاری نے اس میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الترویہ (۸، ذی الحجہ) کی نماز ظہر کہاں پڑھی تھی؟ فرمایا منیٰ میں۔ میں نے پوچھا کہ منیٰ سے واپسی کے

الی المحصب

ترجمہ: اور محصب پہنچے۔

دن عصر کہاں پڑھی تھی؟ فرمایا! ابطح میں۔ اور تم وہی کرو جو تمہارے امراء کریں"۔ اس کے بعد حضرت انسؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء محصب میں پڑھیں اور تھوڑا سا سوئے بھی"۔ اھ

اور البدایہ والنہایہ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں تعارض ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں "منگل کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر منیٰ سے چلے، محصب میں فروکش ہوئے اور وہاں عصر پڑھی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے (یہاں پہلی حدیث ذکر کی)۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے یوم النفر کی نماز ظہر ابطح میں پڑھی۔ واللہ اعلم (یہاں دوسری حدیث کو ذکر کیا)"۔ اور حافظ فرماتے ہیں کہ "راوی کا یہ بیان کہ آپؐ نے ظہر ابطح میں پڑھی اس امر کے منافی نہیں کہ آپؐ نے زوال کے بعد رمی کی۔ چنانچہ آپؐ نے رمی کی، پھر کوچ کیا، محصب پہنچے، پس یہاں ظہر پڑھی"۔ اھ اور محصب پہنچے۔ مُحَصَّب: بضم میم، وفتح حائے مہملہ وصاد مہملہ و مشددہ وبائے موحدہ۔ اس کو ابطح اور بطحا بھی کہتے ہیں، کذا فی الزرقانی۔ اور معجم البلدان میں ہے، کہ اس کو ابطح، البطحا اور خیف بنی کنانہ کا نام بھی دیا جاتا ہے"۔ اھ اور نوویؒ کہتے ہیں کہ "محصّب۔ حصْبا۔ ابطح، بطحا اور خیف بنی کنانہ ایک ہی جگہ کے نام ہیں"۔ اھ اور اس میں اختلاف ہے کہ "ذوطویٰ" بھی محصب ہی کا نام ہے یا کسی اور جگہ کا؟ جیسا کہ حاشیۂ لامع میں ہے، اور اس میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ "یہ ایک وسیع جگہ کا نام ہے۔ جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے، منیٰ سے زیادہ قریب ہے اور اس کے حدود دونوں پہاڑوں کے مابین مقبرہ تک ہیں"۔ اھ

مُحَصَّب میں اترنا سنت ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ محصب میں اترنا سنت ہے یا یہ اتفاقی منزل تھی؟ اوجز میں اس کو خوب بسط سے بیان کیا ہے۔

ائمہ اربعہ اور جمہور نے پہلی شق کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ سنت ہے یا مستحب؟ اور امام مالکؒ مقتدیٰ اور غیر مقتدیٰ کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقتدیٰ کے حق میں مؤکد ہے اور غیر مقتدیٰ کے حق میں غیر مؤکد۔ اور بعض سلف نے قول ثانی کو اختیار کیا ہے، ان کی دلیل مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ "اللہ کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں صرف میری وجہ سے فروکش ہوئے تھے"۔ یعنی حضرت عائشہؓ کے عمرہ کی خاطر۔ اور ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس لئے ٹھہرے کہ یہاں سے مدینہ کی واپسی آپ کے لئے آسان تھی"۔ یہ

حدیث بخاری شریف "باب المحصب" میں ہے۔ اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ سے چلنے سے قبل ہی یہاں کے قیام سے آگاہ فرمایا تھا۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ صحاح ستہ میں حضرت اسامہؓ سے روایت ہے کہ "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کل کہاں قیام ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کل انشاء اللہ ہم خیف بنی کنانہ یعنی محصب میں اتریں گے، جہاں کفار نے کفر کا عہد و پیمان کیا تھا: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں اترنا قصداً تھا، اور پہلے ہی سے اس کی نیت تھی۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ان کے اپنے فہم پر مبنی ہے، علاوہ ازیں اس جگہ کا واپسی کے لئے مناسب ہونا یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمرہ کی مصلحت اس امر کے منافی نہیں کہ کسی مستقل وجہ کی بنا پر آپؐ نے یہاں اترنے کا قصد کیا ہو۔ اسی طرح حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اس کے منافی نہیں کہ "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (محصب میں خیمہ لگانے کا) حکم نہیں فرمایا تھا، بس میں نے از خود وہاں خیمہ لگا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ اتر گئے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد چونکہ یہاں اترنے کا تھا اس لئے یہی امر حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کے قلب پر وارد ہوا۔ یہ ایک ایسا امر ہے جو اہل حقائق سے مخفی نہیں۔ نہ اس کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ اہل قلوب کے ہاں معروف چیز ہے۔ مزید یہ کہ اگرچہ خیمہ آپؐ کے حکم سے نصب نہیں کیا گیا۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نزول فرمایا تو یہاں کا نزول سنت ٹھہرا، بالخصوص جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کا عمل بھی یہی رہا۔ جیسا کہ حاشیہ لامع میں ہے۔ اور اس میں ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ "یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول بالقصد تھا۔ یہی صحیح تر ہے لہٰذا یہاں اترنا سنت ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا: کل ہم خیف بنی کنانہ میں فروکش ہوں گے الخ پس معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس مقصد کے لئے نزول فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے لطف احسان کا جو معاملہ فرمایا مشرکین کے سامنے اس کا اظہار کیا جائے۔ اس لئے رمل کی طرح یہ بھی سنت ہوا۔" اور نوویؒ کہتے ہیں "جمہور کا مذہب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی اقتداء میں یہاں کا نزول مستحب ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس کے ترک سے کچھ لازم نہیں آتا:" اھ اور شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "یہاں کا نزول حج سے متعلق نہیں بلکہ ایک مستقل سنت ہے اس لئے جو حضرات فرماتے ہیں کہ محصب میں اترنے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حج سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور جہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سنت ہے وہاں مراد یہ ہے کہ حج سے الگ ایک مستقل اور علیحدہ سنت ہے"

فنزل هناك۔ ثم نهض الی مکة فطاف للوداع

ترجمہ: پس وہاں فروکش ہوئے۔ پھر مکہ کی طرف چلے اور طواف وداع کیا۔

اور کوکب کے حاشیہ میں ہے کہ حافظ کہتے: "حاصل یہ کہ جن حضرات نے اس کے سنت ہونے کی نفی کی مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباسؓ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ مناسک میں سے نہیں۔ لہٰذا اس کے ترک سے کوئی چیز لازم نہیں۔ اور جن حضرات نے اس کو سنت کہا ہے، جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اقتداء کے عموم میں داخل ہے۔" اھ

پس وہاں بالوں کے بنے ہوئے خیمے میں فروکش ہوئے جیسا کہ زرقانی میں ہے، یہ خیمہ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ نے نصب کیا تھا، ان کے نام میں دس قول ہیں ان میں سے "اسلم" زیادہ مشہور ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نگرانی پر مامور تھے۔ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں خیمہ لگانے کا حکم نہیں فرمایا تھا الخ جیسا کہ امام مسلم اور ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

مُحَصَّب میں چار نمازوں کا استحباب یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر سے عشاء تک کی نمازیں پڑھیں اور قدرے نیند کی، ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ یہاں چار نمازیں پڑھنا مستحب ہے، جیسا کہ اوجز میں مفصل ذکر کیا ہے لیکن دردیر کہتے ہیں: "چار نمازوں کا یہاں مستحب ہونا جب ہے جبکہ اسے جلدی نہ ہو۔ اور واپسی جمعہ کے دن نہ ہوئی ہو، ورنہ محصب میں اترنا مستحب نہیں۔ اور یہاں ظہر کی نماز کے مندوب ہونے کا موقع اس وقت ہے جب کہ تنگیٔ وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے" اور شرح مناسکِ نوویؒ میں ہے: "ظہر کی نماز منیٰ میں نہ پڑھے بلکہ محصب کی منزل میں یا کسی دوسری جگہ پڑھے۔ اور اگر منیٰ میں پڑھ لی تب بھی جائز ہے۔ مگر افضل کو ترک کر دیا" اھ اور اوجز میں محلّی سے نقل کیا ہے کہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں "اور ایک گھڑی کے لئے محصب میں اترے" اھ۔ اور فتح القدیر میں ہے "اور اس جگہ ظہر سے عشاء تک کی نمازیں پڑھے۔ اور تھوڑی سی نیند کرے، پھر مکہ میں داخل ہو" اھ اس سے ظاہر ہوا کہ ایک گھڑی ٹھہرنے سے اصل سنت ادا ہو جائے گی۔ مگر کمال وہ ہے جو کمال (ابن ہمام) نے ذکر کیا ہے" اھ۔

حضورؐ کا طواف وداع کرنا پھر مکہ کی طرف چلے اور رات کو سحری کے وقت طواف وداع کیا۔ نووی فرماتے کہتے ہیں کہ وداع، بفتح واؤ اور اسی کو طوافِ صدر۔ بفتح صاد۔ کا نام بھی دیا

جاتا ہے۔ کہ اس میں بیت اللہ کی طرف واپسی ہوتی ہے اور اوجز میں ہے: الوداع بفتح واؤ۔ سلام اور کلام کے وزن پر تودیع (رخصت کرنے) کا نام ہے اور ابن نجیم کہتے ہیں کہ اس کے پانچ نام ہیں۔ طواف صدر۔ طواف وداع۔ طواف افاضہ۔ طواف واجب، طواف آخر عہد بالبیت" اھ اور صدر کے معنیٰ رجوع کے ہیں۔ مگر اس رجوع سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک افعال حج سے رجوع مراد ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اپنے گھر کی طرف رجوع مراد ہے۔ اس پر یہ مسئلہ مبنی ہے کہ اگر طواف صدر کے بعد کسی ضرورت کے لئے مکہ میں ٹھہر گیا تو ہمارے نزدیک اعادہ لازم نہیں۔ اور ان کے نزدیک لازم ہے۔ اور اس طواف کے حکم میں دو قول ہیں مشہور قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ اور یہی ائمہ ثلاثہ کا قول ہے اور دوسرا قول یہ کہ یہ سنت ہے۔ یہ امام مالکؒ اور داؤد ظاہری کا مسلک ہے۔ یہ بحث عنقریب آتی ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز صبح مکہ میں پڑھی تھی؟

حضرت صفیہؓ کی ماہواری کا قصہ اور اس پر اشکال

(ق) "اور حضرت صفیہؓ نے آپؐ کو بتایا کہ وہ حائضہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا یہ ہمیں جانے سے روک رکھے گی؟ ۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ طواف افاضہ کر چکی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، طواف وداع کے بغیر ہی واپس) چلے۔" اھ (ش) حضرت صفیہؓ منیٰ سے واپسی کی رات حائضہ ہوئی تھیں، اس لئے ابن عربی کی "المحاضرہ" میں اس موقعہ پر لیلۃ النحر کا لفظ کتابت کی غلطی ہے۔ لیلۃ النحر کے بجائے "لیلۃ النفر" صحیح ہے۔ کیونکہ خود ابن عربی نے اس سے قبل لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اس دن یعنی یوم نحر کو طواف افاضہ کیا، اور لیلۃ النفر کو حائضہ ہوئیں"؛ اور اوجز میں ہے کہ وہ یوم النحر کا طواف کرنے کے بعد حائضہ ہوئیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا، پس ہم نے یوم نحر کو طواف کیا۔ پھر صفیہؓ کو ایام شروع ہوئے" الخ اور ان کے حیض کی ابتداء لیلۃ النفر (منیٰ سے واپسی کی رات) تھی، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لیلۃ النفر کو صفیہؓ حائضہ ہوئیں۔ پس کہنے لگیں کہ میرا خیال ہے میری وجہ سے تمہیں ٹھہرنا پڑیگا" الخ اور اوجز میں اس سلسلہ کی روایات کے اختلاف کو بہت ہی بسط کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: حضرت صفیہ کے قصہ میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے اشکال ہوتا ہے کہ "ہم نے حج کیا پس یوم نحر

(قلت) وطافت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا علی بعیرھا (قال) (و) رغبت عائشۃ رضی اللہ عنہا عمرۃ۔

ترجمہ: اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ (ق) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہ کی خواہش ظاہر کی۔

کو طوافِ افاضہ کیا۔ پس صفیہ حائضہ ہوگئیں، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت کا قصد کیا تو میں نے کہا کہ یا رسول اللہ وہ تو حائضہ ہیں:" الخ وجہ اشکال یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ یہ طوافِ افاضہ کر چکی ہیں تو یہ کیسے فرمایا کہ "کیا یہ ہم کو روک رکھے گی؟" اور اگر یہ معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے طوافِ افاضہ کر لیا ہے تو تحلل ثانی سے قبل مقاربت کا ارادہ کیسے فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات آپؐ سے طوافِ افاضہ کی اجازت حاصل کر چکی تھیں۔ اور آپؐ انہیں اجازت دے چکے تھے، پس اس بنا پر مقاربت کا ارادہ فرمایا کہ وہ حلال ہو چکی ہیں۔ مگر جب آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ حائضہ ہیں تو خیال فرمایا کہ شاید یہ قصہ طوافِ افاضہ سے قبل نہ پیش آیا ہو۔ اور اس کی وجہ سے وہ طوافِ افاضہ نہ کر سکی ہوں، اس لئے اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کو بتایا کہ یہ دیگر ازواج مطہرات کی معیت میں طوافِ افاضہ کر چکی ہیں۔ تو یہ اندیشہ زائل ہو گیا" اھ

حیض و نفاس والی عورتوں کے طوافِ وداع کا حکم

حیض و نفاس والی عورت کی طوافِ وداع سے قبل گھر کی طرف واپسی کا مسئلہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں مختلف فیہ تھا۔ بعد ازاں حضرت صفیہؓ کے قصہ کے پیش نظر جمہور امت کا اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ اس کے لئے واپسی جائز ہے، چنانچہ اوجز میں ہے کہ موفق لکھتے ہیں: "جب طوافِ وداع سے قبل کسی عورت کو حیض شروع ہو جائے تو وہ جا سکتی ہے۔ اس کے ذمہ طوافِ وداع نہیں، نہ کچھ فدیہ لازم ہے۔ یہ عام فقہاء امصار کا قول ہے اور حضرت عمرؓ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ ایسی عورت کو طوافِ وداع کے لئے ٹھہرنے کا حکم فرماتے تھے، اور حضرت زید بن ثابت بھی اسی کے قائل تھے۔ مگر انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا" الخ۔

(ش) اور (ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ پر طواف کیا۔ اس کی تفصیل یوم نحر کے بیان میں گزر چکی ہے۔ اور وہاں ابن حزم کا وہم بھی گذر چکا ہے، اور صحیح یہ ہے کہ ان کا یہ طواف، طوافِ وداع تھا۔ جو ۱۴ ذی الحجہ کی صبح کو کیا۔

حضرت عائشہؓ کا عمرۂ تنعیم

(ق) اور اس رات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمرہ کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھائی عبدالرحمنؓ کو

حکم فرمایا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرائیں۔ اور وہ رات ہی کو عمرہ سے فارغ ہوگئیں۔ ان کے اس عمرہ پر تفصیلی بحث موضع سرف میں ان کے حائضہ ہونے کے قصے میں گذر چکی ہے۔ اور وہاں شیخ ابن قیمؒ کا یہ قول بھی گذر چکا ہے کہ ان کے عمرے میں علماء کے چار مسلک ہیں۔ اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ ان کا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا تھی جو حیض کی وجہ سے فسخ کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک ان کا حج مفرد تھا۔ بخلاف ائمہ ثلاثہ کے، کہ ان کے نزدیک انہوں نے عمرہ پر حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے

(ق) پھر وہ عمرہ سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ محصب پہنچ گئیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم فارغ ہو گئے"۔ انہوں نے عرض کیا: "جی ہاں" پس آپؐ نے کوچ کا اعلان فرمایا۔ بخاری میں اسی طرح ہے"۔ اھ (ش) اس بارے میں روایات بہت ہی مختلف ہیں کہ حضرت عائشہؓ عمرہ سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس جگہ پہنچیں، راستہ میں؟ یا محصب میں؟ یا کسی اور جگہ؟ اور اس ناکارہ کے نزدیک اَوجَہ وہی ہے جو شیخ ابن قیمؒ نے ذکر کیا کہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محصب ہی میں جا کر ملی تھیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "میں تم دونوں کا انتظار کرتا ہوں"۔ اور واپسی پر فرمایا: "کیا تم فارغ ہو گئے"۔ اور جب حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وہ فارغ ہو چکے ہیں تو آپؐ نے کوچ کا اعلان کیا"۔ اس کے علاوہ اور روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اَوجَہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محصب میں ان کا انتظار فرمایا۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مگر ابھی تک محصب کی حدود سے نہیں نکلے تھے۔ پس جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ آپؐ کی منزل ہی میں آپؐ سے آ کر ملی تھیں اس سے ان کی مراد خیمہ نہیں۔ بلکہ محصب ہے۔ کیونکہ آپؐ خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ راستہ میں ملیں، ان کا قول اپنے ظاہر پر ہے۔ یعنی خیمہ سے نکل کر مکہ کی طرف کوچ کرنے کے راستہ میں۔ پھر جب حضرت عائشہؓ اور ان کے بھائی پہنچ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا تاکہ لوگ سامان وغیرہ باندھ کر تیار ہو جائیں۔ کہ یہ افعال کافی وقت اور کئی گھنٹوں میں ہو سکتے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز وہ حضرات جنہوں نے طوافِ وداع نہیں کیا تھا مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

(ق) اگر کہا جائے کہ اس حدیث کے درمیان اور حدیث اسود کے درمیان تطبیق کی کیا صورت

ہو گی۔ جو صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ملے درانحالیکہ آپ چڑھ رہے تھے۔ اور میں اتر رہی تھی، یا میں چڑھ رہی تھی اور آپؐ اتر رہے تھے: چنانچہ اس حدیث میں ہے کہ ملاقات راستہ میں ہوئی۔ شیخ ابن قیمؒ نے ان دونوں کے درمیان تطبیق کی دو صورتیں ذکر کی ہیں اور ایک تیسری صورت شیخ ابو محمد بن حزمؒ سے نقل کی ہے، جیسا کہ حاشیۂ لامع میں بسط کے ساتھ مذکور ہے۔ اور اس ناکارہ کے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ اس شک میں صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طوافِ وداع کے لئے محصب سے مکہ کی طرف اتر رہے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ عمرہ سے فارغ ہو کر مکہ سے محصب کی طرف چڑھ رہی تھیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات محصب میں اس وقت ہوئی جب کہ آپؐ خیمہ سے باہر تشریف لا چکے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر گذرا، اور یہ توجیہ ناگزیر ہے۔ اور اس کا عکس میرے نزدیک واضح طور پر غلط ہے، اس کی متعدد وجوہ حاشیۂ لامع میں مذکور ہیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ کہ یہ توجیہ ان تمام اعتراضات سے سالم ہے جو قاضی عیاضؒ اور حافظؒ وغیرہ نے اس قصہ کی روایات پر کئے ہیں۔ جن کی تفصیل حاشیۂ لامع میں ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ امام بخاری نے "باب الادلاج من المحصب" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اور 'ادلاج بسکون دال اول حصۂ شب میں چلنے کو کہتے ہیں۔ اور بتشدید دال رات کے آخری حصہ میں چلنے کو۔ اور امام بخاری نے اس باب میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے اور شارحین نے اس حدیث سے دونوں ترجمے ثابت کئے ہیں۔ بسکون دال کا حضرت عائشہؓ کے فعل سے، اور تشدید دال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے۔ منجملہ ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو صبح کی نماز مکہ میں پڑھی اور اس میں سورۂ طور کی قرأت کی۔ جیسا کہ بہت سی روایات میں معروف ہے۔ اور اس کا بیان آگے آتا ہے۔ پس یہ صورت بہت ہی بعید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول شب میں مکہ آئے ہوں، پھر محصب واپس تشریف لے گئے ہوں۔ اور نماز صبح کے لئے پھر مکہ آئے ہوں۔ اور یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس رات دو مرتبہ مکہ گئے، اور کوئی وجہ نہیں کہ طواف وداع سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس محصب تشریف لے گئے ہوں۔ اور نہ اس کی کوئی وجہ ہے کہ محصب سے دوبارہ مکہ جائیں جب کہ آپؐ طوافِ وداع سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور منجملہ

وھل دخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم البیت فی حجتہ ام لا۔

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حج میں بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے یا نہیں!

ان کے ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی بالاتفاق اسفلِ مکہ سے براستہ کُدیٰ ہوئی۔ پس یہ نہایت بعید ہوگا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طوافِ وداع سے فارغ ہوکر محصب چلے جائیں، جو اعلیٰ مکہ میں ہے۔ اور پھر اسفل مکہ سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے دوبارہ مکہ آئیں۔ ان کے علاوہ اور وجوہ ہیں جو حاشیۂ لامع میں مفصل مذکور ہیں۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ یہاں تین مسائل ہیں۔

حجۃ الوداع میں بیت اللہ کے اندر تشریف لیگئے یا نہیں

اول یہ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حج میں بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہوئے یا نہیں؟ پس بہت سے فقہاء کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا سنن حج میں سے ہے، کیونکہ ان کے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں بیت اللہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہوئے، حج یا عمرے میں نہیں۔ کیوں کہ ان کے خیال میں روایات میں صرف بیت اللہ میں داخل ہونے کا ذکر ہے۔ کذا فی الہدی ملخصاً مختصراً

(ش) حاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرۂ قضاء کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہونا متفق علیہ ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر داخل ہوئے یا نہیں؟ شیخ ابن قیمؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اسی طرح ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ اور شیخ نوویؒ بھی منکر ہیں۔ اور ابن سعدؒ نے حجۃ الوداع میں آپ کا داخل ہونا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح بیہقی بھی اسی طرف مائل ہیں، چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کو، جو آگے آتی ہے۔ حجۃ الوداع پر محمول کیا ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے نکلے درآنحالیکہ آپ بہت ہی خوش تھے۔ پھر واپس تشریف لائے تو غمگین تھے، پھر ارشاد فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں نے اپنی امت پر مشقت ڈال دی" اس حدیث کو ابو داؤد، ترمذی، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور ابن حبان بھی اس طرف مائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اور محب طبریؒ نے عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حج میں اور فتح مکہ کے موقعہ پر کعبہ شریف میں داخل ہوئے، اور علامہ سہیلیؒ اور ابن ہمامؒ اس طرف گئے ہیں کہ دونوں دفعہ کا داخلہ حجۃ الوداع ہی میں ہوا۔ ایک مرتبہ یوم النحر کو داخل ہوئے مگر نماز نہیں پڑھی۔ اور اس سے اگلے دن پھر داخل ہوئے اور نماز پڑھی، یہ حدیث دارقطنی نے بسند حسن ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ اور زیلعی نے بھی اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور مرقات میں ہے کہ میرک کہتے ہیں: "متعدد مرتبہ داخل ہونے کا احتمال مسلکِ جمہور کے خلاف ہے۔" میں کہتا ہوں۔ جن حضرات نے حجۃ الوداع میں آپؐ کے داخل ہونے کا انکار کیا ہے وہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کو فتح مکہ پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ بہت ہی بعید ہے۔ کیونکہ بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا افسوس اس مرتبہ کا نہیں ہو سکتا کہ فتح مکہ اور دیگر فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ میں اپنے گھر تشریف لانے تک باقی رہتا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ اور دیگر عظیم الشان فتوحات کی مسرت پر بھی غالب آجاتا۔ اور مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی اس غم کا اتنا غلبہ ہوتا کہ حضرت عائشہؓ دیکھتے ہی پہچان جاتیں۔ اور فوراً اس افسوس اور غم کی وجہ دریافت کرتیں جیسا کہ ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ اس کی طرف مشیر ہیں۔ کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جب میرے پاس سے تشریف لے گئے تھے تو خوش وخرم تھے۔ اور واپس تشریف لائے تو غمگین ہیں" الخ اس سے واضح تر الفاظ وہ ہیں۔ جو ملا علی قاری نے نقل کئے ہیں یعنی: "آج میں نے ایسا کام کیا کہ اگر مجھے پہلے خیال ہوتا۔ الخ اور یہی لفظ ابن سعد کی روایت کے ہیں۔ پس یہ روایت اس امر میں گویا نص ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونے کے بعد یہ واپسی اسی دن مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہؓ کے گھر ہوئی تھی۔ کذا فی حاشیۃ اللامع۔

بیت اللہ میں داخل ہونے کا حکم اور اس مسئلہ پر اوجز میں خوب بسط سے کلام کیا ہے، اور اس کی تلخیص حاشیہ لامع میں دو جگہ ذکر کی ہے۔ کتاب الحج میں۔ اور کتاب المغازی میں۔ اس میں کتاب الحج میں ہے: "ائمہ اربعہ کی فقہی کتابوں میں بیت اللہ شریف کے داخلے کو مندوبات میں ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ الموفق نے المغنی میں، نوویؒ نے مناسک اور شرح مہذب میں اسی طرح شارح لباب، ابن ہمام، صاحب نہر، صاحب درمختار اور ابن عابدین نے اس کی تصریح کی ہے، انہوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ بیت اللہ میں داخل ہونا مناسکِ حج میں شامل نہیں۔ اور شرح لباب میں ہے کہ داخل ہونے والوں سے اجرت لینا علماء امت کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے۔" اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ جس چیز کا لینا حرام ہے بلا ضرورت اس کا دینا بھی حرام ہے۔ اور یہاں کوئی ضرورت نہیں کہ یہ مناسک میں نہیں۔" اھ

وهل وقف صلی اللہ علیہ وسلم فی الملتزم ام لا۔

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے یا نہیں۔

العروۃ الوثقیٰ نووئی اپنے مناسک میں فرماتے ہیں: "خبردار! اس بدعت سے دھوکا مت کھائیو جو بعض اہل ضلالت نے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایجاد کی ہے کہ بیت اللہ کے دروازے سامنے کی دیوار میں جو بلند سی جگہ ہے اس کا نام انہوں نے "العروۃ الوثقیٰ" رکھ لیا اور خیال کیا کہ جو شخص اس کو پکڑ لے اس نے "العروۃ الوثقیٰ" کو مضبوط پکڑ لیا"

دنیا کی ناف "اور دوسری بدعت یہ کہ بیت اللہ کے اندر جو میخ ہے اس کا نام انہوں نے "دنیا کی ناف" رکھ لیا اور عوام کو اس پر آمادہ کیا کہ آدمی اپنی ناف ننگی کر کے اس پر پیٹ کے بل لیٹ جائے "تاکہ وہ اپنی ناف کو "دنیا کی ناف" پر رکھنے والا ہو" اھ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "یہ دونوں باطل امر جو نوویؒ نے ذکر کئے ہیں، بحمد اللہ کعبہ شریف سے ہٹا دیئے گئے ہیں" اھ شیخ ابن ہمام کہتے ہیں: "دیوار کعبہ کی بلند سی جگہ کو "العروۃ الوثقیٰ" کہنا، جیسا کہ عوام میں مشہور ہے، ایک بے اصل بدعت ہے، اور بیت اللہ شریف کے درمیان کی میخ کو جہاں "دنیا کی ناف" کہتے ہیں۔ اور اپنی ناف کھول کر اس پر رکھتے ہیں، یہ ایک ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے جو علم کجا! عقل سے بھی محروم ہو" اسی طرح ہمارے بہت سے حضرات مثلاً صاحب نور الایضاح، اور صاحب در مختار نے اس بدعت کا ذکر کیا ہے۔

ملتزم پر کھڑے ہونا مسئلہ دوم: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملتزم میں کھڑے ہوئے یا نہیں؟ صریح روایت دلالت کرتی ہے کہ آپ کا ملتزم میں کھڑا ہونا فتح مکہ کا واقعہ ہے، چنانچہ ابوداؤد میں عبدالرحمٰن بن ابی صفوانؓ سے روایت ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا، تو میں گیا، پس میں نے دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بیت اللہ سے نکلے، اور دروازہ شریف سے حطیم تک استلام کیا۔ اور اپنے رخسار بیت اللہ پر رکھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان میں تھے" نیز ابوداؤد نے عمرو بن شعیب سے اباً عن جدٍ روایت کی ہے کہ "میں نے حضرت عبداللہ کے ساتھ طواف کیا، جب ختم طواف کے بعد حجر اسود کا استلام کیا تو حجر اسود اور دروازہ بیت اللہ کے درمیان کھڑے ہوئے، اور اپنا سینہ، چہرہ، کلائیاں، اور ہتھیلیاں دیوار پر رکھیں، اور ان کو خوب پھیلایا۔ اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے

دیکھا ہے۔" اس میں احتمال ہے کہ یہ عمل طواف وداع کے موقعہ کا ہو یا کسی دوسرے موقعہ کا۔ لیکن حضرت مجاہدؒ اور ان کے بعد امام شافعیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ طوافِ وداع کے بعد ملتزم پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔" انتہیٰ۔ اور امام مالکؒ نے بلاغاً روایت کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ "رکن و مقام کے مابین حصہ ملتزم ہے۔" اوجز میں اس روایت پر مفصل کلام کیا ہے۔ نیز اس میں مسند الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کی روایت سے ملتزم کے پاس قبولیت دعا کی حدیثِ مسلسل ذکر کی ہے۔ اور موفق کہتے ہیں: "حدیث ابوداؤد کی بنا پر طواف وداع کرنے والے کے لئے ملتزم میں کھڑا ہونا مستحب ہے، منصور کہتے ہیں کہ میں نے حضرت مجاہد سے دریافت کیا کہ جب (بیت اللہ سے) وداع کا ارادہ کروں تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرو، مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھو، پھر چاہ زمزم پر جاکر کھڑے ہوکر پانی پیو، پھر ملتزم پر آکر اس کا استلام کرو، پھر دعا کرو، اور جو حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہوں مانگو، پھر حجر اسود کا استلام کرکے واپس آجاؤ۔" اھ اور نوویؒ نے اپنے مناسک میں طواف وداع کے بعد ملتزم کی دعا کو مستحب کہا ہے، اور ملا علی قاریؒ شرح لباب میں فرماتے ہیں: "اور وداع کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوکر سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کرے، پھر طواف کے سات پھیرے کرے، پھر دوگانۂ طواف ادا کرے، پھر زمزم پر آکر پانی پیئے، اور (ہوسکے تو) خود پانی نکالے، پھر ملتزم پر حاضر ہو، اور باب کعبہ پر حاضر ہوکر اس کی دہلیز کو چومے اور دعا کرے۔ یہ ترتیب جو ذکر کی ہے روایات میں یہی مشہور ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دوگانۂ طواف کے بعد ملتزم پر جائے، وہاں سے فارغ ہوکر زمزم پر آئے، اور وہاں سے واپس ہو اور پہلی ترتیب زیادہ صحیح ہے۔ جیسا کہ زیلعی اور کرمانی نے اس کی تصریح کی ہے۔" اور ہدایہ میں ہے: "پھر مکہ میں داخل ہو اور طواف بیت اللہ کے سات پھیرے کرے۔ ان میں رمل نہ کرے۔ یہ طواف صدر ہے۔ جسے طواف وداع کہتے ہیں۔ اور طواف کی دو رکعتیں پڑھے، پھر زمزم پر جاکر پانی پیئے، کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس پانی نکال کر نوش فرمایا، پھر باقی ڈول کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور مستحب ہے کہ بیت اللہ شریف کے دروازے پر حاضر ہو، اس کی دہلیز کو بوسہ دے، پھر ملتزم پر آئے۔ پس اپنا سینہ اور چہرہ اس پر رکھے، اور کچھ دیر تک پردۂ کعبہ کو پکڑے رہے، پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے، اسی طرح روایت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتزم پر یہ عمل کیا تھا۔"

وهل صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة الصبح صبيحة ليلة الوداع بمكة او خارجها

ترجمہ: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ الوداع کی صبح کو فجر کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟۔

قبولیت دعا کے مقامات

اور ابن ہمام فرماتے ہیں "ملتزم ان مقامات میں سے ہے جہاں دعا قبول ہوتی ہے" یہ بات حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔

اور حسن بصریؒ نے جو خط اہل مکہ کو لکھا تھا اس میں تحریر فرمایا تھا کہ وہاں پندرہ مقامات پر دعا قبول ہوتی ہے۔ طواف میں، ملتزم پر، میزاب رحمت کے نیچے، بیت اللہ کے اندر۔ زمزم کے پاس۔ مقام ابراہیم کے پیچھے، صفا پر، مروہ پر، سعی میں۔ عرفات میں، مزدلفہ میں۔ منیٰ میں۔ اور تینوں جمرات کے پاس، اور حسن بصری کے علاوہ دوسرے حضرات نے ذکر کیا ہے کہ بیت اللہ کو دیکھتے وقت اور حطیم میں بھی دعا قبول ہوتی ہے لیکن دوسرا مقام تحت المیزاب ہے "اھ اور علامہ جزری نے "حصن حصین" میں حضرت حسن بصری کا خط نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، یعنی روضہ شریف کے پاس۔ دعا قبول نہ ہو تو اور کہاں ہوگی؟" اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے حصن حصین کے حاشیہ میں حرز ثمین سے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "اسی طرح مسجد نبوی کے تمام مواضع میں دعا قبول ہوتی ہے۔ جیسے ممبر شریف اور ستونہائے شریفہ اور مدینہ منورہ کے باقی مشاہد اور ان کنوؤں کے پاس جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے۔ اور بقیع و اُحد میں صحابہ کرامؓ کے مقابر کے پاس، اسی طرح مسجد قباء اور تمام مساجد ماثورہ میں" انتہیٰ۔

صبح کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟

مسئلہ سوم: اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ الوداع کی صبح کو فجر کی نماز مکہ میں پڑھی یا بیرون مکہ؟ صحیحین میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ "انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (مرض کی) شکایت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا کہ سوار ہوکر لوگوں کے اوپر اوپر سے طواف کرلیجیو، چنانچہ انہوں نے طواف کیا درانحالیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ طور پڑھ رہے تھے" اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "جب صبح کی جماعت کھڑی ہو تو طواف کرلینا" اس حدیث سے بظاہر اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپؐ نے فجر کی نماز مکہ میں پڑھی، اور جن لوگوں نے کہا کہ یہ یوم النحر کی نماز فجر تھی یہ ان کا وہم ہے۔ کذا فی الہدی بتغیر و اختصار (ش)، اور یہ کہنا بھی وہم ہے کہ عشاء کی نماز تھی، جیسا کہ ابن خزیمہ کی روایت میں ہے اور یہ روایت شاذ ہے، جیسا کہ اوجز میں ہے۔ اور ابن التین سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس کو نماز نفل پر محمول کیا ہے، جیسا کہ فتح میں ہے،

(قلت) ثم خرج من مكة من طريق كُدیٰ

(ش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کدیٰ مکہ سے نکلے

اور بخاری کی روایت میں "نماز صبح" کا لفظ دوسرے تمام احتمالات کی تردید کرتا ہے۔

(ش) حجۃ الوداع کے سلسلہ کی دو حدیثیں باقی رہ گئیں جن کے محل کی تحقیق مجھے ابھی تک نہیں ہوسکی، انکی تفتیش کرلی جائے۔ایک تو ابو واقد اللیثی کی روایت اپنے باپ سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ حجۃ الوداع میں اپنی ازواج مطہراتؓ سے فرما رہے تھے "ھذہٖ ثم ظھور الحصر" یعنی "پس تمہارا یہ حج ہولیا، پھر چٹائی کی پشت سے چمٹے رہنا" یہ حدیث امام ابوداؤد نے کتاب حج کے آغاز میں ذکر کی ہے اور شیخ قدس سرہٗ نے بذل میں اس حدیث کی تشریح اور روافض کی تردید خوب شرح و بسط سے کی ہے، اسی طرح حافظ ابن حجرؒ اور حافظ عینی نے بھی اس حدیث پر کلام کیا ہے، مگر مجھے ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں کس جگہ یہ ارشاد فرمایا تھا۔

دوسری حدیث، اس کو بھی ابو داؤد ہی نے "باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی" میں عبداللہ بن خیار بن عدی کی روایت سے ذکر کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ "مجھے دو شخصوں نے بتایا کہ وہ دونوں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صدقات تقسیم فرما رہے تھے۔ انہوں نے بھی صدقہ کا سوال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر محسوس کیا کہ ہم قوی اور مضبوط ہیں؛ پس ارشاد فرمایا "تم چاہو تو تمہیں بھی دے دیتا ہوں مگر ان (صدقات) میں نہ غنی کا حق ہے نہ ایسے طاقتور کا جو کسب معاش پر قادر ہو"۔ یہ حدیث امام احمد، بیہقی اور دار قطنی نے بھی روایت کی ہے۔ اس میں حجۃ الوداع کی تصریح ہے، نیز امام طحاوی، نسائی، اور ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے مگر ان میں سے کسی کتاب میں تصریح نہیں ملی کہ یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حجۃ الوداع میں کس جگہ حاضر ہوئے تھے۔ اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ صدقات تقسیم فرمائے تھے، اس کی تفتیش کرلی جائے۔

کُدیٰ کے راستے سے واپسی

(ش) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براستہ کدیٰ مکہ سے نکلے۔ کُدیٰ، بضم کاف والف مقصورہ اسفل مکہ کا نام ہے۔ کدیٰ سے نکلنا مواہب اور البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا گیا ہے اور صحیحین وغیرہ کی روایات میں معروف ہے

راستہ بدلنے کی حکمت

حافظ کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حکمت کی بنا پر آمدورفت کا راستہ تبدیل فرمایا؟ اس میں مختلف قول ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اس میں

واستصحب معه من ماء زمزم شيئاً

ترجمہ: اور کسی قدر ماء زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔

حکمت یہ تھی کہ وہ سارے لوگ جو آپؐ کے راستہ میں آئیں، اس سے برکت حاصل کریں۔ پس یہاں بھی کچھ وہی باتیں ذکر کی گئی ہیں جو عید کے بیان میں ذکر ہو چکی ہیں۔ اور عید کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے میں اسے بالاستیعاب وہاں ذکر کر چکا ہوں، ان میں بعض امور یہاں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ داخلہ کے لئے بلندی کی جانب مناسب تھی کہ اس میں مکان کی تعظیم ہے۔ اور نکلنے کیلئے نشیب کی جانب مناسب تھی کہ اس میں فراق کی طرف اشارہ ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام مکہ میں اسی جانب سے داخل ہوئے تھے اس لئے یہ جانب اختیار کی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مکہ سے خفیہ نکلے تھے اس لئے ارادہ فرمایا کہ بلندی کی جانب سے بکمالِ ظہور داخل ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جو شخص اعلیٰ مکہ سے داخل ہو اس کو بیت اللہ کا استقبال حاصل ہوتا ہے اس لئے اس جہت کو اختیار فرمایا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں اس جانب سے داخل ہوئے تھے۔ اسلئے وہی معمول برقرار رہا" الخ پوری تفصیل وہاں دیکھ لی جائے۔

آبِ زمزم ساتھ لے جانا

اور البدایہ والنہایہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی پر کسی قدر آبِ زمزم بھی اپنے ساتھ لیا۔ چنانچہ ترمذی نے اپنی سند سے حضرت عائشہؓ کا یہ معمول نقل کیا ہے کہ "وہ اپنے ساتھ آبِ زمزم لے جاتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے لے جاتے تھے"۔ شیخ قدس سرہٗ کوکب میں فرماتے ہیں: "اس میں آبِ زمزم لیجانے کے جواز کی دلیل ہے مگر دوسری چیزوں کو، جو لے جانے سے کم ہو جاتی ہیں اور اس میں مکہ کا نقصان ہے۔ اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مٹی، کہ مٹی لے جانے میں وہاں کے مقامات میں نقص واقع ہوگا۔ اور گڑھے بن جائیں گے"۔ آھ شیخ قدس سرہٗ نے جو فرمایا ہے وہ بالکل واضح ہے کہ آبِ زمزم لے جانے سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ لاکھوں انسان اسے رات دن پیتے ہیں اور ہزاروں ڈرم ساتھ لے جاتے ہیں مگر وہ ذرا بھی کم نہیں ہوتا۔ اور در دیر نے آبِ زمزم بکثرت پینے اور اپنے ساتھ وطن لے جانے کو مندوبات میں ذکر کیا ہے۔ اور شرح لباب میں ہے کہ آبِ زمزم

(قال) ثم ارتحل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم راجعا الی المدینۃ (قلت) فلما وصل غدیر خُمّ خطب صلی اللّٰہ علیہ وسلم وذکر فیھا فضل علی رضی اللّٰہ عنہ

ترجمہ: (ق) پھر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (ش) پس جب غدیر خم پہنچے تو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اسمیں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔

کا وطن لے جانا مستحب ہے، تاکہ بندگان خدا اس سے برکت حاصل کریں۔ اس پر ترمذی کی مذکورہ بالا روایت دلیل میں پیش کی ہے، اور غیر ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم اس کو ساتھ لے جاتے تھے، مریضوں کو پلاتے اور ان پر چھڑکتے تھے اور حسن وحسین کی تحنیک بھی اسی کے ساتھ فرمائی تھی۔" میں کہتا ہوں کہ روایات میں یہ بھی آتا ہے، جیسا کہ کنز العمال میں ہے، کہ ماءِ زمزم کا ہدیہ مانگنے کا حکم فرمایا۔ اور یہ بحث طواف زیارۃ کے بیان میں گذر چکی ہے، کہ ماءِ زمزم تمام پانیوں سے افضل ہے۔

خطبۂ غدیر خُم

(ق) پھر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ۱۴ ذی الحجہ چہارشنبہ (بدھ) کی صبح کو مدینہ کیطرف واپسی کے لئے روانہ ہوئے (ش) پس جب غدیر خم پہنچے، حموی کہتے ہیں: غدیر بفتح اول وکسر ثانی۔ اور غدیر خم مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے، اس کے اور جحفہ کے درمیان دو میل کا فاصلہ ہے۔" اور "خم" کے بیان میں کہتے ہیں: زمخشری کا قول ہے کہ "خم" دراصل ایک رنگریز آدمی کا نام تھا اس کی طرف یہ تالاب منسوب ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ جحفہ سے تین میل پر ہے، اور صاحب مشارق کہتے ہیں: "اور خم ایک جگہ ہے جہاں چشمہ بہتا ہے۔ تالاب اور چشمہ کے درمیان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔" اور حازمی کہتے ہیں: "خم مکہ اور مدینہ کے مابین جحفہ کے پاس ایک وادی کا نام ہے، جہاں ایک تالاب ہے۔ اس کے پاس رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا۔" اور حموی نے غدیر اور خم کی وجہ تسمیہ میں اقوال بسط سے ذکر کئے ہیں، اول شیخ احمد بن عبدالحمید عباسی نے "عمدۃ الاخبار" میں ذکر کیا ہے کہ اسدی کہتے ہیں: "جحفہ سے تین میل پر راستے کی بائیں جانب چشمے کے برابر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی مسجد ہے، اور اس کے پاس ہی ایک بن ہے، یہی غدیر خم ہے، اور یہ جحفہ سے چار میل ہے۔" میں کہتا ہوں کہ یہی خم ہے جس کے نیچے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے منزل کی اور وہاں درخت کے نیچے ظہر کی نماز پڑھی، اور حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "اے اللّٰہ! جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔ الخ" اھ۔

تو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔ صاحب الہدایہ

والنہایہ کہتے ہیں: "فصل: اس حدیث کے ذکر میں جو حضرت علیؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے قریب ایک جگہ میں۔ جو غدیر خم کہلاتی ہے خطبہ دیا۔ اس میں حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی، اور بعض اہل یمن جو آپ کے ساتھ تھے ان کے اعتراضات سے ان کی برأت ظاہر فرمائی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے ان سے عدل وانصاف کا معاملہ کیا تھا جس کو ان میں بعض نے ظلم، تنگی اور بخل سمجھا، حالانکہ اس معاملہ میں علیؓ حق بجانب تھے، اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان مناسک سے فارغ اور مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو راستہ میں اس کو بیان فرمایا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بروز اتوار ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو "غدیر خم" میں ایک درخت کے نیچے ایک عظیم الشان خطبہ دیا، جس میں بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں۔ اور حضرت علیؓ کے فضل وکمال، عدل وانصاف اور آپؐ سے ان کی قرابت کو بیان فرمایا۔ جس سے بہت سے لوگوں کے دل میں جو شکوک وشبہات تھے وہ زائل ہو گئے، ہم یہاں ان منتخب احادیث کو ذکر کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی بیان کریں گے کہ ان میں کون سی صحیح ہے اور کونسی ضعیف۔ نیز یہ بتائیں گے کہ شیعہ کے لئے ان میں کوئی حصہ نہیں۔ نہ ان کے باطل مدعا پر کوئی دلیل وحجت ہے۔" اس کے بعد صاحب البدایہ والنہایہ نے ان روایات کو ذکر کیا ہے۔ اور ان میں سے بیشتر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے "من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ" (جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں) اور مشکوٰۃ میں بروایت احمد براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "غدیر خم" میں اترے تو حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تمہیں علم نہیں کہ مجھے اہل ایمان سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قرب وتعلق ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: بے شک۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ! جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔ اے اللہ! جو شخص علیؓ کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ، اور جو شخص اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔" اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی تو ان سے فرمایا اے ابن ابی طالب! تمہیں مبارک ہو کہ تم صبح وشام (یعنی ہر وقت وبہرحال) ہر مومن مرد وعورت کے محبوب اور دوست ہو گئے۔" اھ

ملا علی قاری کہتے ہیں: "شیعہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ یہ حدیث حضرت علیؓ کی خلافت پر نص صریح ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامامت (یعنی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق) کے ہیں۔

ورنہ لوگوں کو اس طرح جمع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ (ان کے خیال میں) ان کا سب سے قوی استدلال ہے۔
علماءِ اہلسنت نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مولیٰ بمعنی محبوب ہے، بلاشبہ حضرت علیؓ ہمارے آقا اور محبوب ہیں؛ اور مولیٰ کے کئی معنی ہیں، از آں جملہ ناصر وغیرہ ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث (ان کے مدعیٰ پر) نص بھی نہیں، چہ جائیکہ اسے "نص صریح" کہا جائے۔ اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالامامت ہیں تو اس سے مراد فی الحال نہیں بلکہ فی المآل ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی امام وہی ہوں۔
اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حدیث سے مقصود یہ ہے کہ جب ان کی خلافت کے لئے عقد بیعت ہوگا اس وقت وہ سب سے احق ہوں گے۔ لہٰذا یہ خلفائے ثلاثہ کی تقدیم کے منافی نہیں۔ کہ ان کی تقدیم پر تمام قابل ذکر لوگوں کا۔ حتیٰ کہ خود حضرت علیؓ کا بھی ۔۔۔ اجماع ہے۔ مزید براں یہ کہ حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت تک کبھی اس حدیث سے استدلال نہیں فرمایا۔ آپ کی خاموشی معمولی علم و عقل کے آدمی کے نزدیک بھی اس امر میں فیصلہ کن ہے۔ کہ حضرت علیؓ کے نزدیک یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی خلافتِ بلافصل میں نص نہیں، جیسا کہ خود حضرت علیؓ تصریح فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ان کی خلافت کی تصریح فرمائی نہ کسی دوسرے کی۔
علاوہ ازیں یہ کہ یہ حدیث خبر واحد ہے اور پھر اس کی صحت بھی مختلف فیہ ہے، پس جب شیعہ کا اس اصول پر اتفاق ہے کہ احادیثِ امامت میں تواتر شرط ہے تو انہیں اپنے اصول کے خلاف اس حدیث سے استدلال کی جرأت کیسے ہوئی! اس کو تناقض صریح اور تعارض قبیح کے سوا اور کیا نام دیا جاتے۔" اھ۔
اور صبح الاعشیٰ میں مسلمانوں کی اعیاد کے بیان میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "اور شیعہ نے ایک تیسری عید اختراع کر رکھی ہے، جس کو وہ "عید الغدیر" کا نام دیتے ہیں، جس کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غدیر خم میں حضرت علیؓ سے مؤاخات قائم کرنا ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس ہوئے تو غدیر خم میں اترے، اور صحابہؓ کرام کے درمیان مؤاخات قائم کی، مگر حضرت علیؓ کے ساتھ کسی صحابی کی مؤاخات قائم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ ان میں اس کی وجہ سے شکستگی پائی جاتی ہے۔ تو انہیں اپنے ساتھ ملایا، اور فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہارا تعلق مجھ سے وہی ہو جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور آپ نے صحابہؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "جس کا میں دوست ہوں، اس کا علیؓ دوست ہے"، یہ واقعہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کا ہے۔ شیعہ اس عید کو ساری رات نماز پڑھتے، اور اس کی صبح کو زوال سے قبل دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اور اس عید میں کپڑے

پہننا غلام آزاد کرنا۔ بکریاں ذبح کرنا اور اپنے پرائے سب سے الفت واکرام سے پیش آنا ان کا شعار ہے۔ اور شعراء وغیرہ ان کے بڑوں کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں"۔ اھ۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب "صبح الاعشیٰ" نے اس خطبہ کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے درمیان مواخات قائم کرنا جو ذکر کیا ہے میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیونکہ مواخات کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو مرتبہ پیش آیا۔ اول مکہ میں، جب کہ صرف مہاجرین کے درمیان حق وغم خواری کے لئے مؤاخات قائم فرمائی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے درمیان اور حضرت علی اور خود اپنی ذات کے درمیان مؤاخات فرمائی، اسی طرح قسطلانی نے کچھ اور مہاجرین کے نام بھی ذکر کئے ہیں۔ جن کے درمیان مؤاخات فرمائی۔ دوم: ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں قسطلانی کہتے ہیں: "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انس بن مالکؓ کے گھر میں مہاجرین وانصار کے درمیان ہمدردی وغم خواری کے لئے مؤاخات قائم کی۔ اور وہ (شروع شروع میں) اس مؤاخات کی بنا پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے"۔ جیسا کہ حاشیہ بخاری میں قسطلانی سے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس خطبہ کا سبب یہ ہے کہ بعض صحابہؓ خصوصاً اہل یمن نے حضرت علیؓ سے بے الفتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے "بعث علیؓ الی الیمن قبل حجۃ الوداع" کے ذیل میں حضرت بُریدہؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ:۔ "میں حضرت علیؓ سے بغض رکھتا تھا۔ ایک بار انہوں نے غسل کیا تو میں نے (ازراہ اعتراض) حضرت خالدؓ سے کہا: ان کو دیکھتے ہو؟ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو میں نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا" الحدیث۔ اور البدایہ والنہایہ میں حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ جہاد کے لئے یمن گیا، پس میں نے ان سے کچھ بے وفائی (جفوہ) محسوس کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو تنقیص کے انداز میں حضرت علیؓ کا ذکر کیا، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور متغیر ہو گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اے بریدہ! کیا مجھے تمام مومنوں سے ان کی جان سے بھی زیادہ تعلق نہیں؟ میں نے عرض کیا: بے شک۔ آپؐ نے فرمایا: جس کا میں دوست اور محبوب ہوں علیؓ بھی اس کے دوست اور محبوب ہیں"۔ یہ حدیث نسائی نے ابوداؤد حرانی سے اسی طرح روایت کی ہے"۔ اور شیخ ابن حجر مکیؒ نے "الصواعق المحرقۃ" میں شیعہ کے استدلال پر، جو انہوں نے امام المشارق والمغارب امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل پر اس حدیث سے کیا ہے، خوب ردّ کیا ہے اور اس کا کچھ حصہ مشکوٰۃ کے اردو ترجمہ

مظاہر حق میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ نیز صبح الاعشیٰ میں "اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ" کا اس موقعہ پر ذکر کرنا خلاف معروف ہے۔ کیونکہ روایات میں معروف یہ ہے کہ یہ ارشاد غزوۂ تبوک کو جاتے ہوئے فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے، اور حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنایا تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جاتے ہیں، اس پر آپؐ نے فرمایا: "کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہو جو ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔" اور ملا علی قاری نے مرقات میں اس مضمون کی متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ اور انہوں نے توربشتی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب کہ آپؐ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، اور حضرت علیؓ کو اپنے اہل پر خلیفہ مقرر کیا تھا۔ منافقوں نے اس کو خوب اڑایا۔ اور کہا کہ ان کو گرانی اور بے قدری کی بنا پر چھوڑے جا رہے ہیں۔ جب حضرت علیؓ نے یہ باتیں سنیں تو اپنے ہتھیار اٹھا کر نکلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپؐ اس وقت مقام جرف میں فروکش تھے، پس عرض کیا کہ یا رسول اللہ! منافق مجھے یوں طعنے دیتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "وہ جھوٹ کہتے ہیں، میں تجھے ان لوگوں کی خاطر چھوڑ کر جا رہا ہوں جو میرے پیچھے رہ جائیں گے۔ جا! میرے اور اپنے اہل و عیال میں میرا جانشین ہو، اے علیؓ کیا تو راضی نہیں کہ تیری نسبت۔" الحدیث، اور اس حدیث سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرنا راہ صواب سے بعید ہے۔ پوری بحث مرقات میں ہے۔ (ش) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ میں ارشاد فرمایا: "صدقہ نہ مجھ کو حلال ہے نہ میرے اہل بیت کو۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر جو اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے، یا اپنے آقاؤں کے علاوہ کسی اور سے موالات قائم کرے، بچہ اس کا ہے جس کے فراش پر پیدا ہوا اور زانی کے لئے پتھر ہے۔ وارث کیلئے وصیت نہیں۔" زیلعیؒ تخریج ہدایہ میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث ابن عدی نے زید بن ارقمؓ اور براءؓ سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم درخت کی شاخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک سے اٹھائے ہوئے تھے، پس آپ نے فرمایا: "صدقہ..... الحدیث ـــ اور اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ کا ذکر نہیں۔"

(قال) فلما کان بالروحاء لقی رکبا فسلم علیھم

ترجمہ: پس جب کہ آپؐ مقام روحاء میں پہنچے تو سواروں کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی، پس آپؐ نے ان کو سلام کہا۔

(ق) پس جب آپؐ مقام روحاء میں پہنچے، یہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے دوسری منزل ہے اس کے ضبط اور مسافت کا بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ کی مدینہ سے روانگی کے بیان میں گذر چکا ہے۔ تو سواروں کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی۔ رکب: راکب کی جمع ہے، یعنی سواروں کی جماعت۔ اور اوجز میں ہے کہ "میرے والد قدس سرہ نے اپنے شیخ حضرت قطب گنگوہی قدس سرہ سے درس نسائی کے افادات میں نقل کیا ہے کہ: ملاحظہ روایات سے جو بات منقح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ سوال بیت اللہ کو جاتے وقت ہوا تھا، اس لئے یہاں صدور سے مراد مدینہ سے روانگی ہے"۔ اور حضرت گنگوہیؒ کے کلام میں لفظ "یہاں" سے مراد نسائی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: "صدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما کان بالروحا الخ" یعنی "لوٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک کہ جب روحاء میں پہنچے"۔ شیخ ابن قیمؒ نے الہدیٰ میں اور ہمارے شیخ نے بذل میں یہ رائے اختیار کی ہے کہ یہ قصہ مکہ سے واپسی کا ہے، اس کی تائید ایک تو نسائی کی مذکورہ روایت کے لفظ "صدر" سے ہوتی ہے، دوسرے مسند شافعیؒ اور بیہقی میں بطریق شافعیؒ عن ابن عیینہ عن ابراہیم اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قفل فلما کان بالروحاء الخ" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے۔ یہاں تک کہ جب روحاء پہنچے"۔ اوجز کی عبارت ختم ہوئی۔ اور شیخ گنگوہی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے اس حدیث کو کتاب الحج کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ پس آپؐ نے ان کو سلام کہا اور دریافت فرمایا کہ کون لوگ ہیں؟ اس حدیث میں ایک اشکال ہے۔ اور وہ یہ کہ آگے حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کیا کہ آپؐ کون ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے واپسی تک نہیں پہچانا؟ نہ طواف میں، نہ عرفات میں، نہ منیٰ کے خطبات میں؟ اس کا جواب نوویؒ نے اور ان کی پیروی میں زرقانی نے شرح مواہب میں یہ دیا ہے کہ "عیاض کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ ملاقات رات کے وقت ہوئی ہو۔ اس لئے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا ہو، اور احتمال ہے کہ دن کا وقت ہو مگر انہوں نے اس سے قبل آپؐ کی زیارت نہ کی ہو۔ کہ اپنے علاقے میں اسلام لائے اور اس سے قبل ہجرت نہیں کی الخ مگر یہ جواب نہایت

فاخرجت امرأة من محفتها صبيًا لها فقالت الهذا حج فقال نعم ولك اجرٌ

ترجمہ: پس ایک عورت نے اپنے ہودج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کہ کیا اس کا بھی حج ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں؛ اور ثواب تجھے ہوگا۔

بعید ہے۔ کیونکہ بظاہر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شرکت کے بعد واپس آ رہے ہوں گے اِلّا یہ کہ یہ کہا جائے کہ انہوں نے اس سال حج بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حج سے واپسی پر آپ سے ملے تھے۔ پس ایک عورت نے اپنے ہودج سے اپنا بچہ نکالا اور عرض کیا کہ کیا اس کا بھی حج ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہاں؛ اور ثواب تجھ کو ہوگا۔ مِحَفَّۃ: بالکسر۔ عورتوں کا مرکب جو ہودج کی طرح ہوتا ہے مگر اس پر قبہ نہیں ہوتا۔ کذا فی البذل۔

بچے کے حج کے مسائل: اوجز میں اس حدیث کے ذیل میں بچے کے حج کے مسائل بڑی تفصیل سے ذکر کئے ہیں۔ اس کا خلاصہ حاشیہ لامع میں ان الفاظ میں مذکور ہے: "اس میں چند فصول میں کلام ہے۔ اوّل: بچوں کے ساتھ حج کرنا مشروع ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں "علماء کے درمیان اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کو صرف اہلِ بدعت کے ایک ناقابلِ التفات گروہ نے ممنوع کہا ہے۔ ان کا یہ قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل، صحابہ کے عمل اور اجماعِ اُمّت سے مردود ہے"۔

دوّم: اس کا حج منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس پر احکام حج جاری ہوتے ہیں یا نہیں؟ جمہور کا قول ہے بچہ کے ذمہ فدیہ اور دم جبر لازم ہے۔ اور اس پر بالغ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ اس میں امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ممنوعات احرام میں کوئی چیز اس پر لازم نہیں آتی۔ اور اسی سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بچے کا حج منعقد ہی نہیں ہوتا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا حج نفل منعقد ہوتا ہے۔

سوّم: کیا اس کے ذمہ جزاء اور کفارات لازم ہیں؟ زرقانی کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ جزاء، فدیہ اور کفارات لازم ہیں، یہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا قول ہے۔ اور حنفیہ کو اس سے اختلاف ہے"۔ میں کہتا ہوں صحیح یہ ہے کہ کفارات کے ساقط کرنے میں حنفیہ متفرد نہیں، بلکہ بعض حالات میں ائمہ ثلاثہ اور ابن حزم بھی اپنی ظاہریت کے باوصف ان سے موافقت کرتے ہیں۔

(قلت) واناخ راحلته بالبطحاء فبات بها وصلی بها۔

ترجمہ: (ش) اور آپ نے بطحاء میں اپنی اونٹنی بٹھائی، پس وہاں رات رہے اور نماز پڑھی۔

چہارم: ائمہ اربعہ کے نزدیک بچے کو اسکے حج اور دیگر حسنات پر ثواب ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کا اختلاف نہیں جس کا قول لائق اتباع ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کی حسنات صرف اسی کے لئے ہوتی ہیں۔ ماں باپ کو ان میں سے کچھ نہیں ملتا؟ یا یہ کہ ماں باپ کو پورا ثواب ملتا ہے۔ اور بچے کے اجر میں بھی کمی نہیں کی جاتی۔

پنجم: کیا اس کا حج، حج فرض کی جگہ کفایت کرے گا؟ ائمہ اربعہ کا اجماع ہے کہ کفایت نہیں کرے گا۔ بلکہ بالغ ہونے کے بعد اسے حج کرنا ہوگا۔ ظاہریہ کا قول ہے کہ بس یہی کافی ہے۔

ششم: بچے کی طرف سے کونسا ولی احرام باندھے؟ اس میں وسیع اختلاف ہے۔

ہفتم: اگر بچہ دوران حج بالغ ہوجائے تو کیا کرے؟ اور کیا اس کا حج فرض ادا ہوجائے گا؟ اس میں بھی طویل کلام ہے۔ جو اوجز میں مفصل مذکور ہے۔" حاشیہ لامع کا خلاصہ ختم ہوا۔

بطحاء میں رات گذارنا

(ش) اور آپ نے بطحاء ذی الحلیفہ میں اپنی اونٹنی بٹھائی۔ پس وہاں رات رہے اور نماز پڑھی۔ اور موطا میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطحاء ذی الحلیفہ میں پڑاؤ کیا، پس وہاں نماز پڑھی" امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "حج سے واپسی میں کسی کے لئے مناسب نہیں کہ اس منزل میں نماز پڑھے بغیر یہاں سے تجاوز کرے، الخ" اور اوجز میں ہے کہ راوی کا قول "پس نماز پڑھی" یعنی جب اپنے حج سے واپس ہوئے۔ باجیؒ کہتے ہیں کہ واپسی کی تخصیص اس بناء پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف واپسی میں یہاں پڑاؤ کیا تھا" اھ۔

میں کہتا ہوں کہ بخاری میں حدیث المساجد میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرہ کے لئے تشریف لے جاتے تو ذی الحلیفہ میں فروکش ہوتے۔ اور (جب حج کیا تب بھی ذی الحلیفہ میں ٹھہر کر گئے) اور جب کسی غزوہ سے واپس آتے [اور ذوالحلیفہ راستے میں واقع ہوتا] یا حج وعمرہ سے واپس آتے تو وہاں بطن وادی میں اترتے، اور جب وادی کے نشیب سے اوپر چڑھتے تو اس بطحاء میں جو وادی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، رات کو پڑاؤ کرتے، اور صبح تک وہاں قیام کرتے" الی آخر الحدیث۔ اور بخاری شریف میں کتاب الحج کے آخر میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ کیطرف

(قال) ودخل صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ من طریق المعرس (قلت) فلما طلع لہ احد
فقال ھذا اجبل یحبنا و نحبہ

ترجمہ (ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس داخل ہوئے، (ش) پس جب جبل احد آپ کے لئے نمودار ہُوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جسے ہم سے محبت ہے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔

تشریف لے جاتے تو مسجد شجرہ میں نماز پڑھتے اور جب واپس آتے تو ذوالحلیفہ میں بطن وادی میں نماز پڑھتے۔ اور وہاں صبح تک رات رہتے" اور اوجز میں ہے کہ "قاضی کہتے ہیں کہ حج سے واپسی میں بطحا ذوالحلیفہ میں اترنا مناسک حج میں سے نہیں، اہل مدینہ میں سے جو حضرات اس پر عامل تھے ان کا مقصود محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے برکت حاصل کرنا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ یہ بطحا و بابرکت ہے۔ اور امام مالکؒ نے یہاں اترنے اور نماز پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے کہ بغیر نماز پڑھے آگے نہ بڑھے۔ اور اگر نماز کا وقت نہ ہو تو یہاں ٹھہرے یہاں تک کہ نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ اور کہا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس لئے منزل کی تھی تاکہ لوگ اپنے گھروں میں رات کو اچانک نہ جائیں، جیسا کہ احادیث مشہورہ میں اس سے صراحۃً ممانعت آئی ہے۔ یہ نووی نے کہا ہے" اھ اور امام نسائیؒ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ جانے کا ہے، واپسی کا نہیں کیونکہ انہوں نے یہ حدیث مبدا احرام میں ذکر کی ہے۔

مدینہ میں براہ مُعَرَّس داخلہ

(ق) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں براہ معرس دن کے وقت داخل ہوئے۔ مُعَرَّس بفتح راء مشددہ و مہملتین۔ یہ مکہ سے مدینہ آتے ہوئے راستہ پر ایک معروف جگہ ہے۔ جو ذی الحلیفہ سے نیچے اور اس کی نسبت مدینہ سے قریب تر ہے۔ کذا فی الزرقانی۔

جبل اُحد سے محبت

(ش) پس جب جبل اُحد آپ کے سامنے نمودار ہُوا تو فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔ اوجز میں ہے کہ زرقانی کہتے ہیں: "یعنی جب خیبر سے نکلے (تو یہ ارشاد فرمایا)"۔ میں کہتا ہوں کہ روایات میں یہی معروف ہے (جو زرقانی نے کہا) اور حافظ کہتے ہیں کہ "بخاری کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب کہ حج سے واپسی میں اس پر نظر پڑی۔ اور ابو حمیدؓ کی روایت

(قال) فدخل صلی اللہ علیہ وسلم قائلاً ائبون، تائبون، عابدون، ساجدون لربنا

..... حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

ترجمہ: (ق) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے: ائبون، تائبون، عابدون، ساجدون، لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

میں ہے کہ آپ نے یہ ارشاد غزوہ تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشاد کئی بار فرمایا۔ اھ یہ حدیث امام مالکؒ نے موطا میں تحریم المدینہ میں ذکر کی ہے۔ اور زرقانی کہتے ہیں: ارشاد نبوی: "اس کو ہم سے محبت ہے" حقیقت پر محمول ہے جیسا کہ ایک جماعت نے اس کو راجح کہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی طرح خطاب فرمایا جس طرح ذی عقل سے کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: "اے اُحد! ٹھہر جا"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس میں محبت ودیعت فرمائی جس طرح داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں میں تسبیح پیدا فرمائی۔ اور جس طرح ان پتھروں میں خشیت پیدا فرمائی جن کے بارے میں ارشاد ہے؟ "اور بے شک بعض پتھر گر جاتے ہیں اللہ کے خوف سے" اور جس طرح اُسطوانہ میں بچے کی طرح رونے کی تخلیق فرمائی، وغیرذالک، اور ارشاد نبوی "ہم اس سے محبت رکھتے ہیں" بھی حقیقت پر محمول ہے۔ کیونکہ جو محبت کرے اس کی جزا یہی ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ نیز اس لئے کہ وہ جنت کے پہاڑوں میں سے ہے، جیسا کہ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی اہل اُحد انصار ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اور وہ جبل احد کے ہمسایہ تھے۔ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی۔ اور آپ کو ان سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لاتے تو چونکہ جبل احد بزبانِ حال آپ کو قرب اہل کی بشارت دیتا تھا، پس آپ اس کو دیکھتے ہی سفر سے واپسی اور اہل کے قرب سے مسرور ہو جاتے (اسی کو محبت سے تعبیر فرمایا) پھر او جز میں جبل احد، جبل رحمت (جو عرفہ میں ہے) جبل ابی قبیس اور جبل طور جس پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ کے مابین فضیلت پر مختصر سا کلام کیا ہے۔

مدینہ میں داخل ہونے کی دعا

(ق) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھتے ہوئے (مدینہ طیبہ میں) داخل ہوئے!

ائبون، تائبون، عابدون، ساجدون،	ہم رجوع کرنیوالے توبہ کرنیوالے عبادت کرنیوالے سجدہ کرنیوالے
لربنا حامدون، صدق اللہ وعدہٗ،	اور اپنے رب کی حمد کرنیوالے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ
ونصر عبدہٗ، وھزم الاحزاب وحدہٗ،	سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی۔ اور تمام (طاغوتی) لشکروں کو تنہا شکست دے دی۔

(قلت) وقال صلى الله عليه وسلم لام سنان وام معقل وغيرهما بعد الرجوع الى المدينة

ترجمہ: (ش) اور مدینہ کی واپسی کے بعد ام سنانؓ اور ام معقل وغیرہ سے فرمایا۔

زرقانی کہتے ہیں کہ "ارشاد نبوی" اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا" یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے اظہار دین وغیرہ کے جو وعدے کئے تھے وہ پورے کر دیئے۔ یہ دعا سفر جہاد کی ہے۔ اور حج و عمرہ کے ساتھ اس کی مناسبت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا "لتدخلن المسجد الحرام" یہ وعدہ پورا ہو گیا" اھ اور امام بخاری نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے "باب ما یقول اذا رجع من الحج او العمرۃ او الغزو" اور اس کے تحت حضرۃ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جہاد یا حج یا عمرہ سے واپس تشریف لاتے تو زمین کی ہر بلندی پر تین مرتبہ تکبیر کہتے۔ پھر یہ دعا پڑھتے۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، وھو علی کل شیء قدیر، آئبون تائبون الخ" نیز امام بخاری نے ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے "باب من اسرع ناقتہ اذا بلغ المدینۃ" اور اس کے ذیل میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے، اور مدینہ کے بلند راستوں پر نظر پڑتی تو حُبّ مدینہ کی بنا پر ناقہ کو تیز کر دیتے یا کوئی سواری ہوتی تو اسے تحریک فرماتے۔

ام معقل کے قصہ میں روایات کا اضطراب

(ش) اور مدینہ کی واپسی کے بعد ام سنانؓ اور ام معقلؓ وغیرہ سے فرمایا کہ رمضان کا عمرہ میرے ساتھ حج کے برابر ہے۔ اور اس شخص کا وہم ہے جس نے یہ کہا کہ یہ ارشاد مدینہ سے تشریف لے جانے سے قبل فرمایا تھا۔ جیسا کہ مدینہ سے تشریف لے جانے کے بیان میں اس پر تنبیہ گذر چکی ہے۔ جس خاتون کو یہ ارشاد فرمایا تھا اس کے نام کی تعیین میں روایات مختلف ہیں۔ بخاریؒ "باب حج النساء" میں ہے کہ یہ ارشاد ام سنانؓ کو فرمایا تھا۔ اور شیخ قدس سرہ لامع میں "باب عمرۃ فی رمضان" میں فرماتے ہیں: "یہ حدیث جو اس باب میں مصنف نے ذکر کی ہے اس باب کی صحیح تر روایت ہے، پس ابو داؤد میں اس عورت کا جو قصہ مروی ہے اسے یا تو بخاری کی روایت کی طرف راجع کیا جائے یا غلطی کی طرف منسوب کیا جائے گا" اھ اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ "شیخؒ کا قول یا غلطی کی طرف منسوب کیا جائیگا" اس قول پر مبنی ہے کہ ام سنان اور ام معقل دونوں ایک ہی خاتون کے نام ہیں جیسا کہ عینیؒ نے نقل کیا ہے، اور ابو داؤد کی روایت کو خطاء کی طرف منسوب

ان عمرۃ فی رمضان تعدل حجۃ معی۔

ترجمہ: کہ رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے مساوی ہے۔

کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی روایت میں اضطراب ہے اور اس ناکارہ کے نزدیک یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ متعدد واقعات ہیں:" آھ۔

میں کہتا ہوں کہ ابوداؤد نے ام معقل کا قصہ مختلف طرق وروایات سے ذکر کیا ہے، اور شیخ نے بذل میں اس موقعہ پر لکھا ہے کہ "اس حدیث میں بہت ہی اضطراب ہے" اور اضطراب کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس اشکال کو رفع کرنے سے تعرض کیا ہو۔ بجز اس کے جو مولانا محمد یحییٰ مرحوم نے اپنے شیخؒ کے افادات سے نقل کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "قصہ ابی معقل کی روایات متعارض ہیں۔ ان روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ ابو معقل کے پاس ایک اونٹ سواری کے لئے تھا اور ایک زراعت کے لئے۔ الخ" پوری تفصیل بذل میں دیکھ لی جائے۔ اور حافظؒ ام سنانؓ کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اسی نوعیت کا قصہ ام معقل کا بھی ہے، جو نسائی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دو قصے الگ الگ ہیں۔ جو دو عورتوں کو پیش آئے۔ اور اسی قسم کا ایک قصہ ام طلیق کا ہے جو ابن السکن اور ابن مندہ نے نقل کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ ام معقل اور ام طلیق ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ مگر ان کا خیال محل نظر ہے۔ کیونکہ ابی معقل کا انتقال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا اور ابو طلیق آپؐ کے بعد مدت تک زندہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں جدا جدا ہیں۔ نیز دونوں روایتوں کے سیاق کا مختلف ہونا بھی ان کے تغائیر پر دلالت کرتا ہے۔ اور بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں "انصار کی ایک عورت" کا جو لفظ مبہم واقع ہوا ہے اس کی تفسیر ام سنان یا ام سلیم ہی کے ساتھ کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ حدیث ابن عباسؓ کا قصہ دوسری احادیث کے قصہ سے مختلف ہے، نیز ابن عباسؓ کی حدیث میں اس عورت کو "انصاریہ" کہا گیا ہے۔ جب کہ ام معقل کا تعلق بنو اسد سے ہے۔ اور یہی واقعہ ہیثم کو بھی پیش آیا۔ واللہ اعلم۔" انتہی۔

رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے

(ارشاد نبوی) کہ "رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے مساوی ہے" "معی" (میرے ساتھ) کا لفظ بعض روایات میں نہیں۔ مگر ابوداؤد کی روایت میں موجود ہے۔ اور امام بخاری نے بھی "باب حج النساء" میں یہ لفظ ذکر کئے ہیں! ...

"تقضی حجۃ او حجۃ معی" (یعنی بدل ہے حج کا، یا فرمایا میرے ساتھ کے حج کا) اور ابن حجرؒ کی شرح مناسک نووی میں رمضان کے عمرہ کی فضیلت میں ابن حبان وغیرہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔" آھ اور حاشیۂ لامع میں ہے کہ کرمانی کہتے ہیں: "اگر تم کہو کہ حدیث کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ جو عمرہ رمضان میں ادا کیا جائے وہ حجۃ الاسلام (حج فرض) کے قائم مقام ہے۔ تو کیا واقعی رمضان کے عمرہ سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ثواب میں حجۃ الاسلام کی مثل ہے اور قائم مقام نہ ہونے کا قرینہ اجماع ہے۔ اور ترمذی نے اسحاق بن راہویہؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کا مضمون اس حدیث کی نظیر ہے جس میں آتا ہے کہ قل ھو اللہ احد (یعنی سورہ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔" ابن عربی کہتے ہیں: "فضیلت عمرہ کی حدیث اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ پس عمرہ کے ساتھ رمضان مبارک مل جائے تو وہ حج کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔" ابن جوزیؒ کہتے ہیں: "یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ عمل میں شرف وقت کے شامل ہونے سے اس کے ثواب میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس طرح حضور قلب اور خلوص نیت سے اضافہ ہوتا ہے، ابن التین کہتے ہیں کہ عمرہ کے حج کی مثل ہونے میں احتمال ہے کہ وہ اپنے باب پر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رمضان کی برکت سے ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ شرف صرف اس عورت کے ساتھ مخصوص ہو، جیسا کہ بعض سلف سے منقول ہے، چنانچہ سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "ہم تو اس فضیلت کو صرف اسی خاتون کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔" اور سنن ابوداؤد میں ام معقل سے روایت ہے کہ: "حج حج ہے، عمرہ عمرہ ہے، پس میں نہیں جانتی کہ یہ صرف میرے لئے ہے یا سب لوگوں کے لئے۔" مگر ظاہر یہی ہے کہ اسے عموم پر محمول کیا جائے۔" اور علامہ عینیؒ نے تفصیل سے ان حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی ذکر کئے ہیں جن سے یہ حدیث مروی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو بروایت ترمذی شریف ام معقل سے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور اس باب میں ابن عباسؓ، جابرؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ اور وہب بن خنبش سے احادیث مروی ہیں (یہ نام تو امام ترمذی نے ذکر کئے ہیں) اور علامہ عینیؒ نے اس پر یوسف بن عبداللہ، ابو طلیق اور ام طلیق کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اور عینیؒ نے ان روایات کی تخریج خوب بسط سے کی ہے۔ اور ان میں سے بہت سی روایات میں کسی مخصوص عورت کا ذکر کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ "رمضان کا عمرہ

حج کے برابر ہے۔" حافظ کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے اشہر حج میں کئے، اور حدیث الباب سے رمضان کے عمرہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے پس ان دونوں میں سے افضل کونسا ہوا؟ (اشہر حج کا عمرہ یا رمضان کا؟) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے لئے تو رمضان ہی کا عمرہ افضل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا جو آپ نے کیا۔ کیونکہ اہل جاہلیت کے نزدیک اشہر حج میں عمرہ ممنوع تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و عملاً ان کی تردید کا قصد کیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس کے بیان جواز کے لئے تھا۔ لہٰذا یہ اگر دوسروں کیلئے مکروہ بھی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہی افضل تھا" حاشیہ لامع کا مضمون ختم ہوا۔

خاتمہ رسالہ

میں نے ان چند اوراق میں جن مضامین کے ذکر کرنے کا ارادہ کیا تھا یہاں ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و توفیق سے بروز ہفتہ ۲۳ ماہ مبارک ربیع الاول کی صبح کو اسی سال اس سے فراغت ہوئی۔ جو آغاز رسالہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی رشد و صواب کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ پس اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی حمد اور حسن توفیق سے ایک دن رات اور نصف رات میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔ البتہ حواشی کا اضافہ متفرق اوقات میں ہوتا رہا۔ اس رسالہ کی تالیف جیسا کہ آغاز رسالہ میں ذکر کیا جا چکا ہے، ۱۳۴۲ھ میں ہوئی تھی، پس جب کبھی ماخذ و مراجع کی ضرورت پیش آتی تو متقدمین کی شروح حدیث اور کتب مشہورہ مثلاً فتح اور عینی وغیرہ کا حوالہ دے دیتا تھا۔ اور طویل عبارتوں کو نقل کرنے کی بجائے صرف حوالہ پر کفایت کرتا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اوجز المسالک، الکوکب الدری اور لامع الدراری کی تالیف کی توفیق عطا فرمائی اور ان میں یہ عبارات اور نقول سب جمع ہوگئیں تو اس رسالہ میں صرف ان کے حوالے اور اقتباس پر اعتماد کیا، تاکہ مراجعت میں سہولت ہو۔ اور جب بعض احباب کے اصرار پر اس رسالہ کی طباعت کا ارادہ ہوا تو چونکہ ضعف بصر کی بنا پر خود مراجعت سے معذور تھا۔ اس لئے عزیز داماد مولوی محمد عاقل استاذ حدیث مظاہر العلوم سہارنپور اور عزیز داماد مولوی محمد سلمان مدرس مدرسہ مظاہر العلوم نے اس کو پڑھا، رسالہ کے بین السطور اور حاشیہ میں جن احادیث و عبارات کی طرف اشارات تھے۔ میں نے ان دونوں عزیزوں سے ان کے نقل کرنے کی فرمائش کی چنانچہ ایک پڑھتا رہا اور دوسرا نقل کرتا رہا۔ اور میں سنتا رہا۔ پس میں نے تنقیح اور اختصار کے ساتھ ان عبارات کو لیا، اور جہاں یہ اشارات

اس رسالہ میں مختصر تھے اور وہ مباحث کتابوں میں بلسوط اور بہت سے فقہی فوائد پر مشتمل تھے۔ وہاں بقدر ضرورت ان اشارات کی وضاحت کر دی اور ناظرین کے لئے اوجز اور لامع وغیرہ کتابوں کا حوالہ دے دیا۔

اور عزیز مولوی محمد یوسف جونپوری سلمہٗ استاذ حدیث مدرسہ مظاہر علوم نے اس رسالہ کو گہری نظر سے دیکھا اور بعض مقامات میں کچھ اضافے بھی کئے، اللہ تعالیٰ ان تینوں عزیزوں کی مساعی کو قبول فرمائے، اور جن لوگوں نے اس رسالہ میں اور میری دوسری تالیفات میں اعانت کی اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔

والحمد للّٰہ اولاً واخراً، والصلوٰۃ والسلام

الاتمان الاکملان علی سید الانس

والجان صلوٰۃً وسلاماً دائمین

متلازمین الیٰ یوم

الدین ہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حامداً و مصلیاً و مسلماً، وبعد: جب میں جزء حجۃ الوداع کے سننے سے فارغ ہوا اور اس کی تبییض ربیع الآخر کی آخری جمعرات کی صبح کو پوری ہوئی تو میں نے جمادی الاولیٰ کی پہلی بدھ کو دوپہر کے قیلولے میں یہ خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھے حکم دیتا ہے کہ میں جزء حجۃ الوداع کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کے بیان سے کروں اور اس نے کہا کہ جزء حجۃ الوداع کی تکمیل کے لئے آپؐ کے عمروں کی تفصیل ضروری ہے، پس خواب ہی میں مَیں نے اس کے حکم کی تعمیل کی، اور کاغذ قلم لے کر اپنے قلم سے لکھنے لگا، اس وقت گویا مجھے نہ آنکھ کی تکلیف ہے، نہ کوئی اور عارضہ ہے۔ اور میں نے خواب ہی میں "حدیثِ جعرانہ" کے دو جملوں کی شرح لکھدی، پہلا جملہ جامع الطریق طریق المدنیۃ ۔ اور دوسرا جملہ: فاصبح بمکۃ کبائت ۔ اس کے بعد میں (خواب ہی میں) ایک تبلیغی اجتماع کے لئے گیا ـــ آگے بڑا طویل خواب ہے جو اس دن دیکھا تھا۔ خواب سے بیدار ہوا تو مجھے اس خواب پر بہت ہی حیرت ہوئی، کیوں کہ اُن بہت سے امراض کے علاوہ۔ جو اس زمانہ میں مجھے عارض ہیں، ایک مہینے سے تو آنکھ کی بھی شدید تکلیف ہے چنانچہ دو ہفتے تک اس سلسلہ میں متحیر اور متأمل رہا، کبھی اس کام کا ارادہ کرلیتا اور کبھی توڑ دیتا، مگر اس دور کے مشائخ، مثلاً مولانا الحاج انعام الحسن کاندھلوی امیر تبلیغ دہلی، مولانا الحاج ابو الحسن علی ندوی شیخ التفسیر و ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا الحاج مفتی محمود حسن گنگوہی رئیس الافتاء دار العلوم دیوبند وغیرہ نے اس خواب کی تعمیل پر بہت ہی اصرار فرمایا، پس بہت ہی پس و پیش کے بعد

اللہ عزّ اسمہ سے مدد مانگتے ہوئے اور اس کی رحمت کی اُمید کرتے ہوئے، ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ کو بروز چہارشنبہ اس کا آغاز کر دیا اور اس رسالہ میں پانچ فصلیں لکھنے کا ارادہ کیا:

فصل اول: عمرہ کی تعریف، اس کے حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کی تعداد کے بیان میں۔

فصل دوم: عمرۂ حدیبیہ میں ——— فصل سوم: عمرۃ القضاء میں

فصل چہارم: عمرۂ جعرانہ میں ——— اور جو عمرہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے ساتھ ادا کیا تھا۔ اس کا بیان جزء حجۃ الوداع میں گذر چکا ہے۔

فصل پنجم: متفرق مسائل میں۔ مثلاً ان سقیم روایات پر بحث جو ابواب عمرہ میں وارد ہیں اور دیگر مباحث ——— اور میں نے اس رسالہ کی بنیاد "مواہب لدنیہ" اور "تاریخ خمیس" پر رکھی، جیسا کہ جزء حجۃ الوداع کی بنیاد حافظ ابن قیم کی کتاب "زاد المعاد" پر تھی کیوں کہ حجۃ الوداع کے بیان میں وہ اُن تمام کتابوں کی بہ نسبت جو میرے پاس موجود تھیں، سب سے زیادہ جامع تھی، اسی طرح عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں میں نے ان دونوں کتابوں کو، میرے پاس موجود کتب کی بہ نسبت، زیادہ جامع پایا۔ واللہ سبحانہ الموفق لما یحب ویرضی۔

فصل اوّل

اس میں چند فوائد ہیں ———:

پہلا فائدہ۔ عمرہ کے لغوی و اصطلاحی معنی میں ——— زرقانی کہتے ہیں کہ عمرہ (عین کے ضمہ اور میم کے ضمہ اور سکون کے ساتھ، نیز عین کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ) کہا گیا ہے کہ لغت میں اس کے معنی ہیں "کسی آباد جگہ کا قصد کرنا"۔ اھ اور اوجز میں ہے کہ "لغت میں عمرہ زیارت کو اور بقول بعض قصد کو کہتے ہیں، اور امام راغب فرماتے ہیں کہ عمارۃ، نقیض ہے ویرانی کی، اور اعتمار اور عمرہ ایسی زیارت کا نام ہے جس میں محبت کی تعمیر ہو اور شرعی اصطلاح میں بقصد مخصوص کا نام عمرہ ہے"۔ اھ اور فتح الباری میں ہے: "کہا گیا ہے کہ یہ عمارۃ المسجد الحرام سے مشتق ہے"۔ اھ اور شریعت میں عمرہ نام ہے بیت اللہ شریف کی زیارت کا، خاص کیفیت اور خاص شرائط کے ساتھ ——— اھ اور "لامع" کے حاشیہ میں امام راغب کے کلام میں یہ اضافہ کیا ہے کہ "حق تعالیٰ کا ارشاد انما یعمر مساجد اللہ، یا تو عمارۃ سے ہے، جس کے معنی ہیں اس کی عمارت کی حفاظت کرنا، یا یہ عمرہ ہے جس کے معنی ہیں زیارت کے، یا یہ ان کے قول: عَمَرْتُ بِمَكَانِ كَذَا سے ماخوذ ہے،

یعنی میں نے فلاں جگہ اقامت اختیار کی" — اھ اور درمختار میں ہے کہ "عمرہ نام ہے احرام، طواف، سعی، حلق یا قصر کرانے کا۔ پس احرام شرط ہے، اور طواف کا بیشتر حصہ رکن ہے اور باقی چیزیں واجب ہیں" اھ اور یہی قول مذہب میں راجح ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے شرح لباب میں تفصیل سے لکھا ہے اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ سعی رکن ہے اور کہا ہے کہ قول مذہب میں غیر مشہور ہے — اور علامہ دردیر (مالکی) کہتے ہیں "اور ان دونوں یعنی حج اور عمرہ کے رکن تین ہیں:- (۱) احرام (۲) طواف (۳) سعی، اور حج ایک چوتھے رکن کے ساتھ مختص ہے اور وہ ہے "وقوف عرفہ" — اھ مختصراً۔

دوسرا فائدہ: عمرہ کے حکم میں: لامع کے حاشیے میں ہے کہ ائمہ کا مسلک نقل کرنے میں ناقلین مذاہب نے اختلاف کیا ہے، اور غالباً یہ اختلاف اس بنا پر رونما ہوا کہ ائمہ سے روایات مختلف ہوں گی۔ ابن رشد کہتے ہیں کہ "ایک قوم نے کہا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ثوریؒ، اور امام اوزاعیؒ اسی کے قائل ہیں اور صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ کا اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ سنت ہے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ نقل ہے۔ ابو ثور اور داؤد بھی اسی کے قائل ہیں" اھ اور ابن قدامہ کہتے ہیں: جس شخص پر حج واجب ہے اس پر عمرہ بھی واجب ہے۔ یہ امام احمدؒ کی ایک روایت ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ واجب نہیں" اھ اور فقہ حنبلی کی کتابوں نیل المآرب اور الروض المربع وغیرہ میں پہلی روایت کو مختار قرار دیا ہے اور کشف کہتے ہیں کہ جمہور اصحاب (حنابلہ) نے اسی پر جزم کیا ہے اور ان سے یعنی امام احمدؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ سنت ہے۔ رہا شافعیہ کا مسلک؟ تو ان کی عام کتابوں میں یہ ہے کہ اظہر روایت میں فرض ہے اور امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ سنت ہے اور شافعیہ نے اس قول کی تاویل یہ کی ہے کہ سنت سے وجوب مراد ہے۔ رہا مالکیہ کا مسلک؟ تو دردیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمرہ کرنا ہر شخص کے لئے سنت ہے۔ اور زرقانی کہتے ہیں کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہی قول مذہب (مالکی) میں مشہور ہے۔ رہا ہمارے حنفیہ کا مسلک؟ تو شرح لباب میں ہے کہ عمرہ مختار قول کے مطابق سنت مؤکدہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ قاضی خاں نے اسی کو صحیح کہا ہے اور صاحب بدائع نے اسی پر جزم کیا ہے اور ہمارے بعض اصحاب سے مروی ہے کہ وہ فرض کفایہ ہے۔ اھ مختصراً من الاوجز۔ اور اوجز میں ائمہ کے مذاہب و دلائل کو خوب تفصیل سے لکھا ہے۔ اور حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ "عمرہ کے وجوب میں علماء کے دو مشہور قول ہیں اور یہ دونوں امام شافعیؒ کے قول اور امام احمدؒ کی دو روایتیں ہیں اور ان دونوں کے اصحاب مذہب کے یہاں وجوب

کاقول مشہور ہے۔ لیکن عدم وجوب کا قول اکثر علماء مثلاً امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے اور یہ دونوں قول بعض صحابہ سے منقول ہیں اور یہ اَظْہَر ہے کہ عمرہ واجب نہیں"۔ بعد ازاں انہوں نے استدلال میں طویل کلام کیا ہے۔ ایک مقام پر حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ " یہ (عدم وجوب کا) قول زیادہ راجح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وللہ علی الناس حج البیت میں حج کو واجب کیا ہے، عمرہ کو واجب نہیں ٹھہرایا، البتہ جو شخص حج وعمرہ شروع کرلے اس کے ذمہ ان کے پورا کرنے کو واجب ٹھہرایا ہے اور ابتداء میں صرف حج کو واجب کیا ہے، اسی طرح تمام احادیثِ صحیحہ میں صرف وجوب حج کا ذکر آیا ہے"۔

تیسرا فائدہ: تکرارِ عمرہ کے حکم میں: عینیؒ کہتے ہیں "جاننا چاہیئے کہ امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ ایک ہی سال میں کئی مرتبہ عمرہ کا تکرار مستحب ہے۔ اور امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ایک سال میں ایک سے زیادہ عمرے کرنا مکروہ ہے اور ابن قدامہؒ کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کا قول ہے کہ ایک مہینے میں ایک سے زیادہ عمرے نہ کرے، اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ پانچ دنوں میں عمرہ مکروہ ہے، یوم عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق ۔ اور امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ یوم عرفہ اور ایام تشریق ان چار دنوں میں مکروہ ہے۔ اھ اور موفق کہتے ہیں کہ "کوئی مضائقہ نہیں کہ آدمی سال میں کئی مرتبہ عمرہ کرے لیکن زیادہ عمرے کرنا سلف کے ظاہر قول میں مستحب نہیں اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ زیادہ عمرے کرنا مستحب ہے"۔ اھ اور مؤطا میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا: "میں کسی کے لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ سال میں کئی مرتبہ عمرہ کرے"۔ اھ اور اوجز میں ہے کہ یہاں جمع کا اطلاق مافوق الواحد پر ہوا ہے پس دوسری مرتبہ یا اس سے زیادہ عمرہ کرنا مکروہ ہوگا، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کل چار عمرے کئے، ہر سال میں الگ عمرہ کیا، باوجودیکہ آپؐ ایک سال میں کئی کئی عمرے کرسکتے تھے، ہاں اگر اس مکروہ عمل کو شروع کرلیا تو اس کا پورا کرنا واجب ہوگا کیوں کہ وہ جائز کی قسم سے ہے اور جمہور علماء اور بہت سے مالکیہ نے تکرارِ عمرہ کو بلا کراہت جائز رکھا ہے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ "ایک عمرہ، دوسرے عمرہ تک دونوں کے مابین کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے"۔ یہاں تک کہ ابن عبد البرؒ نے مبالغہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ جو شخص اس کو مکروہ کہتا ہے اس کے پاس کتاب وسنت میں سے کون سی دلیل ہے جس کا تسلیم کرنا واجب ہو۔ یہ بات زرقانیؒ نے کہی ہے اور پوری تفصیل اوجز میں ہے۔ اور شرح مہذب میں ہے کہ "ہمارا مذہب یہ ہے کہ سال میں کئی بار عمرہ کرنا مکروہ نہیں، بلکہ سنت ہے۔ امام ابوحنیفہؒ امام احمدؒ اور سلف وخلف کے جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ البتہ حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور مالکؒ فرماتے ہیں کہ سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا مکروہ ہے"۔ اھ اور شرح لُباب میں ہے کہ "پورے سال میں کثرت سے عمرے کرنا مکروہ

نہیں بلکہ جمہور کے قول کے مطابق مستحب ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔" اھ

چوتھا فائدہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کی تعداد کے بیان میں: اس سلسلہ میں روایات میں بہت ہی اختلاف ہے۔ معروف، معتمد اور مرجح علماء کے نزدیک وہ ہے جو سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے، عمرۂ حدیبیہ، دوسرا جب کہ کفار نے آئندہ سال آپؐ کے عمرہ کرنے پر اتفاق کیا۔ تیسرا جعرانہ سے اور چوتھا جو آپؐ نے اپنے حج کے ساتھ کیا۔" یہ روایت امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے بالفاظ مختلفہ نقل کی ہے اور زرقانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے چنانچہ صحیحین، سنن ترمذی اور ابی داؤد میں حضرت قتادہ (تابعی) سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے حج کئے؟ فرمایا: ایک۔ اور آپؐ نے عمرے چار کئے۔" الحدیث۔ اھ۔ اور حافظ ابن قیم کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے۔ پہلا عمرۂ حدیبیہ۔ یہ سب سے پہلا عمرہ تھا جو ۶ھ میں ہوا مگر مشرکین نے آپؐ کو مقام حدیبیہ میں آگے جانے سے روک دیا۔ اس لئے آپؐ نے اسی مقام پر قربانی کے اونٹ (بُدن) نحر کئے دوم عمرۃ القضیہ، جو اگلے سال ہوا، چنانچہ آپؐ مکہ میں داخل ہوئے وہاں تین دن قیام فرمایا۔ اور عمرہ پورا کرکے واپس لوٹ آئے۔ سوم وہ عمرہ جو آپؐ نے حج کے ساتھ ادا کیا کیوں کہ آپؐ قارن تھے، چہارم وہ عمرہ جو جعرانہ سے ادا فرمایا جب کہ آپؐ حنین تشریف لے گئے تھے چنانچہ آپؐ وہاں سے مکہ کی جانب واپس آئے، پس جعرانہ سے عمرہ کیا چنانچہ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے، سوائے اس عمرہ کے جو آپؐ نے حج کے ساتھ ادا فرمایا۔" الخ۔ اور اس روایت کے وہ روایت مناقض نہیں جو صحیحین میں حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج سے قبل ذیقعدہ میں دو عمرے کئے۔" کیونکہ حضرت براء بن عازبؓ کی مراد یہ ہے کہ ایسے دو مستقل عمرے کئے جو پورے بھی ہوئے اور کوئی شک نہیں کہ وہ دو ہی تھے، کیونکہ عمرۂ قران مستقل نہیں تھا، اور عمرۂ حدیبیہ پورا نہیں ہو سکا، بلکہ آپؐ کو اس سے روک دیا گیا تھا اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے۔" الحدیث۔ یہ حدیث امام احمدؒ نے روایت کی ہے اور حضرت انسؓ کے اس قول کے درمیان کہ "سب عمرے ذیقعدہ میں ہوئے سوائے عمرۂ قران کے" اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے درمیان کہ "رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے کوئی عمرہ نہیں کیا مگر ذیقعدہ میں"۔ کوئی تناقض نہیں کیوں کہ عمرۂ قران کی ابتداء ذیقعدہ میں ہوئی تھی اور انتہا ذوالحجہ میں اس وقت ہوئی جب کہ آپؐ کا حج پورا ہوا، پس حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ابتداء کی خبر دی اور حضرت انسؓ نے انتہا کی۔ لیکن ابن عمرؓ کا یہ قول کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے، ان میں سے ایک رجب میں ہوا" پس یہ اُن کا وہم ہے (رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہؓ کو جب ابن عمرؓ کے اس قول کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن پر رحم کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا وہ (ابن عمرؓ) اس موقعہ پر موجود تھے۔ مگر آپؐ نے کبھی رجب میں عمرہ نہیں کیا"۔ باقی رہی وہ روایت جو دارقطنی نے حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں عمرہ کے لئے نکلی، پس میں نے روزہ رکھا اور آپؐ نے افطار کیا، آپؐ نے نماز قصر کی اور میں نے پوری پڑھی، پس میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ قربان ہوں، آپؐ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا، آپؐ نے قصر کیا اور میں نے نماز پوری پڑھی۔ آپؐ نے فرمایا: عائشہ! تو نے اچھا کیا۔ پس یہ حدیث غلط ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رمضان میں عمرہ نہیں کیا، اور آپؐ کے عمروں کی تعداد اور ان کا وقت دونوں طے شدہ چیز ہیں۔ اور حدیث کے جواب میں ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُم المومنینؓ پر رحم فرمائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں کبھی عمرہ نہیں کیا اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ نے صرف ذیقعدہ ہی میں عمرہ کیا ہے، ان کا یہ قول ابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آپ کے عمرے چار سے زائد نہیں تھے۔ اب اگر رجب کا عمرہ بھی ہو تو پانچ اور اگر رمضان المبارک میں بھی کیا تو چھ ہو گئے اور یہ کہنا کہ بعض عمرے رجب اور بعض رمضان میں اور بعض ذیقعدہ میں ہوئے خلاف واقع ہو گا جب کہ واقعہ یہی ہے کہ آپ کے عمرے ذیقعدہ ہی میں ہوئے، جیسا کہ حضرت انسؓ، ابن عباسؓ اور عائشہؓ نے بیان فرمایا۔ امام مالکؒ موطا میں نقل فرماتے ہیں کہ انہیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین عمرے کئے ہیں۔ حدیبیہ والے سال، قضاء والے سال، جعرانہ والے سال۔ علامہ باجی کہتے کہ "ان کا تین عمرے بتانا ان کے اپنے مذہب کے موافق ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج قِران ادا فرمایا تھا وہ چار عمرے شمار کرتے ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ امام مالکؒ نے حج والا عمرہ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ حج ہی میں داخل ہے، حاصل یہ کہ جو حضرات چار عمروں کے قائل ہیں وہ حدیبیہ والا عمرہ بھی شمار کرتے ہیں، کیوں کہ اس میں عمرہ کے بہت سے احکام مثلاً احرام، شکار، خوشبو، میقات، لباس۔ احصار۔ فدیۂ اذیٰ، حلق، قصر اور نحر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ علامہ باجی کہتے ہیں کہ اسے عمرہ کہنا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ عمرہ امام مالکؒ کے نزدیک تام سمجھا جائے، اگرچہ اس میں بیت اللہ شریف سے روک ہی دیا گیا اور ایسے شخص پر قضا نہیں ہوتی جسے بیت اللہ شریف

سے روک دیا گیا ہو۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ ابن التین فرماتے ہیں کہ "لوگوں کا عمرۂ حدیبیہ کو شمار کرنا جس میں کہ بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تھا اس کے کامل عمرہ ہونے کی دلیل ہے اور اس میں جمہور کے اس قول کی صحت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو شخص بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا ہو اس پر قضا واجب نہیں اور یہ قول احناف کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس بحث کی تفصیل عمرۃ القضاء کے بیان میں آئے گی اور اسی طرح حضرات علماء نے عمروں کی فہرست میں آپ کا وہ عمرہ بھی شامل کر لیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کے ساتھ تھا اس لئے کہ قارن وہی ہوتا ہے جو حج و عمرہ اکٹھے ادا کرتا ہے اور جو حضرات آپ کے تین عمرے بتلاتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ حج والے عمرے کو اسی میں داخل اور تابع سمجھ کر شمار نہ کرتے ہوں یا جعرانہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں کیونکہ وہ رات میں ہونے کی وجہ سے مخفی رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں بوقت صبح ایسے ہی موجود تھے گویا رات وہیں گزاری تھی، یا پھر حدیبیہ والے عمرے کو شمار نہ کرتے ہوں گے کہ وہ پورا ادا نہ ہو سکا تھا اور جو حضرات کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو بار عمرہ کیا تو انہوں نے عمرۃ الحج کو (داخل حج) اور عمرۃ الحدیبیہ کو نا تمام سمجھتے ہوئے شمار نہیں کیا بلکہ صرف ان دو عمروں کو شمار کیا جو مستقل اور کامل واقع ہوئے جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ کے کلام میں گزرا اور ممکن ہے کہ انہوں نے حدیبیہ اور قضاء والے عمروں کو شمار کیا ہو اور جعرانہ والا ان پر مخفی رہا ہو۔ البتہ یہ توجیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث میں درست نہ ہوگی کہ "آپ نے صرف دو بار عمرہ کیا" کیوں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ابو عبد الرحمٰن پر رحم فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرہ بھی کیا ان کی موجودگی میں کیا اور یہ کہ آپ نے چار عمرے کئے۔" الخ جیسا کہ لامع کے حاشیے میں امام احمدؒ و ابو داؤد رحمہما اللہ کی روایت سے منقول ہے۔ پس ظاہر یہی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں صرف ان دو عمروں کو شمار کیا ہے جو مستقل طور پر پورے ادا کئے گئے یعنی عمرۃ القضاۃ اور عمرۂ جعرانہ۔

فصل دوم، عمرۂ حدیبیہ کے بیان میں

حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں شامل ہے: یہ عمرہ مقام حدیبیہ کی جانب منسوب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ بیت اللہ شریف سے روکا گیا تھا اور اسی جگہ صلح، بیعت رضوان، حلق اور نحر وغیرہ بہت سے امور وقوع پذیر ہوئے، حدیبیہ: حاء مہملہ کے ضمہ، دال کے فتحہ، یائے تحتانیہ کے سکون اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ اہل عراق اسے تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل حجاز بغیر تشدید کے۔ یہ دراصل ایک کنوئیں کا نام تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براءؓ سے منقول ہے، اسی کنوئیں کے نام پر اس جگہ کو "حدیبیہ" کہا گیا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ درخت کا نام تھا۔

محب طبریؒ کہتے ہیں: "یہ ایک بستی ہے جو زیادہ بڑی نہیں۔ مکہ مکرمہ سے ایک مرحلہ پر واقع ہے اس کا بیشتر حصہ حرم میں ہے اور باقی حل میں، اور یہ مکہ مکرمہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع ہے" ۔ زرقانی۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے اور اسی میں ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک یہ سب حرم میں داخل ہے" نیز اسی میں اور ہدایہ میں ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے۔

کشاف میں زمخشری نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور کتاب الام میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں: حدیبیہ کا کچھ حصہ حل میں ہے اور کچھ حرم میں" اور صحیح بخاری میں ہے کہ "حدیبیہ حرم سے خارج ہے"۔ عینیؒ کہتے ہیں: "اس کا حرم سے خارج ہونا مجمع علیہ نہیں، چنانچہ امام طحاویؒ نے حضرت مسورؓ سے نقل کیا ہے کہ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ حل میں تھا اور آپ کی نمازگاہ حرم میں تھی"۔ اھ اوجز میں ہے کہ ابن ابی شیبہؒ نے امام عطاؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ حرم میں تھی"۔ اور ابن قیمؒ حدیث کے فوائد میں لکھتے ہیں "اور اس میں ایک طرح کی دلالت ہے اس امر پر کہ مکہ مکرمہ میں نماز کے مضاعف ہونے (ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملنے) کا مسئلہ تمام حرم سے متعلق ہے۔ صرف مسجد حرام کے ساتھ، جو کہ طواف کی جگہ ہے۔ خاص نہیں۔ اور خمیس میں ہے کہ وہاں مسجد شجرہ ہے" اور حدیبیہ اور مدینہ منورہ کے درمیان نو مرحلوں کا فاصلہ ہے اور حدیبیہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان ایک مرحلہ کا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حرم میں داخل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا بعض حصہ حرم میں شامل ہے۔ اور شفاء الغرام میں ہے کہ "مسجد شجرہ" حدیبیہ میں ہے اور جس شجرہ کی طرف یہ منسوب ہے یہ وہی شجرہ ہے جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی، یہ کیکر کا درخت تھا۔ جو لوگوں میں معروف تھا۔ یہ مسجد جدہ کے راستہ میں داہنی جانب واقع ہے اور یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہاں نمازیں پڑھی تھیں اور وہاں ایک اور مسجد ہے مگر یہ دونوں مسجدیں اور خود چاہ حدیبیہ آج کل معروف نہیں" اھ۔ حموی نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ "صحیح اور درست یہ ہے کہ حدیبیہ کو تشدید سے اور جعرانہ کو بغیر تشدید کے پڑھا جائے"۔

عمرۂ حدیبیہ کا سبب: صاحب خمیس کہتے ہیں: "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غزوہ کے لئے یعنی اس عمرہ کے لئے جس کی انتہا غزوہ پر ہوئی۔ نکلنے کا سبب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی طرف نکلنے سے پہلے مدینہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور آپ نے بیت اللہ شریف کی کنجی اپنے دست مبارک میں لی اور سب نے طواف و عمرہ کیا۔ پھر بعض نے حلق کرایا اور بعض نے

قصر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھے کہ وہ بس اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے عمرے کے ارادے کا اظہار فرمایا، اس پر انھوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے قبائل اور گرد و پیش کی بستیوں کے اعراب کو ساتھ چلنے کے لئے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ وقتال کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن آپؐ کو قریش کی جانب سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ آپؐ سے لڑائی کے لئے آمادہ ہوں گے یا آپؐ کو بیت اللہ شریف روکنے کی کوشش کریں گے اور بہت سے بدویوں نے آپؐ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر کی۔

تفسیر جلالین میں آیت کریمہ: لقد صدق اللّٰہ رسولہ الرؤیا الاٰیۃ" کے تحت لکھا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال کوچ سے پہلے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ مکہ مکرمہ میں بے خوف و خطر داخل ہو رہے ہیں اور حلق اور قصر کرا رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب صحابہ کرام سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے تو کفار نے انہیں حدیبیہ میں روک دیا اور انہیں عمرہ کے بغیر آنا پڑا تو انہیں نہایت شاق گذرا اور بعض منافقوں نے شکوک و شبہات پھیلانے شروع کئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی"۔ اھ

زرقانی کہتے ہیں فریابی، عبد بن حمید اور بیہقی نے دلائل میں حضرت عطاؒ سے نقل کیا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ آپؐ حدیبیہ میں فروکش تھے، یہ خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بے خوف و خطر مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور سروں کا حلق اور قصر کرا رہے ہیں۔ لیکن جب حدیبیہ ہی میں ھدی کے جانور ذبح کرنے پڑے تو صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپؐ کا خواب کیا ہوا؟ اس پر آیت: لقد صدق اللّٰہ رسولہ الرؤیا الاٰیۃ نازل ہوئی"۔ اس روایت میں جس خواب کا ذکر ہے، یہ دوسرا خواب ہے جو آپؐ نے حدیبیہ میں دیکھا تھا اور جس میں حق تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ بشارت دی گئی تھی، اس کو آپؐ کے مدینہ سے چلے جانے کا سبب قرار دینا صحیح نہیں ہوگا" اھ

میں کہتا ہوں اول کی تائید فتح کی اس عبارت سے ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ کے اس قول: "اولیس کنت تحدثنا الخ" (کیا آپؐ ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے الخ) کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ — "واقدیؒ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کے لیے چلنے سے پہلے یہ خواب دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بیت اللہ میں داخل ہوئے پھر جب ان حضرات نے اس امر میں تاخیر دیکھی تو انہیں

نہایت شاق گزرا"۔

مدینۂ طیبہ سے روانگی: صاحب خمیس کہتے ہیں پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل فرمایا، لباس زیب تن کیا، اور اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہوئے اور مدینہ میں ابن ام مکتومؓ کو اپنی جگہ قائم مقام مقرر فرمایا، خمیس اور زرقانی میں اسی طرح ہے اور زرقانیؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ بعض لوگوں نے ابو رہم کلثوم بن حُصین کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ بلاذری نے یہ دونوں قول نقل کئے ہیں اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان دونوں کو مقرر فرمایا تھا اور ابن ام مکتوم نماز پر مامور تھے ابن ہشام اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ نُمیلہ بن عبداللہ لیثی کو مقرر کیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ نُمیلہؓ اور کلثومؓ دونوں کو امورِ عامہ پر مقرر فرمایا ہو اور ابن ام مکتومؓ کو امام مقرر کیا ہو۔

اور آپؐ یکم ذیقعدہ ۶ھ کو کہ یہی حدیبیہ کا سال کہلاتا ہے پیر کے دن مدینۂ طیبہ سے روانہ ہوئے، زرقانیؒ کہتے ہیں کہ "جمہور علمائے سیر مثلاً امام زہری، قتادہ، موسیٰ بن عُقبہ، ابن اسحٰق، ابن سعد وغیرہ نے اسی طرح نقل کیا ہے اور فتح میں کہا ہے کہ ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں سفر کے لئے نکلے اور شوال میں عمرہ کیا، مگر یہ قول شاذ ہے اور ابوالاسود نے عروہ سے جمہور کے موافق روایت نقل کی ہے" اھ اور البدایہ والنہایہ میں ــــ شوال میں عمرہ ــــ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: "یہ عروہ سے بہت غریب روایت ہے" اھ اور ابن قیمؒ کہتے ہیں "یہ روایت وہم ہے اور عروہ کا قول صحیح روایت کے مطابق یہی ہے کہ عمرہ ذی قعدہ میں ہوا، چنانچہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے جو سب کے سب ذیقعدہ میں ہوئے، ان ہی میں عمرۂ حدیبیہ کا بھی ذکر ہے"۔ اور آپؐ نے اپنی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لیا۔

شرکاء حدیبیہ کی تعداد: اور آپؐ کے ساتھ چودہ ۱۴۰۰ سو حضرات تھے جیسا کہ صحیحین میں حضرت براءؓ کی حدیث میں بروایت اسرائیل عن ابی اسحٰق ــــ مروی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپؐ کے ساتھ پندرہ ۱۵۰۰ سو افراد تھے۔ یہ روایت بھی صحیحین ہی میں سعید بن مسیّب کی سند سے حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد تیرہ سو تھی، یہ روایت بھی صحیحین ہی میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے اور ان مختلف روایات میں تطبیق۔ جیسا کہ فتح میں کہا ہے۔ یہ ہے کہ چودہ سو سے زائد تھے، پس جس نے زائد کا اعتبار کیا پندرہ سو کہا اور جس نے شمار نہیں کیا اس نے چودہ سو کہا، اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ وہ چودہ سو یا اس سے زیادہ تھے، یہاں "یا" سے مراد یہ ہے کہ چودہ سو بلکہ

اس سے زیادہ تھے۔ اس سے وجہ تطبیق واضح ہو جاتی ہے اور نووی ؒ نے اسی تطبیق پر اعتماد کیا ہے کیوں کہ روایات سب صحیح ہیں، اور بیہقی کا میلان ترجیح کی طرف ہے وہ کہتے ہیں کہ چودہ سو کی روایت زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ حضرت براءؓ، جابرؓ، سلمہ بن الاکوعؓ، معقل بن یسار اور مسیب بن حزنؓ اس پر متفق ہیں۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "اپنا قلبی رجحان زیادہ تر اسی طرف ہے، رہی تیرہ سو والی روایت! سو وہ راوی کی اطلاع پر محمول ہے۔ دوسرے حضرات کو دو سو زائد کی اطلاع ہوئی جن پر پہلے راوی کو نہ ہوئی اور زیادتی ثقہ کی مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا کم نقل کرنے والے کی روایت اس کے معارض نہیں" اور حافظ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "یا یہ کہا جائے کہ جو تعداد اس نے (تیرہ سو کے راوی نے) ذکر کی ہے یہ تو مدینہ سے روانگی کے وقت تھی اور زائد وہ تھے جو وہ بعد میں شامل ہوتے گئے یا یہ کہ اس نے صرف مقاتلین کی تعداد ذکر کی ہے اور زائد حشم و خدم، نابالغ بچے اور عورتیں تھیں اور ابن اسحٰق کا یہ قول کہ سات سو تھے کسی نے اس کی تائید و موافقت نہیں کی۔ دراصل موصوف نے یہ بات حضرت جابرؓ کے اس قول سے استنباط کی ہے کہ "ہم نے ایک ایک اونٹ دس دس آدمیوں کی جانب سے ذبح کیا تھا اور اونٹوں کی تعداد ستر تھی"

حالاں کہ یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ انہوں نے اونٹوں کے علاوہ گائے، بکری ذبح نہیں کیے تھے مزید برآں یہ کہ بعض حضرات نے سرے سے احرام ہی نہیں باندھا تھا موسیٰ بن عُقبہ نے اس پر جزم کیا ہے کہ ان کی تعداد سولہ سو تھی۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں حضرت سلمہ بن اکوعؓ کی حدیث میں سترہ سو کی تعداد مذکور ہے اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک ہزار پانچ صد پچیس (۱۵۲۵) نفر تھے۔ حافظ کہتے ہیں: "ابن سعدؒ کی یہ روایت اگر ثابت ہو تو اس میں تحریر بالغ سے کام لیا گیا ہے (یعنی ٹھیک ٹھیک پوری تعداد بیان کی گئی ہے، بعد ازاں ابن مردیہ کی تخریج سے یہ تعداد مجھے بروایت ابن عباسؓ موصولاً بھی دستیاب ہوئی ہے۔ اھ مختصراً"

الہدی میں بروایت صحیحین حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے نقل کیا ہے کہ ہم تیرہ سو تھے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ "میں نے سعید بن مسیبؓ سے دریافت کیا کہ بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں کی تعداد کتنی تھی؟ فرمایا پندرہ سو۔ میں نے کہا کہ حضرت جابرؓ تو چودہ سو بتاتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اُن پر رحم فرمائے، انہیں سہو ہوا، خود انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پندرہ سو تھے" اھ۔ اور عقبہ کے

پندرہ سو[۱۵۰۰] کی تعداد ہی راجح ہے، جیسا کہ ابو داؤد، "کتاب الجہاد" باب من اسہم لہٗ سہم" میں اس کی تصریح موجود ہے، چنانچہ اس میں حضرت مجمع بن جاریہ انصاریؓ سے جو ان قاریوں میں سے ایک تھے جنہوں نے قرآن کریم یاد کیا، روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں حاضر ہوئے جب وہاں سے واپس لوٹے تو لوگ اونٹ دوڑانے لگے، آگے حدیث میں سورۃ فتح کے نزول کا قصہ مذکور ہے اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ خیبر کا مالِ غنیمت، اہل حدیبیہ پر تقسیم کیا گیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اٹھارہ حصے کئے، پندرہ سو کا لشکر تھا، ان میں سے تین سو شہسوار تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہسوار کو دوہرا اور پیادہ کو اکہرا حصہ دیا" اس کی تائید زرقانی کے گذشتہ بالا کلام سے بھی ہوتی ہے کہ یہی (پندرہ سو کی تعداد) صحیحین میں بروایت سعید بن مسیبؒ، حضرت جابرؓ سے منقول ہے اور حضرت مجمعؓ کی یہ حدیث اس بنا پر بھی راجح ہے کہ اس میں سواروں اور پیادوں کی الگ الگ تفصیل بھی دی گئی ہے۔ امام بخاریؒ، قتادہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: میں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ چودہ سو[۱۴۰۰] تھے۔ سعیدؒ نے ——— کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے خود مجھ سے فرمایا کہ جن حضرات نے حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ان کی تعداد پندرہ سو[۱۵۰۰] تھی"۔ شیخ بذل میں فرماتے ہیں "حضرت جابرؓ سے جو تعداد سالم اور سعید بن مسیبؒ نے نقل کی ہے وہ باقی روایات کی بہ نسبت اقرب الی التحقیق ہے۔ کیونکہ اس کو "جن حضرات نے حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی" کے مضمون کے ساتھ مؤکد کیا ہے، پھر یہ روایت حضرت مجمعؓ کی روایت سے مؤید ہے"۔ اھ اور سیوطیؒ نے درّ منثور میں "لقد رضی اللہ عن المومنین" کے تحت بروایت عبد بن حمید و ابن جریر حضرت قتادہؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ کیکر کا درخت تھا، جس کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ اور ان کی تعداد اس دن پندرہ سو تھی" الخ

ابوجہل کے اونٹ کا قصہ: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ ہدی کے ستر اونٹ لے گئے تھے جن میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی شامل تھا جو جنگِ بدر کی غنیمت میں ہاتھ آیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہی صحیح ہے اور ترمذی شریف میں جو مروی ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے اونٹوں میں شامل تھا یہ وہم ہے جیسا کہ اس کی تفصیل جزء حجۃ الوداع میں گزر چکی ہے اور اس اونٹ کی ناک میں کڑا تھا، ابو داؤد میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر اپنی قربانیوں میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی قربان کیا جس کے

سر میں یعنی ناک میں چاندی کا کڑا (حلقہ) تھا"۔ ابن منہال کہتے ہیں کہ کڑا سونے کا تھا۔ نفیلی کہتے ہیں کہ اس سے مشرکین کو چڑانا منظور تھا۔ حضرت شیخ بذل فرماتے ہیں کہ "راوی کا قول، اس کے سر میں" اور ملا علی قاری فرماتے ہیں: "راوی کا قول: کہ سونے کا کڑا تھا (اور دوسری روایت میں ہے کہ چاندی کا کڑا تھا) ممکن ہے کہ دو نتھنوں کے لئے دو کڑے ہوں"۔ اوجز میں ہے کہ ابوداؤد کی اس حدیث کو کئی طرح سے ترجیح حاصل ہے ایک یہ ہے کہ، روایات میں ہے کہ کفار کو چڑانا اور غصہ دلانا مقصود تھا اور یہ بات حجۃ الوداع کے ساتھ جوڑ نہیں رکھتی اس لئے کہ اس وقت مکہ میں کوئی کافر ہی نہیں تھا۔ دوسرے، یہ کتب سیر کے موافق ہے، تیسرے یہ کہ ترمذی کی روایت میں ضعف ہے، چنانچہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث غریب ہے۔ سفیان کی یہ حدیث صرف زید بن حباب کے ذریعہ ہمیں ملی ہے"۔ پوری تفصیل اوجز میں ہے، اور جزء حجۃ الوداع میں حدیبیہ کے ہدایا ابوجہل کے اونٹ کے بھاگ جانے کا قصہ گزر چکا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھاگنا بھی اسی چڑانے کی تکمیل کے لئے تھا کہ اگر وہ اونٹ یوں ہی ذبح کر دیا جاتا تو مکہ کے عام کافروں کو اس کا علم نہ ہوتا اور اس کے بھاگ جانے کی وجہ سے اس کا معاملہ ایسا مشہور ہوا کہ قریب و بعید کے تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ رہا یہ سوال کہ اونٹ تو بے عقل جانور ہے، کفار کو چڑانے والے مقصد کی تکمیل کے لئے اس کا بھاگ نکلنا کیوں کر ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بطور معجزہ کے ہے اور اس قسم کے بہت سے معجزات ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ منجملہ ان کے ابوداؤد کی حدیث کا یہ واقعہ ہے کہ قربانی کے اونٹ آپؐ کی طرف لپکتے تھے کہ دیکھئے کس سے ذبح کی ابتداء ہو۔ اسی طرح آپؐ کی ناقہ قصواء کے بیٹھنے کا قصہ، اور لوگوں کا کہنا کہ قصواء رک گئی عنقریب آرہا ہے وغیرہ" اور آپؐ نے ھدی کے اونٹوں پر ناجیہ بن جندبؓ اسلمی کو مقرر فرمایا اور معالم التنزیل میں ان کا نام ناجیہ بن عمیر نقل کیا ہے، اور خمیس میں بھی اسی طرح ہے، اور ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ ان کے والد کا نام جندب اور دادا کا نام عمیر ہے۔ البتہ یہاں ایک اور اختلاف ہے کہ آیا وہ اسلمی ہے یا خزاعی؟ اور یہ کہ کیا ناجیہ اسلمی اور ناجیہ خزاعی دو شخص ہیں یا ایک ہی شخص ہے؟ بذل میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور آپؐ کے ساتھ مالدار صحابہؓ نے بھی ہدی کے جانور ہنکائے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز میان میں بند تلواروں کے "جو مسافر کا ہتھیار ہے" اور کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لیا۔ (میں کہتا ہوں) کہ آپؐ کے ساتھ تین سو شہسوار تھے، جیسا کہ ابوداؤد کی روایت اوپر گذر چکی ہے اور زرقانی میں ہے کہ "آپؐ کے ساتھ دو سو شہسوار تھے" مگر ابوداؤد کی روایت راجح ہے۔

پس آپؐ نے نمازِ ظہر ذی الحلیفہ میں ادا فرمائی اور قربانی کے جانوروں کو قلادے پہنائے اور ان کا اشعار کیا۔ بعض جانوروں کو خود بنفسِ نفیس قلادے پہنائے اور باقیوں کے لیے ناجیہ کو حکم فرمایا۔ خمیس میں اسی طرح ہے۔ زرقانی فرماتے ہیں کہ "ایک روایت کے مطابق آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور ذوالحلیفہ کی مسجد کے دروازے سے سوار ہوئے اور آپؐ کی سواری جب آپؐ کو لے کر قبلہ کی طرف چلنے لگی تو آپؐ نے عمرہ کا احرام باندھا (یعنی اس کا اظہار فرمایا) تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ لڑائی کے لئے تشریف نہیں لے جا رہے" اور خمیس میں ہے کہ "پھر آپؐ نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور تلبیہ پڑھا اور آپؐ کی اقتداء میں جمہور صحابہؓ نے بھی وہیں سے احرام باندھا اور بعض نے جُحفہ سے احرام باندھا۔

میں کہتا ہوں کہ تقلید اور اشعار کی بحث جزء الحج میں گذر چکی ہے اور اس ناکارہ کے نزدیک اَوْجَہ یہ ہے کہ مواقیت کی مشروعیت کی ابتداء عمرۃ الحدیبیہ سے ہوئی اور عام شراح اس کی ابتداء حجۃ الوداع سے ذکر فرماتے ہیں، جیسا کہ امام احمدؒ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، مگر اس پر اشکال ہوگا کہ یہ تمام حضرات حدیبیہ والے سال حضرت ابوقتادہؓ کے میقات سے بغیر احرام گذر جانے کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میقات کی تعیین ہی حجۃ الوداع میں ہوئی تو ان توجیہات قریبہ و بعیدہ کی حاجت ہی کیوں پڑی؟ اوجز میں اسی طرح ہے اور جو رائے میں نے اختیار کی ہے اس کی تائید حافظ ابن قیمؒ کے اس کلام سے ہوتی ہے جو موصوف نے حدیبیہ کے فوائد میں ذکر کیا ہے کہ "عمرہ کا احرام میقات سے باندھنا افضل ہے جیسا کہ حج کا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج و عمرہ دونوں کا احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا"۔

ذوالحلیفہ سے جاسوس بھیجنا : اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ سے ایک خزاعی کو بطور جاسوس بھیجا صحیح قول کے مطابق اس کا نام بُسر تھا۔ (با موحدہ کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ) جیسا کہ حافظؒ نے کہا ہے اور ابن اسحاق اور ابن عبد البرؒ نے بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ البتہ ابن اسحاق کی روایت میں "بِشر" (با کے کسرہ اور شین منقوطہ کے ساتھ) واقع ہوا ہے اور ابن ہشام نے اس کی تردید کی ہے، اور ابن شیبہ کی روایت میں جاسوس کا نام "ناجیہ" ذکر کیا ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ "مشہور یہ ہے کہ "ناجیہ" اس شخص کا نام ہے جس کے ساتھ ہدی کے جانور بھیجے تھے جیسا کہ ابنِ اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے"۔ اور آپؐ نے اس بُسر بن سفیان بن عمرو کو بطور جاسوس بھیجنے کے لئے اس لئے منتخب فرمایا کیوں کہ یہ "تازہ تازہ اسلام لائے تھے۔ چنانچہ وہ شوال میں اسلام لائے تھے (چونکہ ان کا اسلام لانا زیادہ مشہور نہیں تھا، اس لئے انہیں دیکھنے والا جاسوس سمجھ کر ایذاء کے درپے

نہیں ہوگا۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ حافظ ابن قیمؒ آغاز قصہ میں فرماتے ہیں کہ " آپؐ نے ذوالحلیفہ سے اپنے آگے آگے ایک خزاعی کو بحیثیت جاسوس کے بھیجا اور حدیث کے فوائد میں فرماتے ہیں کہ جہاد میں قابلِ اعتماد مشرک سے بوقتِ ضرورت خدمت لینا جائز ہے۔ اس لئے اس خزاعی کو جب جاسوس مقرر کیا گیا وہ کافر تھا اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ اس کے لئے دشمن میں گھُل مل کر ان کی خبریں معلوم کر لینا آسان تھا۔ نیز فرماتے ہیں کہ " امیر لشکر کو چاہیئے کہ اپنے آگے دشمن کی جانب جاسوس بھیجے"۔ اھ اور آپؐ کا یہ جاسوس "غدیر الاشطاط" نامی جگہ واپس آیا جیسا کہ آگے آتا ہے۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں "پس جب آپؐ ذوالحلیفہ پہنچے تو قبیلۂ خزاعہ کے ایک جاسوس کو اپنے آگے بھیجا تاکہ وہ قریش کی خبریں آپؐ کو لا کر دے، یہاں تک کہ جب وادی عسفان کے قریب پہنچے تو آپؐ کا یہ جاسوس واپس آیا اور اس نے بتایا کہ میں کعب بن لوی (یعنی قریش) کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انہوں نے آپؐ کے مقابلہ کے لئے احابیش یعنی مختلف قبائل کو جمع کر رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور فرمایا کہ تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو اہل و عیال کا رخ کریں"؟ اھ مختصراً اور مشورہ کا تذکرہ اپنے موقع پر آئے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجیہ اسلمیؓ کو ہدی کے جانوروں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود ان کے پیچھے روانہ ہوئے اور عباد بن بشر کو مہاجرین و انصار کے بیس سواروں کی معیت میں مقدمۃ الجیش پر مقرر فرمایا۔

حضرت ابو قتادہؓ کی آمد اور جاسوس کی واپسی: اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب کہ آپؐ موضع "سقیا" میں قیلولہ کر رہے تھے۔ حافظؒ کہتے ہیں: "السقیا" سین مہملہ کے ساتھ ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ اس کے ساتھ یائے مقصورہ۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بڑی بستی ہے" اھ۔ اور معجم میں ہے کہ " فرع" کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ اس کے اور "فرع" کے درمیان جحفہ کی جانب انیس ۱۹ میل کا فاصلہ ہے"۔ اھ۔

بخاری و مسلم میں عبداللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد (حضرت ابو قتادہؓ) بھی حدیبیہ کے سال گئے تھے۔ پس ان کے رفقاء نے احرام باندھ لیا، مگر انہوں نے نہیں باندھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ "غیقہ" نامی جگہ میں دشمن جمع ہیں، وہ آپؐ سے لڑیں گے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چلے، پس دریں اثناء کہ میرے والد اپنے رفقاء کے ساتھ تھے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے، (میرے والد فرماتے ہیں کہ) میں نے دیکھا کہ ایک نیل گائے ہے، میں نے نیزے سے اس پر حملہ کیا پس اس کو وہیں ڈھیر کر دیا، میں نے اپنے رفقاء سے مدد چاہی، مگر انہوں نے میری مدد کرنے سے انکار کر

دیا، (بہرحال میں نے خود ہی اس کا گوشت تیار کیا) پس ہم نے اس کا گوشت کھایا، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں، اس لئے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا، میں کبھی گھوڑا تیز دوڑاتا اور کبھی عام رفتار سے چلتا، آدھی رات کو مجھے بنو غفار کا ایک شخص ملا، میں نے اس دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں چھوڑا تھا؟ اس نے بتایا کہ میں نے آپ کو "تعہن" نامی جگہ چھوڑا ہے، اور آپ دوپہر کو "سقیا" پہنچیں گے، چنانچہ (میں "سقیا" میں آپ سے آملا، اور) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے خدام آپ کو سلام عرض کرتے ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں آپ سے کٹ کر پیچھے نہ رہ جائیں، پس ان کا انتظار کر لیجئے۔ پھر عرض کیا! یا رسول اللہ! میں نے نیل گائے کا شکار کیا تھا اور اس کا کچھ بقیہ میرے پاس ہے۔ آپ نے رفقاء سے فرمایا، کھاؤ، یہ حضرات احرام میں تھے۔

اس قصہ میں بہت سی فقہی بحثیں ہیں، مثلاً ابوقتادہ کے خروج کا سبب کیا تھا؟ انہوں نے میقات سے احرام کیوں نہ باندھا؟ اور ان کے میقات سے بلا احرام گذرنے کے وجوہ و اسباب کیا تھے؟ شروح بخاری وغیرہ مطولات میں ان سب پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور اس کا خلاصہ اوجز اور حاشیۂ لامع میں مذکور ہے اور محرم کے شکار کے ——— مسائل پر بحث "حجۃ الوداع" میں گذر چکی ہے۔

آپ کے روکنے کے بارے میں مشرکین مکہ کا مشورہ: اور جب مشرکین مکہ کو یہ خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لا رہے ہیں تو انہوں نے اس بارے میں مشورہ کیا، صلاح مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ آپ کو بیت اللہ تشریف آنے سے روکا جائے، اہل مکہ نے عرب قبائل اور جماعتِ احابیش سے بھی مدد طلب کی احابیش (حاء مہملہ، باء موحدہ اور شین معجمہ کے ساتھ) اُحْبُوْش (بضم ہمزہ و باء) کی جمع ہے، یہ بنو الہون بن خزیمہ، بنو حارث بن عبد مناۃ اور بنو المصطلق، جو خزاعہ کی ایک شاخ ہے، کا لقب ہے، کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے قریش کے ساتھ حبشی نامی پہاڑ کے نیچے، جو اسفل مکہ میں واقع ہے، عہد و پیمان کیا تھا، اس بنا پر اُن کا نام "احابیش" ہوا اور بعض نے کہا کہ تحبش کے معنیٰ اجتماع کے ہیں، ان کے تحبش یعنی اجتماع کی وجہ سے اُن کا یہ لقب پڑا۔

جاسوسی کے لئے خالد کے لشکر کی آمد: بہرحال احابیش نے قریش کی دعوت کو لبیک کہا اور یہ سب لوگ تیار ہو کر مکہ سے نکلے اور "بلوح" نامی جگہ میں ان کا لشکر جمع ہوا اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل کو دو صد افراد کی معیت میں خبر رسانی کے لئے مقرر کیا۔ میں کہتا ہوں کہ بخاری کی حدیث میں ہے کہ: ——— جب آپ

راستہ کی کسی جگہ میں تھے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ جگہ عُسفان تھی، جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ تو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالد بن ولید موضع غمیم میں۔ حافظ کہتے ہیں کہ "غمیم (بفتح غین معجمہ) سے مراد بظاہر
کراع الغمیم ہے جو مکہ و مدینہ کے درمیان جگہ کا نام ہے، سیاق حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ حدیبیہ کے قریب تھی
اور ابن حبیب کہتے ہیں کہ یہ اس مقام کے قریب ہے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے" اھ اور خمیس میں ہے
کہ ابن شہاب نے کہا ہے کہ غمیم عسفان اور ضجنان کے مابین واقع ہے اور عیاض نے کہا ہے کہ وہ عسفان کے بعد
آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک وادی ہے[1]۔ قریش کے ایک لشکر کے ساتھ بطور مقدمۃ الجیش کے آیا ہوا ہے، اس لئے
تم داہنی جانب اختیار کرو، پس اللہ کی قسم! خالد کو ان کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی یہاں تک کہ انہیں لشکر کا سیاہ غبار
اٹھتا نظر آیا، یہ دیکھ کر خالد فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر قریش کو اطلاع دینے کے لئے بھاگا" الحدیث۔

---

[1] عزیز محترم الحاج مولوی محمد رابع ندوی نے ان مقامات کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ: "بظاہر غمیم یہاں غین کے فتح اور میم کے
کسرہ کے ساتھ ہے، اور یہ وہی جگہ ہے جس کو ہمدانی نے اپنی کتاب "صفۃ الجزیرۃ العرب" میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے کہ وہ "مَرّ
اور عسفان کے درمیان ایک جگہ ہے"۔ اور مَرّ وہی جگہ ہے جو زمانہ قدیم میں "مَرّ الظہران" کہلاتی تھی اور آجکل "وادی فاطمہ" کے نام
سے معروف ہے اور مکہ سے شمال مغربی جانب۔ ہمدانی کی کتاب "صفۃ جزیرۃ العرب" کے مطابق، مکہ سے تیرہ (۱۳) میل پر اور جدید پیمائش
کے مطابق سولہ (۱۶) میل ہے۔

عُسفان، مکہ اور جحفہ کے درمیان راستہ کی ایک منزل کا نام ہے جو مکہ سے دو مرحلے یعنی چھتیس (۳۶) میل پر واقع ہے اور یہ "تہامہ" کی
آخری سرحد ہے، جیسا کہ یاقوت حموی نے "معجم البلدان" میں اور ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ذکر کیا ہے اور یہ جگہ آج تک
اسی نام سے اسی موقع پر معروف ہے جو یاقوت حموی اور ہمدانی نے بیان کیا ہے۔ اور غمیم نامی ایک اور جگہ بھی معروف ہے جو غین کے
ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یاقوت حموی نے اپنی کتاب میں اس کا محل وقوع رابغ اور جحفہ کے درمیان ذکر کیا
ہے اور یہ دونوں مقام عسفان سے تقریباً ۲۵ میل دور، بجانب شمال واقع ہیں۔ بنابریں حدیث حدیبیہ میں اس غمیم کا ذکر غیر موزون
ہے، کیونکہ اس حدیث میں غمیم کا ذکر عُسفان کے ذکر کے پہلو میں آیا ہے، نیز "غدیر الاشطاط" کے پہلو میں جو عُسفان کے قریب
جنوبی جانب واقع ہے۔ اور بعض محققین کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غمیم کو "کراع الغمیم" بھی کہا جاتا تھا، یاقوت حموی نے کراع الغمیم
کے بیان میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اس کا مؤید ہے اور ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے غمیم کے بجائے
"کراع الغمیم" کا لفظ درج کیا ہے اور وہ یاقوت حموی کی تحقیق کے مطابق عسفان سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع ہے اور
جغرافیائی پیمائش کے مطابق "غدیر الاشطاط" ان دونوں کے درمیان واقع ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلوٰۃِ خوف کا نزول: زرقانی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ غبار دیکھتے ہی قریش کو اطلاع دینے کے لئے بھاگا اور ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ خالد اپنے لشکر سمیت قریب آیا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو دیکھا اور اس کے لشکر نے ان کے اور قبلہ کے مابین صف بندی کی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عباد بن بشر اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھے اور یہ حضرات ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے اور نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی، خالد نے کہا کہ یہ لوگ (نماز میں مشغول ہونے کی وجہ سے) غفلت کی حالت میں تھے اگر ہم ان پر حملہ آور ہوتے تو انہیں صدمہ پہنچا سکتے تھے، خیر یہ موقع تو ہاتھ سے گیا اب ایک اور نماز آئے گی جو انہیں اپنی جان اور مال و اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے، پس جبریل علیہ السلام ظہر اور عصر کے مابین یہ آیت لے کر نازل ہوئے واذا کنت فیھم الآیۃ (جس میں نمازِ خوف کا حکم ہے) چنانچہ آپ نے صلوٰۃِ خوف ادا فرمائی۔ اب اگر دونوں روایتوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہو تو "صحیح" کی روایت زیادہ صحیح ہے اور اگر دونوں کے درمیان تطبیق دینا چاہو تو وہ اس طرح ممکن ہے کہ اس کا جانا اس وقت مانا جائے جب کہ وہ اور اس کے ساتھی عصر تک صف آرائی کئے رہے اور مشرکین کے حملہ سے مایوس ہو گئے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں یہی بہتر ہے اس لئے کہ کتب سنن میں یہی مشہور ہے کہ صلوٰۃِ خوف کا نزول ظہر و عصر کے درمیان میں ہوا ہے چنانچہ ابوداؤد میں حضرت ابو عیاشؓ زرقی سے روایت ہے کہ "ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عسفان میں تھے اور مشرکین کے لشکر پر خالد بن ولید امیر مقرر تھا۔ ہم نے ظہر کے وقت کی نماز پڑھی تو مشرکین کہنے لگے، کہ ہم نے انہیں بے خبری اور غفلت میں تو پایا ہی تھا، کیا اچھا تھا کہ ہم ان پر نماز کی حالت میں حملہ کر دیتے۔ اس پر آیتِ قصر، ظہر اور عصر کے درمیان نازل ہوئی، چنانچہ عصر کا وقت ہوا تو آپ قبلہ رخ کھڑے ہوئے" الخ اور حضرت شیخ تکملہ میں فرماتے ہیں کہ "مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصہ کس غزوہ میں پیش آیا۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عسفان میں پڑاؤ غزوہ بنی لحیان میں فرمایا اور اس وقت قتال نہیں ہوا۔ بعض اہلِ تاریخ کہتے ہیں

ان تمام امور کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں کسی جگہ تھے غالباً عسفان یا غدیر الاشطاط میں ہونگے یا ان کے قریب کسی اور جگہ جس کا اندازہ سیاقِ حدیث سے کیا جا سکتا ہے تو آپ نے صحابہؓ کو بتایا کہ خالد غمیم میں ہے اور انہیں حکم دیا کہ داہنی جانب لیں اور یہ راستہ سے مغربی جانب تھی تاکہ آپ صحابہؓ کو خالد اور خالد کی جگہ سے جو ان کے قریب ہی راستہ پر واقع تھی ہٹا دیں بنابریں اُن کا رخ جدّہ یا حدیبیہ کی طرف ہو گیا جو ان کے آگے جنوبی جانب اور مکہ سے مغربی جانب واقع تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے چل کر حدیبیہ جا پہنچے اور خالد نے لشکر کا غبار دیکھا تو مکہ جا کر قریش کو خبر کی۔ ان مقامات کی تعیین کے لئے ملحقہ نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔

نقشہ متعلقہ حاشیہ صفحہ ۲۳۷
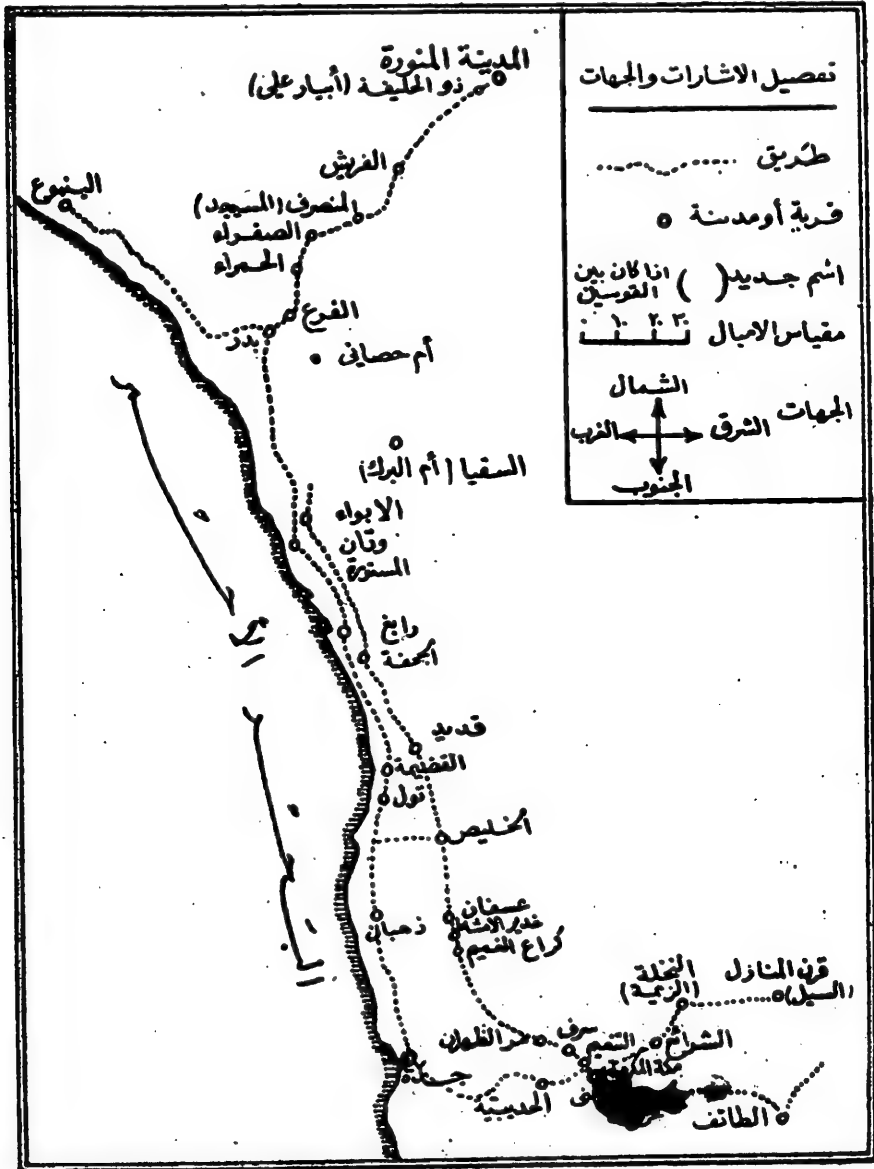
اس غزوہ میں کسی سے مقابلہ نہیں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور کوئی قصہ پیش نہیں آیا، اور نہ کتب تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت خالد بن ولید مشرکین کے امیر تھے، واللہ اعلم۔ انتہی، اور تلخیص البذل میں ہے کہ مجھے بعد ازاں فتح الباری میں یہ تصریح ملی ہے کہ واقدی نے خالد بن ولید کی حدیث نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کی طرف نکلے تو عسفان میں میرا آپؐ سے سامنا ہوا چنانچہ میں آپؐ کے مقابلہ میں صف آرا رہا۔ آپؐ نے اپنے اصحابؓ کو نماز ظہر پڑھائی، ہمارا ارادہ ہوا کہ اچانک حملہ کر دیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے وقت نماز خوف پڑھائی" الخ اس روایت سے صراحۃً پتہ چلتا ہے کہ وہ حدیث قصۂ حدیبیہ سے ہی متعلق ہے اور ابن قیمؒ ابی عیاش زرقی کی روایت کی بنا پہ آیت کا نزول عسفان ہی میں ملنے ہیں مگر یہ تفصیل نہیں بتاتے کہ یہ غزوۂ حدیبیہ تھا یا کوئی اور غزوہ۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو ہمیں ان کی راہ سے ہٹ کر کسی اور راہ سے لے چلے؟ قبیلہ اسلم کا ایک آدمی، جس کا نام حمزہ بن عمرو اسلمی تھا، کہنے لگا کہ میں لے جا سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ انہیں گھاٹیوں کے بیچ میں سے ایک دشوار گزار اور کٹھن راستہ سے لے چلا، اور جب بمشکل تمام اسے عبور کر کے وادی کے آخر میں ہموار زمین پر پہنچے تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو فرمایا کہ نستغفر اللہ ونتوب الیہ کہو (یعنی ہم اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے ہیں اور اس کے سامنے توبہ کرتے ہیں) چنانچہ سب نے یہ کلمہ کہا، تو آپؐ نے فرمایا: بخدا! یہ وہی "حطۃ" ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم ہوا مگر انہوں نے نہیں کہا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ موضع حمض: (حاء مہملہ کے فتح میم کے سکون اور ضاد معجمہ کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے۔ زرقانی) کے آگے دائیں جانب کے راستہ چلو۔ جو اسفل مکہ میں حدیبیہ کی طرف اترنے کی جگہ "ثنیۃ المرار" پر نکلتا ہے۔ چنانچہ لشکر اس راستے پر چلا اور قریش کے "مقدمۃ الجیش" شاہسواروں نے لشکر کا جو اُن کے راستہ سے ہٹ کر جا رہا تھا، غبار اُٹھتا ہوا دیکھا، تو فوراً گھوڑے دوڑاتے ہوئے قریش کے پاس واپس پہنچ گئے۔

خزاعی جاسوس کی واپسی: یہاں تک کہ جب غدیر الاشطاط (بفتح غین معجمہ و کسر دال مہملہ و شین معجمہ اور دو طاء کے ساتھ "شط" کی جمع ہے۔ یہ جگہ حدیبیہ کی جانب عسفان سے تین میل دور بجانب مکہ وادی کے کنارے ہے) پہنچے تو آپؐ کے پاس آپؐ کا خزاعی جاسوس آپہنچا جسے آپؐ نے ذوالحلیفہ سے اہل مکہ کی جانب قریش کی خبر لینے کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ قریش نے آپؐ کے مقابلہ کے لئے بہت سی جماعتوں اور "احابیش" کو جمع کر رکھا ہے۔ جو آپؐ سے لڑنے، بیت اللہ سے روکنے اور مکہ میں داخلہ سے ہٹانے کو تیار ہیں۔ اور ابن اسحٰق روایت ہے کہ امام زہری فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپؐ کو موضع عسفان میں بسر ملا اور

کہنے لگا کہ قریشیوں کو آپؐ کے سفر کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ اپنی عورتوں، بچوں یا دودھ دینے والے جانوروں (العوذ المطافیل) کو ساتھ لے کر نکل آئے ہیں [لامع کے حاشیہ میں ہے: "العوذ المطافیل، عین کی پیش اور واؤ کے سکون کے ساتھ اس کے بعد ذال معجمہ۔ دودھیالی اونٹنی۔ وہ مائیں جن کے ساتھ ان کے بچوں بھی ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے ساتھ دودھ کے جانور لے کر نکلے ہیں تاکہ ان سے غذا حاصل کرتے رہیں، اور جب تک آپؐ کو روک نہ دیں، واپس نہ جائیں یا بچوں سمیت عورتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ عورتیں اور بچے لے کر نکلے ہیں کیوں کہ اُن کا طویل قیام کا ارادہ ہے نیز اس لئے کہ یہ امر عدم فرار کے لئے زیادہ مفید ہے، اور کرمانی کہتے ہیں کہ: المطافیل: المطفل کی جمع ہے۔ ان ماؤں کو کہتے ہیں جن کے بچے ساتھ ہوں، یعنی یہ قبائل آپؐ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور اپنے ساتھ اموال بھی لے آئے ہیں" انتہیٰ] انہوں نے چیتوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور وہ طویٰ میں فروکش ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر رہے ہیں کہ آپؐ بزور قوت اُن پر غلبہ حاصل کر کے مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔" اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ مشرکین کو آپؐ کے نکلنے کی خبر پہنچی تو انہوں نے آپؐ کو مکہ سے روکنے پر اتفاق کر کے "بلدح" نامی جگہ میں لشکر جمع کیا اور الخرائطی "الہواتف" میں ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال عازم مکہ ہوئے تو بُسر بن سفیان الکعبی آپؐ کے پاس آئے، آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ اہل مکہ کو ہماری آمد کا علم ہو چکا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا کہ اُس نے فلاں رات بیت اللہ کا طواف کیا اور قریش اپنی مجلس میں جمع تھے کہ جبل ابو قبیس کی چوٹی سے ایک شخص نے چیخ چیخ کر یہ اشعار اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ تمام مکہ میں سُنائی دیتے تھے (یہاں زرقانی نے وہ اشعار نقل کئے ہیں) بس پھر کیا تھا تمام مکہ کانپ اُٹھا اور سب نے عہد معاہدہ کیا کہ اس سال تو آپؐ مکہ میں داخل نہیں ہو پائیں گے۔ آپؐ نے یہ سُن کر فرمایا کہ یہ چیخنے والا "مسلفع" ہے جو بتوں کا شیطان ہے۔ عنقریب اسے اللہ تعالیٰ قتل کر دیں گے۔ انشاء اللہ"

خرائطی کی یہ روایت اگر ثابت ہو جائے تو غالباً "بُسر" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع دی تو اس کے بعد آپؐ نے اُسے جاسوس بنا کر بھیجا ہوگا۔ تاکہ یہ پتہ کرے کہ کیا وہ جمع ہو چکے ہیں؟ چنانچہ اس نے واپس آکر آپؐ کو ان کے جمع ہونے کی خبر دی۔

جنگ کے بارے میں آپؐ کا صحابہؓ سے مشورہ کرنا: اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! مجھے مشورہ دو کیا یہ مناسب ہے کہ ہم ان کافروں کے اہل و عیال کا رُخ کریں۔ پس اگر یہ لوگ ہمارے مقابلے میں آگئے تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ایک چیدہ جماعت کو (عیناً) کاٹ دیا ہوگا۔ ورنہ ہم انہیں لٹا پٹا کر چھوڑیں گے،

(محروبین: یعنی جن کے مال اور اہل وعیال چھین لئے گئے ہوں) اور امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ "کیا تم رائے دیتے ہو کہ ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا رُخ کریں جو ان قریش کی مدد کے لئے جمع ہیں۔ پس ان پر حملہ کر دیں۔ پس اگر یہ بیٹھے رہے تو لُٹے پٹے اہل وعیال سے محروم ہو کر بیٹھیں گے اور اگر وہ نہ آئے تو یہ ایک ایسی جماعت (عنق) ہو گی جسے اللہ تعالیٰ نے کاٹ ڈالا ہے" اور ایک روایت میں ہے: کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے اہل وعیال کا رُخ کروں جو ان کی مدد کو آئے ہیں پس ہم ان کو پکڑیں پس اگر وہ بیٹھے رہے تو اہل وعیال گنوا بیٹھیں گے۔ اور اگر وہ بچ نکلے تو وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ یا تم یہ رائے دیتے ہو کہ ہم بیت اللہ کا رُخ کریں پھر جو آڑے آئے اس سے جنگ کریں"(اصل کتاب میں "وان لم یجیئوا" کا لفظ ہے جس کا ترجمہ کیا گیا مگر بظاہر "لم" کا لفظ نہیں ہونا چاہیئے اور آگے حافظ کے کلام میں یہی عبارت آرہی ہے، اس میں "لم" کا لفظ نہیں ہے۔ مترجم) میں کہتا ہوں کہ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "پس فرمایا: اے لوگو! مجھے مشورہ دو، کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے اہل وعیال کا رُخ کروں جو ہمیں بیت اللہ سے روکنا چاہتے ہیں۔ پس اگر یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں آئے تو اللہ تعالیٰ مشرکین کی ایک چیدہ جماعت کو الگ کر دے گا۔ ورنہ ہم انھیں اہل وعیال سے محروم کر دیں گے" اور لامع میں ہے کہ: "ارشادِ نبوی: ہم ان لوگوں کے اہل وعیال کا رُخ کریں" اس سے مُراد وہ کفار ہیں جو قریش کی مدد کے لئے مکہ گئے ہوئے تھے اور ان کے اہل وعیال تنہا رہ گئے تھے۔ اور ارشادِ نبوی: "قطع عنا عینا" میں عیناً سے جماعت مُراد ہے۔ یعنی جب یہ کفار اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئیں گے، تو اہل مکہ کے ساتھ ان میں سے کوئی بھی نہیں رہے گا۔ جس سے اُن کی جمعیت ٹوٹ جائے گی۔ اور ممکن ہے (کہ عین سے مُراد جاسوس لیا جائے اور) یہ مطلب ہو کہ جب یہ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ آئیں گے تو ہمیں مکہ میں جاسوس بھیجنے اور وہاں جمع ہونے والے کفار کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیوں کہ وہاں قریش کے علاوہ کوئی نہیں رہے گا، اس لئے جاسوس بھیجنے کی ضرورت نہ ہو گی، کیوں کہ وہاں قریش کے سوا کسی کا باقی نہ رہنا معلوم ہو چکا"۔

قد قطع اللہ عیناً کا مطلب: اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث میں جو عیناً کا لفظ آیا ہے، شارحین نے اس کے چند معنیٰ ذکر کئے ہیں، جو عنقریب ذکر ہوں گے، ان میں سے بعض قریب ہیں اور بعض بعید۔ اور حضرت شیخؒ نے عین کے معنیٰ جماعت جو اختیار کئے ہیں اس ناکارہ کے نزدیک یہی راجح بلکہ متعین ہے۔ کیوں کہ "عین" بمعنیٰ جماعت بھی آتا ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے اور اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں عیناً کے بجائے عنقاً کا لفظ آیا ہے، چنانچہ حافظ فتح میں فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ "وان یجیئوا

---

(۱) "یا تمہاری رائے یہ ہے کہ ہم بیت اللہ کا رُخ کریں، پھر جو شخص آڑے آئے اس سے لڑیں"۔ زرقانی اور خمیس میں ہے کہ "اے لوگو! مجھے مشورہ دو،

تکن عنقا قطعھا اللّٰہ۔" اگر وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ آئے تو ایک جماعت 'عنقا' ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے الگ کر دیا"۔ اور مغازی ابن اسحاق کی ایک روایت زہری سے بھی اسی مثل کی ہے، اور اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ جو لوگ قریش کی مدد کے لئے جمع ہیں ان کے گھروں پر حملہ کر کے ان کے اہل وعیال کو گرفتار کر لیا جائے، پھر اگر یہ لوگ اپنے اہل وعیال کی مدد کو آئے، تو اُن کو قریش سے توجہ ہٹانا پڑے گی۔ اندریں صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا مقابلہ صرف قریش سے رہ جائے گا، پس یہ مراد ہے آپ کے اس ارشاد سے کہ "یہ ایک جماعت (عنقا) ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے الگ کر دیا ہے"۔ اھ اور مجمع میں ہے کہ "حدیث حدیبیہ میں آتا ہے! وان نجوا یکن عنق قطعھا اللّٰہ (اور اگر وہ بچ نکلے تو وہ ایک عنق 'گردن' ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ نے کاٹ دیا ہے) یہاں عنق سے مُراد لوگوں کی جماعت ہے اور ایک حدیث میں کہ "دوزخ سے ایک گردن نکلے گی" یہاں گردن سے ایک شخص یا جماعت مُراد ہے"۔ اھ اور کرمانی میں خطابی سے نقل کیا ہے کہ محفوظ روایت یہ ہے: "کان اللّٰہ قد قطع عنقا" یعنی اللہ تعالیٰ کفار کی ایک جماعت کو علیحدہ کر دیں گے جس سے ان کی تعداد گھٹ جائے گی اور ان کی قوت میں ضعف پیدا ہو جائے گا"۔ اور ابن قیمؒ نے بھی الھدیٰ میں لفظ 'عنقا' ہی اختیار کیا ہے۔ اور عینیؒ نے خطابی کا قول نقل کر کے آگے لکھا ہے: "خلیلؒ کہتے کہ جاء القوم عنقا کے معنٰی ہیں کہ لوگ جماعت در جماعت آئے اور اعناق رؤساء کو کہتے ہیں"۔ اھ ابن قیمؒ اس قصہ کے فوائد میں لکھتے ہیں: "منجملہ ان کے ایک یہ کہ مشرکین کے اہل وعیال اپنے مردوں سے تنہا ہوں تو انہیں لڑاکا مردوں سے قبل قید کرنا جائز ہے"!

اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ تو اس بیت اللہ کا قصد لے کر نکلے تھے۔ اس سفر میں کسی کو قتل کرنا اور لڑنا آپ کا مقصد نہ تھا۔ اس لئے آپ بیت اللہ ہی کا رُخ کریں۔ پھر ہمیں جو روکے گا دیکھا جائے گا اور اس سے ہم نمٹ لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اللہ کا نام لے کر چلو"۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ حضرت شیخؒ لامع میں تحریر فرماتے ہیں: "حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس جنگ وقتال کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ کیوں کہ اس صورت میں عمرہ کا ترک کرنا لازم تھا جب کہ یہ حضرات عمرہ کے لئے نکلے تھے اور ان کے درمیان مشہور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر عمرہ کے لئے ہے، اب اگر عمرہ چھوڑ کر قتال مصروف ہو جاتے تو اس میں، دھوکے کی سی شکل بن جاتی"۔ اھ اور زرقانی میں ہے کہ امام احمدؒ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرتے ہوئے نہیں۔

دیکھا، آپؐ کا یہ عمل ارشادِ خداوندی "وشاورہم فی الامر" (اور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کیجئے) کے امتثال کی خاطر تھا۔" حافظؒ نے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے یہ حصہ اس کے مُرسل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا۔ کیوں کہ زہریؒ کو حضرت ابوہریرہؓ سے سماع حاصل نہیں۔

اونٹنی کے بیٹھنے کا قصہ: پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ جب ثنیۃ المرار پہنچے، یہ وہ گھاٹی ہے جس سے اہلِ مکہ کی طرف راستہ اُترتا تھا۔ حافظؒ کہتے ہیں: "المرار، میم کے کسرہ اور راء کی تخفیف کے ساتھ پہاڑ کا وہ راستہ جو حدیبیہ جا پہنچتا ہے۔ اور داؤدی کا یہ خیال وہم ہے کہ وہ اسفل مکہ کی گھاٹی کا نام ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ خمیس میں ایک جگہ ارمیاء کا جو لفظ ہے غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ تو آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی! پس لوگوں نے کہا: حَل حَل (دونوں میں حاء کا فتحہ اور لام کا سکون) اونٹنی جب چلنے سے رُک جائے تو اُسے چلانے کے لئے یہ لفظ کہا جاتا ہے۔ مگر وہ بدستور بیٹھے رہنے پر مُصر رہی۔ پس لوگوں نے کہا: خلأت القصواء، خلأت القصواء" (قصواء رک کر بیٹھ گئی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصواء رُکی نہیں، نہ اس کی یہ عادت ہے" یعنی تھک کر بیٹھ جانا اس کی عادت نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو" بلکہ اس کو ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے" یعنی اللہ عزوجل نے اس کو چلنے سے روک دیا ہے"۔ اور لامع میں اس کی شرح میں لکھا ہے: "یہ حق تعالیٰ کی جانب سے بیت اللہ کی تعظیم پر تنبیہ تھی۔ یہاں تک کہ ناقہ بھی باوجود لاعقل ہونے کے اس کا رُخ نہیں کرتی جب تک کہ اُسے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کا سوار (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) بیت اللہ کی بیحرمتی کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور بیت اللہ کی قابلِ احترام چیزوں میں سے کسی چیز کی حرمت میں خلل ڈالنا چاہتا ہے" اور حاشیہ لامع میں ہے کہ حافظ فرماتے ہیں: ہاتھیوں کا قصہ مشہور ہے اور یہاں اس کے ذکر کی مناسبت یہ ہے کہ اگر صحابہؓ اسی حالت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے اور قریش انہیں روکنے کی کوشش کرتے تو جنگ وقتال کی نوبت آتی جو قتل و غارت اور لوٹ مار پر منتج ہوتی۔ نیز اس موقعہ پر مکہ میں بہت سے کمزور مسلمان مرد، عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔

اب اگر صحابہؓ مکہ پر حملہ آور ہوتے تو اندیشہ تھا کہ غیر شعوری طور پر ان ضعفاء مسلمین کا نقصان ہو جاتا" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے "ولولا رجال مومنون" الآیۃ" میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور مہلبؒ نے اللہ تعالیٰ پر حابس فیل' کے لفظ کے اطلاق کو مستبعد سمجھتے ہوئے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ ہاتھی کو اللہ تعالیٰ کے حکم نے روک لیا۔ اور مہلبؒ کا تعقب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس لفظ کا اطلاق جائز ہے۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس اونٹنی کو اسی اللہ تعالیٰ نے روک لیا جس نے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ ہاں: اللہ تعالیٰ کا حابس فیل'۔ (ہاتھیوں کو روکنے والا) یا اس قسم کا نام رکھنا صحیح نہیں۔ ابن منیر نے یہی جواب دیا ہے اور یہ جواب اس صحیح مذہب

پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں۔ (یعنی قرآن و حدیث میں اللہ جل شانہ کے جو نام آئے ہیں صرف ان ہی کا استعمال صحیح ہے۔ اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام رکھنا صحیح نہیں) پوری بحث فتح میں ہے۔ پھر فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ حافظؒ کہتے: اس موقع میں کلام کو قسم کے ساتھ مؤکد فرمایا، تاکہ مزید قبولیت کا فائدہ دے۔" ابن قیمؒ نے الھدیٰ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسّی سے زیادہ مواقع میں قسم کھانا ثابت ہے۔ یہ لوگ مجھ سے کسی ایسی چیز کا، جس سے حرمات الٰہی کی تعظیم مقصود ہو، سوال نہیں کریں گے مگر میں اسے بالضرور قبول کر لوں گا۔ حرماتِ الٰہی کی تعظیم سے مراد حرم میں قتال نہ کرنا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حرمات سے حرم، شہرِ حرام اور احرام کی حرمت مُراد ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ تیسری چیز یعنی حرمتِ احرام کا مراد ہونا محلِ نظر ہے۔ اس لئے کہ اگر مشرکین کو احرام کی حرمت ملحوظ ہوتی تو آپؐ کو بیت اللہ سے کیوں روکتے؟ خطابی کہتے ہیں کہ اس قصّہ میں حرماتِ الٰہی کی تعظیم سے مُراد ہے حرم میں قتال نہ کرنا، صُلح کی جانب مائل ہونا اور خونریزی سے ہاتھ روکنا۔" اھ یہ کہہ کر آپؐ نے اونٹنی کو اُٹھایا پس وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی، پس آپؐ نے کفار سے رُخ پھیر لیا۔ ابن سعدؒ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے واپسی کا رُخ کیا۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ اُتر جاؤ (یعنی پڑاؤ کر لو)۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس وادی میں کہیں پانی نہیں جہاں پڑاؤ کریں۔ اور لامع میں ہے: "آپؐ نے اُن سے رُخ بدل لیا" کیوں کہ اگر آپؐ مکہ میں داخل ہو کر اچانک کفار تک پہنچ جاتے تو اس کے نتیجے میں جنگ و قتال یا کسی اور مفسدہ کی نوبت آسکتی تھی۔ اس لیے کہ جمِ غفیر جب شہر میں داخل ہوتا تو مقابلہ اور ٹکراؤ لازمی تھا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے راستے سے رُخ بدل لیا۔ اور ان سے پہلو تہی کر کے پڑاؤ کیا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ آپؐ ان سے اُلجھنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ورنہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ طواف کا نہ ہوتا تو ان کی غفلت کی حالت میں آپؐ ان پر لشکر چڑھا لاتے۔" اور لامع کے حاشیہ میں عینیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ داؤدی کہتے ہیں: "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ناقہ قصواء بیٹھ گئی ہے تو آپؐ نے جان لیا کہ ارادۂ خداوندی انہیں لڑائی سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس امر کا فیصلہ فرمائے جو ہو کر رہنے والا تھا۔" اھ

پانی میں برکت کا معجزہ: یہاں تک کہ آپؐ حدیبیہ کے آخری کنارے پر ایسی جگہ اترے جہاں پانی بہت کم تھا۔

ثمد: ثاء اور میم مہملہ کے ساتھ فتحہ اور دال مہملہ کے ساتھ۔ کم پانی والی جگہ۔ صاحب مواہب نے دیگر حضرات کی طرح اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ: "وہ گڑھا جس میں بہت کم پانی ہو"۔ کہا جاتا ہے کہ "ماءٌ مثمود" یعنی کم پانی۔ اس سے معلوم

ہوا کہ بخاری شریف کی روایت میں ثمد کے بعد "قلیل الماء" کے لفظ کا اضافہ تاکید کے لئے ہے، کیونکہ بعض لوگوں کی زبان میں ثمد کا لفظ زیادہ پانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اس لئے اس تاکید سے اس لغت کے مراد ہونے کے وہم کو رفع کرنا مقصود ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "ثمد" اس پانی کو کہتے ہیں جو موسم سرما میں رہتا ہو اور موسم گرما میں خشک ہو جائے۔ مگر اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ توجیہ جب صحیح ہے جب کہ از روئے لغت ثابت ہو جائے کہ لفظ ثمد، کثیر پانی پر بھی بولا جاتا ہے۔ پوری بحث زرقانی میں ہے :

——— کہ لوگ اس کو چلوؤں سے تھوڑا تھوڑا اٹھاتے تھے (اصل عبارت یہ ہے یتبرضہ : پہلے یا، پھر تا، پھر را مشدد پھر ضاد معجمہ الناس تبرضا) قسطلانی کہتے ہیں تبرضا باب تفعل سے مفعول مطلق ہے جو یہاں اظہار تکلف کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی لوگ اسے تھوڑا تھوڑا لیتے ہیں"۔ حافظؒ کہتے ہیں: "برض فتح اور سکون کے ساتھ معمولی عطیہ کو کہا جاتا ہے۔ صاحب عین کہتے ہیں کہ تبرض کے معنی ہیں چلوؤں سے پانی جمع کرنا"۔ عروہ کا بیان ہے کہ قریش پانی پر پہلے پہنچ کر قبضہ جما چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شدید گرمی کے موسم میں حدیبیہ تشریف لائے تھے اور وہاں ایک ہی کنواں تھا۔ پس وہ پانی جلد ہی ختم ہو گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیاس کی شکایت کی گئی۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک رکوہ (برتن) میں رکھا تو انگشتان مبارک کے درمیان سے پانی چشموں کی طرح پھوٹنے لگا میں کہتا ہوں کہ یہ قصہ کنوئیں میں تیر ڈالنے کے قصہ سے پہلے پیش آیا تھا۔ اور یہ قصہ امام بخاریؒ نے مغازی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "حدیبیہ کے دن لوگوں کو پیاس نے ستایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی کا لوٹا تھا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔ پھر لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے پاس نہ وضو کے لئے پانی ہے نہ پینے کے ——— بس یہی پانی ہے جو آپ کے برتن میں ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس برتن میں رکھا تو پانی انگشتان مبارک کے درمیان سے چشموں کی طرح ابلنے لگا۔ پس ہم نے پیا اور وضو کیا۔ حضرت جابرؓ سے دریافت کیا گیا کہ اس دن آپ کی تعداد کتنی تھی؟ فرمایا! اگر اس دن ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو پانی کافی ہو جاتا، مگر ہم صرف پندرہ سو (۱۵۰۰) تھے"۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد کنوئیں کا وہ قصہ پیش آیا جو زرقانی اور صاحب خمیس نے ذکر کیا ہے۔

——— کہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیاس کی شکایت کی تو آپ نے اپنی ترکش سے ایک تیر نکالا، پھر انہیں حکم فرمایا کہ اس کو پانی کے کنوئیں میں رکھ دیں۔ حافظؒ مقدمہ میں کہتے ہیں کہ ابن سعد نے چودہ انصاری صحابہؓ سے روایت کیا ہے کہ جو صاحب کنوئیں میں اترے تھے ان کا نام ناجیہ بن الاعجم تھا، بعض نے ناجیہ بن جندب کا جو ہدی کے جانوروں

پر مامور تھے۔ اور بعض نے براء بن عازب کا اور بعض نے عباد بن خالد کا نام ذکر کیا ہے اور الاستیعاب میں خالد بن عبادہ مذکور ہے۔ اور فتح میں فرماتے ہیں: تطبیق یوں ممکن ہے کہ کنواں کھودنے وغیرہ میں ان سب حضرات نے حصہ لیا۔" حافظؒ کہتے ہیں کہ "مغازی میں قصۂ حدیبیہ کے سلسلہ میں حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کنوئیں پر بیٹھے پھر ایک برتن طلب فرمایا۔ اس میں کلی کی۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی۔ پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا، پھر فرمایا کچھ دیر انتظار کرو، بعد ازاں صحابہؓ نے اس سے پانی نکالا اور خوب سیراب ہوئے اور تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ یہ دونوں قصے پیش آئے ہوں اور واقدی نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں وضو کیا پھر اسے کنوئیں میں الٹ دیا اور ایک تیر نکال کر کنوئیں میں رکھ دیا۔ اور ابوالاسود نے عروہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول میں کُلّی کی پھر اسے کنوئیں میں ڈال دیا اور اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اس میں ڈالا، اور دُعا فرمائی! پس کنواں جوش مارنے لگا۔ پس یہ قصہ اس قصہ سے علاوہ ہے جو مغازی میں آئے گا، کہ لوگ پیاسے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک برتن رکھا تھا، آپؐ نے اپنا دستِ مبارک اس میں رکھا تو پانی انگشتانِ مبارک کے درمیان سے چشموں کی طرح اُبلنے لگا، الحدیث؛ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتانِ مبارک کے درمیان سے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس کے علاوہ بھی کئی موقعوں پر پیش آیا اور غزوۂ حدیبیہ کے آغاز میں آئے گا کہ حدیبیہ میں بارش بھی ہوئی تھی، الحدیث؛ اور بارش ہونے کا مذکورہ واقعہ، مذکورہ بالا دونوں قصوں کے بعد ہوا تھا" فتح الباری کی عبارت ختم ہوئی۔

پس بجذادہ اُن کے لئے برابر جوش مارتا رہا یہاں تک کہ وہ اس سے واپس ہوئے یعنی سیراب ہو کر لوٹے اور ابن سعدؒ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "یہاں تک کہ انہوں نے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر برتن بھرے"۔ فتح میں اسی طرح ہے نیز حافظؒ مغازی میں حضرت جابرؓ کی حدیث جس میں برتن میں ہاتھ رکھنے کا قصہ آتا ہے، کے ذیل میں فرماتے ہیں "یہ حدیث حضرت براءؓ کی حدیث کے مغائر ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کا پانی کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور ابن حبانؒ نے ان دونوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا اور کتاب الاشربہ میں یہ تفصیل آئے گی کہ حضرت جابرؓ کی حدیث کے پانی پھوٹ نکلنے کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ نمازِ عصر کے وقت وضو کی ضرورت ہوئی اور حدیث براءؓ کا قصہ، عام ضروریات کے لئے پیش آیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب آپؐ کی انگشتانِ مبارک کے درمیان سے برتن میں پانی پھوٹ نکلا اور تمام حضراتِ صحابہؓ وضو اور پینے سے فارغ ہو گئے تو آپؐ نے برتن کے باقی ماندہ پانی کو کنوئیں میں ڈال دینے کا حکم فرمایا جس سے اس کا پانی بڑھ گیا"۔

اور امام احمدؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص چمڑے کا ایک برتن لایا جس میں معمولی پانی تھا اور پوری جماعت میں اس کے علاوہ پانی نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ایک پیالے میں انڈیل دیا پھر آپؐ نے اس سے

خوب اچھی طرح وضو کیا پھر آپؐ اس پیالے کو یونہی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ اس پیالے پر ٹوٹ پڑے۔ آپؐ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا: ذرا ٹھہر جاؤ! پھر اپنا دست مبارک پیالے میں ڈال کر فرمایا: ہاں! خوب وضو کرو، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: "بخدا میں نے دیکھا کہ پانی کے چشمے آپؐ کی انگشتانِ مبارک کے درمیان سے اُبل رہے تھے۔" حافظؒ کہتے ہیں کہ آپؐ کی انگشتانِ مبارک سے پانی نکلنے کا واقعہ سفر اور حضر میں کئی بار پیش آیا۔" اھ مختصراً

حدیبیہ میں بارش کا قصہ: میں کہتا ہوں کہ حافظ کے کلام میں ابھی گذرا ہے کہ ان دونوں قصوں کے درمیان بارش کا مشہور واقعہ پیش آیا اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا، کہ صبح ہوئی تو میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا، الحدیث: یہ قصہ امام بخاریؒ نے غزوۂ حدیبیہ میں حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ والے سال نکلے، ایک رات ہم پر بارش ہوئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی ــــ پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: اللہ و رسولہ اعلم (اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبح ہوئی تو کچھ لوگ مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور کچھ کفر کرنے والے، پس جس نے یہ کہا ہمیں اللہ کی رحمت، اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی اور اللہ کے فضل و کرم سے بارش نصیب ہوئی وہ مجھ پر ایمان لائے اور ستاروں سے کفر کیا، اور جس نے کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی بدولت بارش ملی وہ ستاروں پر ایمان لائے اور مجھ سے کفر کیا۔" اوجز میں اس حدیث کی شرح اور اس کے مختلف الفاظ پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔"

آیتِ فدیہ کا نزول: نیز حدیبیہ ہی میں کعب بن عُجرہؓ کا قصہ پیش آیا اور فدیۂ اذیٰ کی آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آکر کھڑے ہوئے در آں حالیکہ میرے سر سے جوئیں گر رہی تھیں، پس فرمایا کہ کیا تیرے سر کی جوئیں تجھے ایذا دیتی ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں، فرمایا: تو پھر اپنا سر منڈا ڈالو۔" حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی "فمن کان منکم مریضاً او بہ اذی من راسہ" الآیہ، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین دن روزے رکھ، اور ایک اور روایت میں ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ کو حدیبیہ میں سر منڈانے کا حکم فرمایا اور صحابہؓ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ انہیں یہیں احرام کھولنا ہوگا، وہ تو یہ امید لئے بیٹھے کہ مکہ میں داخل ہوں گے، الحدیث، اوجز میں اس قصہ کی روایت کے مختلف الفاظ تفصیل سے نقل کئے ہیں۔ منجملہ ان کے طبریؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں، "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے (یعنی کعب بن عجرہؓ سے) ملے اور وہ بحالت احرام شجرہ کے پاس تھے۔" اور ایک روایت میں ہے "میں اپنی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہا تھا اور جوئیں میرے چہرے پر جھڑ رہی تھیں۔" اور ایک اور روایت میں ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ حدیبیہ میں تھے، ہم نے احرام باندھ رکھا تھا اور مشرکین نے ہمیں روک رکھا تھا"۔ ان کے علاوہ اور الفاظ بھی ہیں۔
اس قصہ میں بہت سی فقہی بحثیں ہیں جو اوجز میں ـــــ تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں، مثلاً فدیہ[۱] اذی کے روزوں کی تعداد کتنی ہو؟
روزہ[۲] کے محل کی بحث، مسکین کو کتنی[۳] مقدار میں کھانا کھلایا جائے یا غلہ دیا جائے؟ کھانا کھلانے[۴] کا محل؟ مناسک[۵] حج سے متعلقہ مباحث کہ ان کی جگہ کون کون سی چیزیں کفایت کر سکتی ہیں؟ اور[۶] یہ بحث کہ جب تک موجب فدیہ کوئی چیز نہ پائی جائے کوئی شخص فدیہ ادا نہیں کر سکتا۔ ان کے علاوہ بھی مباحث ہیں جو اوجز اور لامع کے حاشیہ میں ذکر کر چکا ہوں۔

بُدیل کی آمد: دریں اثناء کہ وہ اسی طرح حدیبیہ میں محصور تھے کہ بُدیل (با موحدہ اور صیغہ تصغیر کے ساتھ) حافظؒ نے کہا ہے کہ یہ مشہور صحابی ہیں۔ ابن ورقاء (فتحہ واؤ اور سکون راء، قاف اور مد کے ساتھ) ابن عمرو بن ربیعہ خزاعی (بضم خاء اور زاء کے ساتھ) بنو خزاعہ کی طرف نسبت ہے آگے۔ یہ اپنی قوم کے سردار تھے، ابو عمرو کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کے دن مر الظہران میں اسلام لائے تھے، ابن اسحاق نے کہا کہ بدیلؓ غزوۂ حنین، غزوۂ طائف اور غزوۂ تبوک میں شریک ہوئے اور یہ فتح مکہ میں اسلام لانے والے اکابر میں سے تھے، بعض نے کہا ہے کہ یہ فتح مکہ سے قبل اسلام لائے، ابن مندہ اور ابو نعیم نے کہا ہے کہ یہ زمانہ قدیم سے اسلام لا چکے تھے۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ بدیل کے ساتھ ان کی قوم خزاعہ کے چند افراد تھے۔ ان میں عمرو بن سالم، خراش بن امیہ، خارجہ بن کرز اور یزید بن امیہ کا نام قابل ذکر ہے، اور یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد تھے (اصل عبارت یہ ہے "وکانوا عَیْبَۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" عَیْبَۃ: بفتح عین، وسکون یاء اور اس کے بعد باء۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں حفاظت کے لئے کپڑے رکھے جائیں یعنی یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پکے خیر خواہ اور آپؐ کے راز دار تھے اور امین تھے، گویا سینہ کو جو راز کی امانت گاہ ہوتا ہے، اس صندوقچہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس میں کپڑے بحفاظت رکھے جاتے ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ بنو خزاعہ کے تمام لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار تھے، مسلمان بھی اور غیر مسلم بھی۔ مکہ میں جو کچھ ہوتا تھا اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں رکھتے اور واقدی کی روایت میں ہے کہ بُدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپؐ لڑائی کے لئے آئے ہیں مگر آپؐ کے پاس اسلحہ تو ہے نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہم جنگ و قتال کے لئے نہیں آئے"۔ زرقانی نے حافظؒ کی پیروی میں کہا ہے کہ: بنو خزاعہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی کی بنیاد یہ ہے کہ بنو ہاشم نے جاہلیت میں بنو خزاعہ سے معاہدہ کیا تھا اس لئے زمانہ اسلام میں بھی وہ اس پر قائم رہے۔ پس بُدیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں کعب بن لوی اور عامر بن لوی کو ان دونوں کے ذکر پر اکتفاء کیا کیوں کہ تمام قریش مکہ کا نسب انہی دونوں کی طرف راجع ہے، اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ حدیبیہ کے بڑے بڑے چشموں پر فروکش ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں کہ اعداد (بفتح ہمزہ وسکون عین) عِدّ (بکسر عین وتشدید) کی جمع ہے اور عِدّ ایسے پانی کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہو، اس لئے اعداد کی اضافت میاہ حدیبیہ کی طرف عام کی اضافت ہے خاص کی طرف"۔

اور قاموس میں ہے کہ عِدّ کا لفظ کسی چیز کی کثرت پر بھی بولا جاتا ہے اور اگر یہ معنیٰ مراد ہوں تو صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہوگی، یعنی حدیبیہ کے بڑے بڑے چشمے۔ حافظؒ کہتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں بہت سے پانی تھے اور یہ کہ قریش آکر پہلے سے پانی پر قابض ہو چکے تھے، اس لئے مسلمان جب معمولی پانی کے کنوئیں پر اترے تو ان کو پیاس نے ستایا اور عروہ کا قول پہلے گذر چکا ہے کہ قریش پہلے آکر پانی پر قابض ہو چکے تھے، اور ان کے ساتھ اہل وعیال اور دودھ والے جانور بھی ہیں "العوذ المطافیل" اس کی شرح پہلے گذر چکی ہے اور وہ آپؐ سے لڑیں گے اور آپؐ کو بیت اللہ سے روکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیل کو جواب دیا اور فرمایا ہم کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے، بلکہ عمرہ ادا کرنے کے لئے آئے ہیں اور قریش کو جنگ نے کو نہایت ضعیف و نزار کر رکھا ہے یعنی جو لڑائیاں آپؐ کے اور قریش کے درمیان بدر، احد اور خندق وغیرہ میں ہو چکی ہیں ان سے ان کی قوت ٹوٹ چکی ہے اور ان کے احوال تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔(لامع) پس اگر ان کی خواہش ہو تو میں ان سے ایک مدت کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ کر لوں۔ یعنی اپنے اور ان کے درمیان ایک مدت مقرر کر دوں جس میں ہمارے اور ان کے درمیان جنگ موقوف رہے اور وہ مجھے اور دوسرے لوگوں یعنی کفار عرب وغیرہ کو نمٹ لینے دیں، پس اگر میں ان پر غالب آگیا، پھر اگر یہ بھی میری اس اطاعت میں داخل ہونا چاہیں جس میں دوسرے لوگ داخل ہوئے تو ایسا کر لیں۔ عینیؒ کہتے ہیں کہ دوسری شرط کا پہلی شرط پر عطف ہے اور " تو ایسا کر لیں" دونوں شرطوں کا جواب ہے ورنہ اگر میں غالب نہ آیا تو ان کو راحت مل گئی کہ جنگ و قتال کی فرصت نہ رہے گی۔ عینیؒ کہتے ہیں، اگر کہا جائے کہ اس تردید کے کیا معنیٰ ہیں (یعنی اگر میں غالب ہوا تو یہ۔ اور اگر میں مغلوب ہوا تو یہ) جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قطعی یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نصرت فرمائیں گے اور آپؐ کو ان پر غالب کر کے رہیں گے۔ جواب یہ ہے کہ یہ بات مخاطب کے ذہن کی رعایت کرتے ہوئے علی سبیل التنزل اور بطور فرض فرمائی۔ اور حافظؒ کہتے ہیں کہ اسی نکتہ کی خاطر دوسری شق کو حذف کر دیا یعنی آپؐ پر دشمن کے غالب آنے کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ تصریح آئی ہے اور اس کے لفظ یہ ہیں "پس اگر لوگوں نے مجھے صدمہ پہنچایا تو قریش کی مراد بر آئے گی"۔ پس ظاہر یہ ہے کہ کسی راوی نے رعایت ادب کی خاطر اس کو حذف کر دیا اھ۔ اور اگر ان کو صلح سے انکار ہے تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اپنے دین کی خاطر ان سے لڑتا رہوں گا یہاں تک کہ میری گردن جدا ہو جائے۔ یہ کنایہ ہے قتل سے، کیوں کہ مقتول کی گردن جدا ہو جاتی ہے۔ اور داؤدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد موت ہے۔ یعنی یہاں تک کہ میری موت واقع ہو جائے اور میں اپنی قبر میں تنہا رہ جاؤں اور ممکن ہے یہ مراد ہو کہ آپؐ لڑتے رہیں گے خواہ ان کے مقابلہ میں تنہا رہ جائیں، اور بخدا! اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کے بارے

میں اپنا کام پورا کر کے رہے گا۔ مذکورہ بالا تردد کے الفاظ کے بعد اس جزم ویقین کے اظہار سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ پہلے جو بات بطور تردد کے کہی گئی یہ محض بر تقدیر فرض کہی گئی، اس قصہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اوصاف معلوم ہوئے: خداداد ہمت وشجاعت، حکم خداوندی کے نافذ کرنے میں آپؐ کی پامردی اور استقامت، امر الٰہی کی تبلیغ کا ولولہ، صلہ رحمی کی دعوت، اہل قرابت سے خیرخواہی اور شفقت۔ بُدیل نے کہا آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں میں ان کو پہنچائے دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ آپؐ سے اجازت لے کر اپنے رفقاء سمیت رخصت ہوا یہاں تک کہ قریش کے پاس پہنچا، واقدی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ قریش کے کچھ لوگوں نے آپس میں مل کر کہا کہ یہ بدیل اور اس کے لوگ آرہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم سے کچھ حال احوال معلوم کریں، لہٰذا ان سے ایک حرف بھی مت پوچھو، بدیل نے دیکھا کہ یہ تو کچھ بھی دریافت نہیں کرتے تو کہا کہ ہم اس شخص یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے تمہارے پاس آئے ہیں، اور ہم نے اس کو ایک بات کہتے سُنا ہے اگر چاہو تو وہ تمہارے سامنے پیش کریں، اس پر اُن کے کم عقل لوگوں نے ——— واقدی نے ان میں سے عکرمہ بن ابی جہل اور حکم بن عاص کا نام ذکر کیا ہے کہا: ہمیں اس کی کسی خبر کی ضرورت نہیں۔ واقدی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ہاں ہماری طرف سے اُسے کہہ دے کہ جب تک ہمارا ایک بھی آدمی زندہ ہے وہ اس سال ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کے ذی رائے لوگوں نے کہا ہاں لاؤ۔ یعنی جو کچھ اس سے سُنا ہے اس کی خبر دو۔ اور واقدی کی روایت میں ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفی نے مشورہ دیا کہ وہ بدیل کی بات سُن تو لیں، پسند آئے تو مانیں ورنہ رد کر دیں۔ اس پر صفوان اور حارث بن ہشام بولے کہ وہاں جو کچھ تم نے دیکھا ہے بیان کرو۔ بدیل نے کہا کہ میں ان صاحب سے یہ یہ سُن کر آیا ہوں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا اس نے بیان کر دیا اور ابن اسحٰق نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا کہ "بدیل نے ان سے کہا کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جلد بازی کرتے ہو، وہ جنگ وقتال کے لئے نہیں آئے، بلکہ صرف عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں" یہ سُن کر انہوں نے بدیل کو مشتبہ نظر سے دیکھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا جھکاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، چنانچہ انہوں نے کہا کہ اگر بات وہی ہے جو تو کہتا ہے۔ یعنی وہ عمرہ کے لئے آئے ہیں، تب بھی وہ زبردستی ہم پر داخل نہیں ہو سکتے، پس عروہ بن مسعود ثقفی، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف سے واپسی پر اسلام لائے اور اپنی قوم میں واپس جا کر انہوں نے اسلام کی دعوت دی، قوم نے ان کو شہید کر ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، ——— اپنی قوم میں اس کی مثال ان صاحب کی سی ہے جن کا واقعہ سورۂ یٰسٓ میں ذکر کیا گیا ہے کھڑے ہوئے اور کہا: اے قوم، کیا تم والد نہیں ہو؟ یعنی والد کی طرح شفیق نہیں ہو؟ لوگوں نے کہا: بے شک اور اس نے کہا کہ کیا میں بیٹا نہیں ہوں؟ یعنی ایسا خیرخواہ جیسا کہ بیٹا باپ کا خیرخواہ ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا

بے شک۔ اور ابوذر کی روایت میں اس کے برعکس یہ ہے کہ کیا تم بیٹے نہیں ہو؟ کیا میں باپ نہیں ہوں؟ شیخ قدس سرہ
اس کے قول "کیا تم بیٹے نہیں ہو" پر فرماتے ہیں کہ "ابن ہشام کی روایت میں اس کے برعکس ہے اور دونوں کے لئے
وجہِ صحت موجود ہے، پس اگر روایت اس کے بیٹا ہونے کی ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی والدہ سُبَیْعَہ، عبد شمس
کی بیٹی تھی۔ (لہٰذا وہ قریش کے نواسے ہوئے) اور اگر والد ہونے کی روایت صحیح ہو تو یہ باعتبارِ عمر میں بڑا ہونے کے
کہا، اور اس سے غرض اپنی ذات سے تہمت کا دفع کرنا ہے تاکہ وہ جو خبر بھی لائے اسے غلط بیانی پر محمول نہ کیا
جائے۔" اور لامع کے حاشیہ میں فتح سے نقل کیا ہے کہ صحیح روایت یہی کہ "کیا تم باپ اور میں بیٹا نہیں ہوں؟" اس
نے کہا کہ کیا تم مجھے متہم سمجھتے ہو یعنی کیا تم کو مجھ پر تہمتِ شبہ ہے وہ بولے نہیں آپ پر کوئی شبہ نہیں اور ابن اسحٰق کی
روایت میں ہے کہ وہ بولے "تم سچ کہتے ہو تم ہمارے نزدیک متہم نہیں" اس نے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے
اہلِ عکاظ (عین مہملہ کا ضمہ، کاف بغیر تشدید کے، آخر میں ظائے معجمہ، منصرف ہے) کو اٹھانا چاہا یعنی اُن کو تمہاری مدد کی
دعوت دی، پھر جب انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے اہل و اولاد اور اپنے اہل طاعت لوگوں کو لے کر تمہارے
پاس آگیا؛ انہوں نے کہا: بالکل صحیح، اس نے کہا ان صاحب نے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے
بھلائی کی بات یعنی خیر و صلاح اور انصاف کی بات کی پیش کش کی ہے اس کو قبول کر لو۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے
کہ عروہ نے اصل مدعا سے پہلے جو باتیں کہیں ان کا سبب یہ تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے پاس سے ہو کر آتا قریش کا
رویہ اس کے حق میں بڑا شدید ہو جاتا تھا اور ابن اسحٰق کی روایت میں عروہ سے پہلے مکرز اور اس کے بعد حلیس کے
جانے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ "صحیح" کی روایت زیادہ صحیح ہے اور مجھے اجازت دو کہ میں اس کے پاس جاؤں
قریش نے کہا تم جا سکتے ہو۔

عروہ کی آمد: چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی
قسم کی باتیں کرنے لگا جو بدیل نے کی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا جواب دیا جو بدیل کو دیا تھا
اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان سے لڑوں گا۔ اس وقت عروہ نے کہا: اے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم دیکھیے اگر آپ نے اپنی قوم کا قصہ پاک کر دیا۔ یعنی آپ نے ان کا بالکل ہی صفایا کر دیا تو کیا آپ نے اس
سے قبل کسی عرب کو سنا ہے کہ اُس نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا ہو اور اگر دوسری صورت ہوئی اس کا جواب ادب کی
بنا پر حذف کر دیا، مطلب یہ کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرہ سے خالی نہیں اور اس کا آئندہ قول: کیوں
کہ میں الخ: اس کی دلیل ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس نے اپنے خیال میں دونوں صورتوں کو غیر مستحسن قرار دیا کہ اگر آپ

غالب آئے تو آپ کی قوم تباہ ہو کر رہ جائے گی اور اگر آپ مغلوب ہوئے تو آپ کے صحابہؓ منتشر ہو جائیں گے۔ مگر یہ دونوں صورتیں شرعاً مستحسن ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ہَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ" یعنی تم انتظار نہیں کرتے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کا" کیوں کہ بخدا میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں۔ شیخ المشائخ حضرت گنگوہیؒ لامع میں فرماتے ہیں: "اس کا قول" میں چند چہرے دیکھ رہا ہوں" اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ چند صورتیں ایسی بھی نظر آرہی ہیں جن سے بھاگ جانا کچھ بھی مستبعد نہیں" اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ اس لفظ میں بخاری کے نسخے مختلف ہیں، اور شراح میں اس کے مفہوم و مصداق میں اختلاف ہے، چنانچہ ہندوستانی نسخوں میں اثبات کے ساتھ ہے اور فتح الباری کے نسخہ میں ہے لا اریٰ یعنی میں نہیں دیکھتا اور اسی طرح قسطلانی اور سندھی کے نسخہ میں بھی نفی کے ساتھ ہے اور عینیؒ کی موافقت میں قسطلانی نے لفظ وُجوھا کی شرح "اعیان واشراف" کے ساتھ کی ہے، مگر حافظؒ نے اور اسی طرح کرمانی نے اس کی تشریح سے تعرض نہیں کیا، پس درصورت اثبات، اعیان واشراف سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ قریش کے ساتھ تو اشراف اور سربرآوردہ لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ ہر قسم کے ملے جلے لوگ، شیخ الاسلام نے اپنی شرح میں اس فقرہ کے یہی معنی لئے ہیں اور درصورت نفی اس سے مراد مسلمان ہوں گے، یعنی آپ کے ساتھ اعیان واشراف نظر نہیں آرہے بلکہ ادھر اُدھر کے آدمی ہیں اور شیخ قدس سرہ نے جو مطلب بیان فرمایا ہے وہ ہندوستانی نسخہ پر مبنی ہے جو اثبات کے ساتھ ہے یعنی آپ کے ساتھ بے پہچانے چہرے نظر آتے ہیں جو موقع پر راہِ فرار اختیار کریں گے اور صاحب فیض نے بھی یہی معنی لئے ہیں، چنانچہ موصوف نے وجوھا (چہروں) کی تفسیر "مختلف قبائل" کے ساتھ کی ہے اور شیخؒ کے بیان کردہ معنیٰ سیاق کے زیادہ قریب ہیں، کیوں کہ یہ تمام فقرہ اس کے قول "اور اگر دوسری صورت ہوئی" کے تحت ذکر کیا گیا ہے، اور حافظؒ کے کلام سے بھی یہی معنیٰ نکلتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "اس کے قول "اور اگر دوسری صورت ہوئی" کا جواب ذکر نہیں کیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اگر قریش کو غلبہ ہوا تو آپ کی حالت خطرے سے خالی نہیں اور اس کا قول "اور بخدا! مجھے آپ کے ساتھ چند چہرے نظر آرہے ہیں"۔ یہ گویا اس جواب محذوف کی دلیل ہے"۔ پوری بحث حاشیہ لامع میں دیکھ لی جائے۔ اور زرقانی شرح مواہب میں کہتے ہیں کہ بخاری میں اس طرح "وجوھا" کا لفظ اثبات کے ساتھ ہے اور مصنف یعنی قسطلانی نے اس کی شرح "اعیان واشراف" کے ساتھ کی ہے، لہٰذا اس سے مراد قریش ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء تو اعیان واشراف ہیں اور آپ کے صحابہؓ ملے جلے (مختلف قبائل کے گھٹیا بڑھیا قسم کے سبھی) لوگ

ہیں اور مواہب کے بعض نسخوں میں اس "لا" کی بجائے: "لا اری" کا تصحیف شدہ لفظ ہے۔ یعنی میں نہیں دیکھتا، اور شارح نے اس نسخہ کو نقل کرنے پر کفایت کر کے اس کی شرح میں تکلف کیا ہے کہ یہ صحابہؓ کے میدانِ جنگ ثابت قدم نہ رہنے کی گویا دلیل ہے۔ یعنی ان سے مدد کی توقع نہیں، نہ یہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے کیوں کہ یہ ملے جلے لوگ ہیں، کسی ایک قبیلہ کے افراد نہیں کہ ایک دوسرے کی مدد کے لئے میدان میں ڈٹ جانے کا جذبہ اُن میں پایا جائے۔ مگر چونکہ روایت اس لفظ کے ساتھ وارد نہیں، نہ شارحین نے اس پر کلام کیا ہے اور نہ بطور نسخہ ہی کے اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں" اھ

زرقانی کا یہ کہنا کہ لفظ "لا" کا کوئی نسخہ نہیں بہت ہی عجیب ہے، کیوں کہ فتح الباری، قسطلانی اور سندھی کا یہی نسخہ ہے اور ان کا یہ کہنا کہ شارح نے تکلف کیا ہے یہ بھی عجیب ہے کیوں کہ یہی مطلب حافظؒ کے کلام میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور بے شک میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ کے ساتھ مخلوط قسم کے لوگ (اشوابا) ہیں یہاں بخاری کے تمام ہندی و مصری نیز شروح کے نسخے اثبات کے ساتھ ہیں، اور حاشیۂ لامع میں ہے کہ اس لفظ اشوابا میں شارحین کا اختلاف ہے، حافظؒ کہتے ہیں کہ شین واؤ سے پہلے ہے، اور اکثر نسخوں میں یہی ہے، اور صاحب مشارق نے صرف اسی کو ذکر کیا ہے اور ابوذر نے کشمیہنی سے "اوشابا" کا لفظ نقل کیا ہے۔ یعنی شین سے پہلے واؤ" اھ اور عینیؒ کہتے ہیں کہ خطابی نے کہا ہے کہ اشوابا سے مراد ملے جلے لوگ ہیں اور شوب کے معنی ملانا ہے، اور ایک روایت میں تقدیم واؤ کے ساتھ "اوشاب" کا لفظ ہے اور یہ بھی اسی کی مثل ہے اور جب مختلف قبائل کے متفرق لوگ جمع ہوں تو ان کو اوشاب اور اشابات کہا جاتا ہے۔ اور ابوذرؒ کی روایت میں اوباش کا لفظ ہے اس سے مراد گھٹیا قسم کے مخلوط لوگ۔ اھ اور حافظؒ کہتے ہیں کہ وہ اشواب سے اخص ہے"۔ حاشیہ لامع کی عبارت ختم ہوئی۔ اور آپؐ سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہوگی کہ ابوذر کی روایت کے نقل کرنے میں حافظؒ اور عینیؒ میں اختلاف ہوا ہے اور قسطلانیؒ نے ابوذر کی روایت نقل کرنے میں حافظؒ کی پیروی کی ہے، اس کے بعد کہا ہے کہ ایک روایت میں ہے "اوباش کا لفظ ہے جو اس لائق ہیں کہ آپؐ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں" اور ایک روایت میں ہے کہ "مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ قریش سے اگر آپؐ کا مقابلہ ہوا تو یہ لوگ آپؐ کو بے مدد چھوڑ دیں گے اور آپؐ کو پکڑ کر قید کر لیا جائے گا، اس سے زیادہ گرانی کی بات آپؐ کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟" عروہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ بات معروف تھی کہ جو لشکر مختلف قبائل سے ترتیب دیئے جائیں ان کے بھاگ جانے کا اندیشہ رہتا ہے

اس کے برعکس جو لشکر ایک ہی قبیلہ کا ہو وہ عادۃً بھاگنے سے عار کرتے ہیں اور عروہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مودتِ اسلام مودتِ قرابت سے عظیم تر ہے اور یہ بات اس وقت اس کے سامنے کھل کر آگئی جب مسلمانوں کو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں مبالغہ کرتے دیکھا جیسا کہ خود اس کا اپنا بیان آگے آتا ہے۔ اس پر حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اور ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے تھے، عروہ کی یہ بات سُنی تو غصہ سے فرمایا: تو لات کی شرم گاہ کو چوس[ل] بظر: بفتح بار اور سکون ظار معجمہ، اس قطعہ کو کہتے ہیں جو ختنہ کے بعد عورت کی شرمگاہ میں باقی رہ جاتا ہے، اور لات ان کے ایک بُت کا نام ہے جس کی پرستش قریش اور بنو ثقیف کرتے تھے، اہل عرب جب کسی کو ماں کی گالی دیتے تو کہا کرتے تھے "فلاں شخص اپنی ماں کی شرم گاہ کو چوسے" حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماں کی جگہ ان کے معبود کا ذکر کرکے اس گالی کو اور زیادہ سخت بنادیا اور یہ گالی اس برہمی کا اظہار تھی جو مسلمانوں کی طرف فرار کو منسوب کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس قسم کے گھناؤنے الفاظ کا استعمال جائز ہے جب کہ کسی ایسے شخص کو جو ایسے الفاظ کا مستحق ہے ڈانٹنا مقصود ہو پوری بحث حاشیہ لامع میں ہے اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی عروہ سے اس درشت گوئی میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی مناسب موقع پر مصلحت کی خاطر اعضائے مستورہ کا نام صراحۃً ذکر کرنے کی اجازت ہے، چنانچہ جو شخص دعوائے جاہلیت کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو بغیر کسی اشارے کنائے کے صاف صاف کہو کہ اپنے باپ کی پیشاب گاہ کو منہ سے کاٹ: پس ثابت ہوا کہ ہر بات موقع کے مناسب ہونی چاہیئے" کیا ہم آپؐ سے بھاگ جائیں گے اور آپؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے؟ استفہام انکاری ہے جس سے مقصود عروہ کو اس امر پر توبیخ کرنا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی طرف فرار کو کیوں منسوب کیا۔ عروہ نے کہا کہ یہ کون ہے؟ جس نے اتنی سخت گالی دے ڈالی۔ اس کو بتایا گیا کہ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ اے محمدؐ: یہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ ابو قحافہ کا بیٹا ہے۔ عروہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، اس لئے

ل امصص: بالف وصل وصادین مہملتین الاولی مفتوحۃ بصیغۃ الامر من مصص یمصص من باب علم یعلم وحکاہا ابن التین بضم الصاد الاولیٰ وخطاہا۔ کذا فی القسطلانی تبعا للحافظین، وقال اسنہ قانی لانہ خلاف الروایہ وان جاز لغۃ" اھ

یہ دریافت کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ ان کو پہچانتا ہو اور ان کا اس کے ذمہ احسان بھی ہو۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے یہ سوال تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں کیا ہو کہ گالی کی وجہ سے اسے حضرت ابوبکرؓ پر بہت غصہ آرہا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زرہ اور خود پہن کر بے پہچان ہو گئے ہوں، جیسا کہ آئندہ مغیرہ کے قصے میں آتا ہے، اور اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو اسلحہ ساتھ لے کر نہیں چلے تھے۔ کیوں کہ زرہ اور خود اسلحہ میں شمار نہیں ہوتی، اس نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم کھانا عربوں کی عادت تھی۔ اگر تیرا ایک احسان، جس کا میں بدلہ ادا نہیں کر سکا، مجھ پر نہ ہوتا تو میں تجھے اس کا جواب دیتا۔ ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے: لیکن یہ اس کے بدلہ میں ہے یعنی اس گالی کا جواب نہ دے کر اس نے اس احسان کا بدلہ ادا کر دیا، جو اس کے ذمہ تھا اور ایک روایت میں ہے کہ یہ مذکورہ بالا احسان یہ تھا کہ عروہ نے ایک دیت اٹھائی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے اس میں اس کی بہت اچھی مدد کی تھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ دوسرے لوگوں نے دو دو، تین تین اونٹوں سے مدد کی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے دس اونٹنیاں دی تھیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ عروہ دورانِ گفتگو بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک پکڑ لیتا تھا، یہ عرب کی عادت تھی کہ جب ایک آدمی دوسرے سے مخاطب ہوتا تو دورانِ گفتگو اس کی داڑھی پکڑ لیا کرتا تھا، خصوصاً جب کہ باہمی ملاطفت کا اظہار مقصود ہوتا، عام طور سے یہ معاملہ ایک شخص اپنے ہم مثل ہی سے کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عروہ کی تالیفِ قلب اور دل جوئی کے لئے اس سے مسامحہ فرما رہے تھے، اور حضرت مغیرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور جلالتِ قدر کے پیشِ نظر اس سے منع کرنے لگے۔ اور مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی مشہور صحابی ہیں، حدیبیہ سے قبل اسلام لائے اور صحیح قول کے مطابق ۵۰ھ میں انتقال ہوا یہ عروہ بن مسعود کے حقیقی بھتیجے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑے تھے، اس سے ثابت ہوا کہ دشمن کا خطرہ ہو تو پہرہ دینے یا دشمن کو مرعوب کرنے کی خاطر امیر کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہونا جائز ہے اور بیٹھنے والے کے سر پر کھڑے ہونے کی جو ممانعت آئی ہے، یہ اس کے معارض نہیں۔ کیوں کہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ یہ عظمت و کبر کی خاطر ہو، اور ابن قیمؒ نے اس قصے کے فوائد میں کہا ہے: "باوجود کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہیں تھی کہ کوئی آپؐ کے سر پر کھڑا ہو، مگر اس موقع پر حضرت مغیرہؓ کا تلوار لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑے ہونا اس میں یہ قابلِ اقتداء سنت ہے کہ دشمن کے قاصدوں کی آمد کے موقع پر امام کی عزت و فخر تعظیم و اطاعت اور اس کی حفاظت و دقایت کا مظاہرہ کیا جائے، اور یہی عادت جاریہ ہے، جب کہ

مسلمانوں کے قاصد کافروں کے پاس یا کافروں کے قاصد مسلمانوں کے پاس آئیں۔ اور یہ وہ قیام نہیں جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذموم قرار دیا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فخر و تکبر لڑائی کے میدان میں مذموم نہیں، جب کہ دوسری جگہ مذموم ہے۔ اور ان کے ہاتھ میں تلوار اور سر پر خود تھی مِغفَر بکسر میم وسکون غین معجمہ وفتح فاء۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مغیرہؓ نے جب عروہ کو آتے دیکھا تو اپنی زرہ پہن لی اور سر پر خود پہن لی، تاکہ عروہ ان کو نہ پہچان سکے۔ میں کہتا ہوں اس میں یہ اشکال ہے کہ یہ حضرات تو احرام میں تھے پھر حضرت مغیرہؓ نے خود کیسے پہن لی؟ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس سے تعرض کیا ہو، اس سے خلاصی یوں ممکن ہے کہ ان کا یہ فعل مجبوری کی بناء پر تھا، جیسا کہ سر میں جوئیں ہو جائیں تو حلق جائز ہے۔ پس جب بھی عروہ اپنا ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف بڑھاتا تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلال و تعظیم کے لئے اس کے ہاتھ پر تلوار کا نعل مارتے، تلوار کی نیام کے نیچے جو چاندی وغیرہ لگی ہوتی ہے اسے نعل کہتے ہیں۔ اور اس سے کہتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش سے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ، عروہ بن زبیر کی روایت میں یہ اضافہ ہے "کیوں کہ کوئی مشرک اس لائق نہیں کہ اس کو ہاتھ لگائے" پس عروہ نے سر اٹھایا اور کہا، یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا، مغیرہ بن شعبہ اور ایک اور روایت میں ہے کہ جب مغیرہ نے اس کے ہاتھ پر کئی بار تلوار ماری، تو غضبناک ہو کر بولا، کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ کون ہے؟ جو آپ کے صحابہؓ میں سے مجھے ایذاء دیتا ہے، بخدا میرے خیال میں تمہاری جماعت میں اس سے بدتر اور اس سے بڑھ کر کمینہ شخص کوئی اور نہ ہوگا۔" اور ایک روایت میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا تو عروہ نے آپ سے دریافت کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا، یہ تیرا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔" پس عروہ نے کہا او بے وفا غدار غُدَر، بر وزن عمر، غادر سے معدول ہے اور اُن کے وصف غدر میں مبالغہ مقصود ہے کیا میں تیری غداری میں کوشش نہیں کر رہا، یعنی مال نہیں خرچ کر رہا اور تیری خباثت کے شر کو دفع نہیں کر رہا ہوں؟ اور اس کا قصہ یہ ہوا تھا زمانۂ جاہلیت میں مغیرہ ایک قوم کے ساتھ رفیقِ سفر ہوئے تھے، اور اُن کو قتل کر کے اُن کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ "واقعہ یہ ہوا تھا کہ وہ بنو مالک کے تیرہ افراد کے ساتھ مقوقس شاہِ مصر کی ملاقات کے لئے گئے، بادشاہ نے اُن کو عطیات سے نوازا، مگر مغیرہؓ کو حصہ کم ملا۔ مغیرہؓ کو اس سے غیرت آئی، واپسی پر انہوں نے شراب پی، جب مدہوش ہو کر سو گئے تو مغیرہؓ نے سب کو قتل کر دیا۔" اھ الخمیس میں اس پر یہ اضافہ ہے "بنو مالک کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے مغیرہ کے قبیلہ سے لڑائی کی تیاری شروع کر دی، عروہ بن مسعود نے بیچ میں پڑ کر لڑائی کی آگ کو ٹھنڈا کیا، اور بنو مالک کو تیرہ مقتولوں کی دیت دینا منظور کی، انہوں نے اس پر صلح کر لی، عروہ کے اس قول میں اسی بات کی طرف

اشارہ ہے" اھ بعد ازاں مغیرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے،
پس حضرت ابوبکرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ بنو مالک کے جو لوگ تیرے ساتھ گئے تھے ان کا کیا ہوا؟ مغیرہؓ نے کہا
کہ میں نے اُن کو قتل کر دیا اور اُن سے چھینا ہوا مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا ہوں کہ آپؐ اس
(کے ذریعہ لوگوں سے) جس سلوک فرمائیں یا جو آپ کی رائے ہو اس کے موافق عمل کریں۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اسلام تو قبول کرتا ہوں، لیکن مال سے مجھے کوئی سروکار نہیں! یعنی اس سے کچھ تعرض نہیں کرتا کہ یہ بدعہدی کے ساتھ حاصل
کیا گیا ہے، اس لئے کہ امن کی حالت میں کافر کا مال غدر (بدعہدی اور دھوکہ) کے ساتھ لینا جائز نہیں، کیوں کہ رفقاء کی
ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت امانت پر مبنی ہوتی ہے، اور جن کی امانت ہو ان کو امانت کا ادا کرنا لازمی ہے، خواہ وہ
مسلمان ہوں یا کافر۔ ہاں کافروں کا مال جنگ اور غلبہ کے ذریعہ حلال ہے۔ غالباً یہ مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہؓ
ہی کے پاس رہنے دیا ہوگا تاکہ ممکن ہے اس کی قوم مسلمان ہو جائے تو ان کو واپس کر دیا جائے۔ زرقانی میں حافظؒ کے کلام
سے اخذ کرتے ہوئے اسی طرح لکھا ہے۔ اور حضرت شیخ قدس سرہ نے بذل میں حافظؒ کا کلام ذکر کرنے کے بعد فرمایا
ہے کہ "میں کہتا ہوں اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ حصولِ مال کا ذریعہ اگر حرام ہو تو وہ مال میں بھی مؤثر ہوگا، اس لئے یہ
مال حرام ہوگا، کیوں کہ کفار کے مال اصل میں تو مباح ہیں، ان کی کوئی حرمت نہیں، اس کے باوجود جب بذریعہ بدعہدی
حاصل کیا جائے تو حرام ہے، البتہ اگر جنگ میں غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا جائے، یا کافر کی رضامندی سے عقدِ فاسد
کے ذریعہ لیا جائے بشرطیکہ غدر نہ ہو تو جائز ہے"۔ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: "اس قصہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ،
جس مشرک سے معاہدہ ہو اس کا مال محفوظ و معصوم ہے اور یہ کہ کوئی شخص اس کا مالک نہیں ہو سکتا بلکہ اس مشرک کو واپس
کیا جائے گا، چنانچہ مغیرہؓ نے امان کی شرط پر ان سے رفاقت کی تھی، پھر ان سے بدعہدی کر کے ان کے مال لے لئے،
پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اموال سے تعرض نہیں فرمایا، نہ ان کی مدافعت کی، نہ ان کے ضامن ہوئے
کیوں کہ یہ قصہ مغیرہؓ کے اسلام لانے سے قبل کا تھا"۔ میں کہتا ہوں کہ اس پر ابوبصیر کے قصہ سے، جو آگے آتا ہے،
اشکال نہیں ہوتا کہ وہ بھی ان دو مشرکوں کے رفیق تھے جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس
بھیجا تھا اس لئے کہ وہ اپنی رضامندی سے اُن کے رفیق نہیں ہوئے تھے، بلکہ اُن کے ہاتھ میں قیدی تھے، اور حنفیہ کے
نزدیک قیدی کے لئے جائز ہے کہ وہ (کافروں کو) دھوکہ دے اور قتل کر دے۔

اور سیوطیؒ نے درّ منثور میں ذکر کیا ہے کہ "خطیب نے اپنی تاریخ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حق تعالیٰ کے
ارشاد و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا (یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی

صورت پیدا فرمادیں گے) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت عوف بن مالک اشجعیؓ کے حق میں نازل ہوئی، مشرکوں نے ان کو قید کرلیا اور باندھ کر بھوکا رکھا، انہوں نے اپنے والد کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ آگے حدیث طویل ہے اور اس کے آخر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بندش کھلنے کی صورت پیدا کردی۔ پس وہ اُن کی وادی سے گزرے جہاں ان کے مال مویشی اونٹ بکری چر رہے تھے۔ وہ ان تمام مویشیوں کو ہنکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے میری بندش کھول دی، بعدازاں میں نے ان کے مویشیوں کو خفیہ طور پر ہنکا لیا، اب یہ حلال ہیں یا حرام؟ فرمایا: نہیں بلکہ حلال ہیں، ہم جب چاہیں ان کا خمس وصول کریں گے۔" الخ۔

پھر یہاں ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ (کے حالات) بڑے غور سے دیکھتا رہا، اس کا بیان ہے کہ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلغم نہیں ڈالی مگر وہ صحابہؓ میں سے کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ میں گری اور اس نے بطور تبرک اس کو اپنے منہ اور جسم پر مل لیا اور ابن اسحٰق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی موئے مبارک نہیں گرا مگر صحابہؓ نے فوراً اسے لے لیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی حکم فرمایا تو آپؐ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر ایک نے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو قریب تھا کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء مبارک سے گرنے والے پانی کے لئے لڑ پڑیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کی اور ابوذر کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی بات کی تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آواز کو نہایت پست رکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی بنا پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے تھے یعنی مجال نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظریں جمائے رکھیں۔ حافظؒ کہتے ہیں، "اس میں بلغم اور جسم کے جدا ہونے والے بالوں کی طہارت پر، نیز صالحین کے پاک فضلات سے تبرک حاصل کرنے کا ثبوت ہے۔ غالباً حضرات صحابہؓ نے یہ سب کچھ عروہ کے سامنے کیا، اور اس میں خوب مبالغہ فرمایا، جس سے اِس طرف اشارہ مقصود تھا کہ اس کا ان کی نسبت فرار کا خیال فاسد ہے، گویا وہ بزبانِ حال کہہ رہے تھے کہ جو شخص اپنے امام سے ایسی محبت رکھتا ہو اور اس کی اس درجہ تعظیم کرتا ہو اس کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے امام کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا، اور اسے دشمن کے حوالے کردے گا اور یہ کہ صحابہ کرامؓ جس درجہ آپؐ پر جان نچھاور کرتے ہیں اور آپؐ کی اور آپؐ کے دین کی مدد کے لئے سرکف ہیں، اس کے مقابلہ میں ان قبائل کی کیا وقعت ہے جو محض خون

اور رشتہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی نگہداشت کیا کرتے ہیں" اھ "پس عروہ اپنے لوگوں کے یعنی اہلِ مکہ کے پاس گیا پس ان سے کہا: اے قوم اللہ کی قسم! میں بادشاہوں کے ہاں گیا ہوں اور قیصر، یہ شاہِ روم کا لقب ہے اور کسریٰ کاف کے فتح اور کسرہ کے ساتھ۔ شاہِ فارس کا لقب ہے اور نجاشی نون کا فتح اور کسرہ بھی جائز ہے اور جیم بغیر تشدید کے اور جیم پر تشدید پڑھنا غلط ہے۔ جیم کے بعد الف ہے پھر شین معجمہ، پھر یائے مشدّدہ اور مخففہ۔ یہ شاہِ حبشہ کا لقب ہے کے دربار میں بھی گیا ہوں۔ ان تینوں بادشاہوں کا ذکر عطفِ خاص علی العام ہے۔ یہ تینوں اس دور کے سب سے بڑے بادشاہ تھے اس لئے ان کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ اور شیخ لامع میں لکھتے ہیں: "ان تینوں کا خصوصی ذکر کیا یا تو ان کی عظمت کی وجہ سے، اور پہلے عام بادشاہوں کا ذکر تھا، یا بادشاہوں سے چھوٹے اور کسریٰ وغیرہ سے بڑے بادشاہ مراد ہیں"۔ اور لامع کے حاشیہ میں فتح سے نقل کیا ہے کہ "ابن ابی شیبہ میں علی بن زید کی مُرسل روایت میں ہے کہ عروہ نے کہا، اے قوم! میں نے بادشاہ دیکھے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی نظر سے نہیں گزرا، اور وہ بادشاہ نہیں مگر میں نے ہدی کے اونٹ بندھے دیکھے ہیں، اور میرے خیال میں تو تم پر کوئی بہت ہی آفت ٹوٹ کر رہے گی، یہ کہہ کر وہ اپنے رفقاء سمیت طائف کی طرف چلا گیا"۔ واللہ میں نے کبھی کوئی بادشاہ نہیں دیکھا کہ اس کے ہم نشین اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوں، جیسی تعظیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کرتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ کبھی تھوکتے ہیں تو وہ ان میں سے کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ پر گرتا ہے، اور وہ اپنے منہ اور ہاتھ اور بدن پر مل لیتا ہے۔ اور جب وہ انہیں کوئی حکم دیتے ہیں تو فوراً اس کی تعمیل کرتے ہیں، اور جب وہ وضو کرتے ہیں، تو ان کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں گویا آپس میں لڑ پڑیں گے، اور جب وہ بات کرتے ہیں اور ایک روایت میں کہ جب آپؐ کے صحابہؓ بات کرتے ہیں تو اپنی آواز نہایت پست رکھتے ہیں اور اس کی تعظیم کی بنا پر اس کی طرف نظر بھر کر دیکھتے تک نہیں اور اس نے تمہارے سامنے ایک بھلائی کی تجویز رکھی ہے اس کی تجویز قبول کر لو۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے: خدا کی قسم میں نے ایسی قوم دیکھی ہے جو کسی حالت میں بھی ان کو بے مدد نہیں چھوڑے گی۔ اب جو تمہاری رائے ہو اس پر عمل کرو۔ اس پر بنو کنانہ کے ایک شخص نے کہا: زرقانیؒ کہتے ہیں کہ یہ حُلَیس تھا: حاء اور سین مہملہ کے ساتھ، بصیغہ تصغیر، اور ابن اسحاق اور زبیر بن بکار نے اس کے باپ کا نام علقمہ ذکر کیا ہے۔ حُلَیس اُس دن "احابیش" کا سردار تھا۔ برہان نے کہا کہ مجھے اس کا اسلام لانا معلوم نہیں، بظاہر کفر پر مرا ہے"۔ اھ احابیش کے معنے پہلے گذر چکے ہیں۔ حافظؒ کہتے ہیں: اور زبیر بن بکار کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتا ہے کہ لخم، جذام، کندہ اور حمیر کے قبیلے تو حج کریں، اور عبدالمطلب کے خاندان کو اجازت نہ ہو"۔ آھ اور صاحب خمیس نے حُلَیس کو بنو کنانہ کے ایک شخص سے الگ ذکر کیا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے: "پس بنو کنانہ کے ایک

شخص نے کہا مجھے اجازت دو تو میں ان کے پاس جاتا ہوں، پس انہوں نے کہا جاؤ؛ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا "یہ فلاں شخص ہے اور یہ لوگ ہدی کے جانوروں کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ جانور اس کے سامنے کھڑے کر دو" چنانچہ ہدی کے جانور کھڑے کر دیئے گئے، اور لوگوں نے تلبیہ کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا، جب اس نے یہ منظر دیکھا تو بولا سبحان اللہ ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا ہرگز مناسب نہیں، اس کے بعد قریش نے حُلیس کو بھیجا، اور ایک روایت میں ہے کہ اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، اور کہنے لگا ربِّ کعبہ کی قسم قریش ہلاک ہو گئے، یہ لوگ تو صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ اور جب قریش کے پاس واپس گیا تو اُن سے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ہدی کے اونٹوں کو قلادے پہنائے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے، اس لئے میری یہ رائے ہرگز نہیں کہ ان کو بیت اللہ سے روکا جائے، پھر قریش نے حُلیس بن علقمہ کو بھیجا؛ معالم التنزیل میں اسی طرح ہے اور روضۃ الاحباب میں حلیس اور بنو کنانہ کے آدمی کو ایک ہی قرار دیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے کہ بنو کنانہ کے ایک آدمی نے جو حلیس کہلاتا تھا کہا، اور ایک روایت میں ہے کہ علقمہ نے کہا: "مجھے اجازت دو، میں آپؐ کے پاس جاتا ہوں، قریش نے کہا: تم جا سکتے ہو۔

کنانی کی آمد: پس جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فلاں شخص ہے اور یہ اس قوم کا فرد ہے جو ہدی کے اونٹوں کی بہت عزت کرتے ہیں؛ بُدن بَدَنہ کی جمع ہے، اونٹ کو کہتے ہیں خواہ نر ہو یا مادہ۔ اور اس میں تا، تانیث کی نہیں، وحدت کی ہے؛ اس لئے تمام اونٹوں کو یک بارگی اٹھا کر اس کے سامنے کھڑا کرو۔ چنانچہ اونٹ کھڑے کر دیئے گئے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر عبرت پکڑے اور اسے ثابت ہو جائے کہ یہ لوگ لڑائی کے لئے نہیں آئے۔ اور مکہ جا کر عمرہ ادا کرنے میں ان کی مدد کرے۔ حافظؒ کہتے ہیں، اور ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب اس نے ہدی کے اونٹوں کو قلادہ پہنے ہوئے، وادی کے کنارے سے اپنی طرف سیلاب کے پانی کی طرح بہتے ہوئے دیکھا، جن کو اپنے مَحِل سے روکا گیا تھا، تو وہیں سے لوٹ گیا؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی نہیں پہنچا۔ لیکن مغازیؒ عروہ میں روایت ہے جو حاکم سے مروی ہے کہ حُلیس نے چیخ کر کہا: ربِّ کعبہ کی قسم! قریش ہلاک ہو گئے۔ یہ لوگ صرف عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں ہاں، اے بنو کنانہ کے بھائی (یعنی اس قوم کے فرد) ان کو یہ بات بتا دیجیو! پس ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے اس کو مخاطب فرمایا ہو۔ اور لوگوں نے یعنی صحابہؓ نے اس کا تلبیہ کہتے ہوئے استقبال کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی دینی مصلحت کے لئے ریا جائز ہے جیسا کہ علماء نے مصالحِ دینیہ کیلئے اظہارِ صدقہ کو مستحب کہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور حافظ عینیؒ

کہتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ لڑائی میں خداع سے کام لینا اور ایک چیز کا ارادہ ظاہر کرنا جب کہ مقصود اس کے خلاف کچھ اور ہو، جائز ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "قریش کے اس قاصد کے سامنے اونٹوں کے کھڑا کرنے میں اس امر کی دلیل ہے کہ کفار کے قاصدوں کے سامنے شرائع اسلام کا اظہار مستحب ہے"، پس جب اس کنانی نے یہ منظر دیکھا تو از راہِ تعجب بولا: سبحان اللہ! ان لوگوں کو بیت اللہ سے روکنا ہرگز مناسب نہیں، حافظؒ کہتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے کافر بھی حرم اور احرام کی حرمت کی تعظیم بجا لاتے تھے اور جو شخص اس سے روکتا اس پر نکیر کرتے تھے اور یہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے باقی ماندہ آثار تھے۔" اھ پس جب وہ اپنے ساتھیوں یعنی اہل مکہ کی طرف لوٹ کر گیا تو کہا میں نے دیکھا کہ ہدی کے اونٹوں کے قلادے پہنائے ہوئے ہیں اور ان کا اشعار کیا ہوا ہے۔ پس میں یہ رائے نہیں دوں گا کہ انہیں بیت اللہ سے روکا جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ ہے کہ: "وہ بولے: بیٹھ جا، تو تو نرا گنوار ہے تو کیا جانے"؟ اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ اس پر حُلیس غصہ سے بھڑک اٹھا اور بولا ہم ـــــ اے جماعت قریش! بخدا! ہم نے تم لوگوں سے اس مقصد کے لئے دوستی نہیں کی، نہ معاہدہ کیا کہ جو شخص بیت اللہ کی تعظیم کے لئے آیا کرے، اُسے روک دیا جائے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں حُلیس کی جان ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس مقصد کے لئے آئے ہیں انہیں اس بات کی اجازت دینا ہوگی۔ ورنہ میں سارے احابیش کو ایک آدمی کی طرح یہاں سے ہٹا لے جاؤں گا۔ اب قریش (کھسیانے ہوکر) بولے حُلیس، ذرا ٹھہرو! یہاں تک کہ ہم ـــــ اپنی ذات کے لئے کوئی پسندیدہ صورت اختیار کرلیں۔" اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ "ابن اسحاق نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خراش ابن امیہ الخزاعی کو بلایا اور ـــــ انہیں ثعلب نامی ایک اونٹ پر سوار کرکے قریش کے پاس بھیجا" تاکہ وہ اشرافِ قریش کو اطلاع کردے کہ آپؐ کس مقصد کے لئے آئے ہیں؟ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کو زخمی کردیا، اور خراش کو بھی قتل کرنا چاہا، مگر احابیش ان کے آڑے آئے تو قریش نے اس کا راستہ چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔" اور زرقانی کے لفظ یہ ہیں کہ، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں فروکش ہوئے تو آپؐ کو مناسب معلوم ہوا کہ قریش کے پاس ایک قاصد بھیجا جائے، جو اُن کو اطلاع دے کہ آپؐ عمرہ کے لئے تشریف لائے ہیں، چنانچہ خراش بن امیہ خزاعی کو اپنے اونٹ پر بھیجا، پس عکرمہ بن ابی جہل نے اونٹ زخمی کردیا، اور قریش نے خراش کو قتل کرنا چاہا لیکن احابیش نے اس کی حفاظت کی، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آگئے الخ" پورا واقعہ آگے آتا ہے اور خمیس میں ہے کہ "قریش نے چالیس پچاس آدمی بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا چکر لگائیں تاکہ آنحضرتؐ کے کسی صحابیؓ کو پکڑ کر لاسکیں، صحابہ کرامؓ نے ان سب کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کردیا۔ اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔" یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ صاحب خمیس نے ان صاحب کا نام جن کو قریش کے پاس بھیجا گیا تھا "جواس" ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ ناقل کی تصحیف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیوطی نے دُرِّ منثور میں حق تعالیٰ کے ارشاد ہو الذی کف ایدیھم عنکم الآیہ کے ذیل میں متعدد روایات ان لوگوں کے بارے میں ذکر کی ہیں جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ میں گرفتار کیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اور ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، من جملہ ان کے ایک حدیث مسلم، ابی داؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں "حدیبیہ کے دن اہل مکہ کے اسّی آدمی مسلح ہو کر جبل تنعیم کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف اُترے۔ اُن کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اچانک حملہ کرنا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے پکڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ پکڑے گئے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معاف کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی"، بعدازاں صاحب خمیس کہتے ہیں کہ "جب جواس واپس آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب کو بلایا تاکہ انہیں مکہ بھیجا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قریش سے جان کا خطرہ ہے اور مکہ میں بنو عدی بن کعب کا ایک فرد بھی ایسا نہیں جو میری حفاظت کر سکے، اور قریش کو معلوم ہے کہ مجھے اُن سے کتنی عداوت ہے اور یہ کہ میں ان کے حق میں کتنا سخت ہوں، مگر آپ کو میں ایک ایسا شخص بتاتا ہوں جو مکہ میں مجھ سے زیادہ معزز ہے اور وہ عثمان بن عفان ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مکہ جانا : چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں ابوسفیان اور اشرافِ قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ جنگ کے لئے نہیں آئے بلکہ محض بیت اللہ کی زیارت اور اُس کی حرمت و تعظیم کے لئے آئے ہیں اور زاد الہدیٰ میں یہ اضافہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: انہیں بتاؤ کہ ہم جنگ کے لئے نہیں بلکہ عمرہ کے لئے آئے ہیں، اور ان کو اسلام کی دعوت دو اور آپ نے اُن سے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں جو مومن مرد اور عورتیں ہیں اُن کے پاس جائیں اور انہیں فتح کی خوش خبری دیں اور انہیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ مکہ میں اپنے دین کو غالب کر دے گا۔ یہاں تک کہ وہاں کسی کو اخفائے ایمان کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ مکہ گئے راستہ میں مقامِ بلدح پر قریش کی ایک جماعت پر ان کا گزر ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ تمہیں اللہ کی طرف اور اسلام کی طرف دعوت دوں اور تمہیں آگاہ کر دوں کہ ہم لڑائی کے لئے نہیں بلکہ صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ بولے: ہم نے تیری بات سُن لی، پس تم اپنے کام کے لئے جاؤ اور وہاں ابان بن سعید نے ان کا اٹھ کر استقبال کیا، ان کو خوش آمدید کہی اور اپنے گھوڑے پر زین رکھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ اھ۔

اور الخمیس میں ہے کہ "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ کی طرف نکلے۔ جب یہ مکہ میں داخل ہوئے یا داخل ہونے سے پہلے ہی ان کو ابان بن سعید ملا۔ اس نے آپ رضی کو اپنے آگے سوار کیا، اور ان کو پناہ دی تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں"۔ اور ابن اسحاق کے علاوہ دوسروں کی روایت میں ہے کہ "ابان نے ان سے یہ بھی کہا کہ بلا خوف وخطر چلو پھرو۔ اور کسی کا خوف مت رکھو۔ بنو سعید حرم میں سب سے معزز ہیں اور حضرت عثمان رضی گئے یہاں تک کہ مکہ میں داخل ہوئے ابوسفیان اور دیگر اشراف قریش سے ملاقات کی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ پس انہوں نے آپ سے عقد ومعاہدہ کیا اور جب آپ رضی اپنے کام سے فارغ ہوئے اور واپسی کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر سکتے ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہیں کر لیتے میں کبھی طواف نہیں کر سکتا۔ اس سے قریش بھڑک گئے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس روک لیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آمد میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں نے کہا کہ عثمان رضی خوش قسمت ہیں وہ مکہ چلے گئے اور آپ تنہا طواف کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں، وہ تنہا طواف نہیں کر سکتے"۔ اور الہدی میں ہے "کہ جب بیعت پوری ہو چکی تو حضرت عثمان واپس لوٹے، مسلمانوں نے ان سے کہا اے ابو عبداللہ آپ نے تو بیت اللہ کے طواف سے خوب جی ٹھنڈا کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ آپ حضرات نے میرے حق میں بہت ہی بُرا گمان کیا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں وہاں سال بھر ٹھہرا رہتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں فروکش ہوتے تب بھی جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کر لیتے میں کبھی طواف نہ کرتا اور مجھے تو قریش نے بیت اللہ کے طواف کی دعوت دی تھی مگر میں نے صاف انکار کر دیا" یہ سن کر مسلمانوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری نسبت اللہ تعالیٰ کو زیادہ جانتے ہیں اور ہم سے زیادہ خوش گمان ہیں"۔

بیعتِ رضوان : اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روک لئے گئے تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ حضرت عثمان رضی قتل کر دیئے گئے، کہا جاتا ہے کہ شیطان نے مسلمانوں کے لشکر میں بلند آواز سے اعلان کیا کہ اہل مکہ نے عثمان رضی کو قتل کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب ہم ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بیعت کے لئے بلایا، پس ان سے بیعت لی کہ وہ قریش سے قتال کریں گے اور ان کے مقابلے میں میدان سے نہیں ہٹیں گے"۔ اھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیکر یا بیری کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔

زرقانی کی عبارت جو ابھی اوپر گزر چکی ہے اس کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلایا، انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ اہل مکہ سے ان کی جان محفوظ نہیں اور آپ سے حضرت عثمان رضؓ کا ذکر کیا کہ وہ وہاں معزز ہیں، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور انہیں ایک گرامی نامہ دیا، اور انہیں حکم فرمایا کہ مکہ کے کمزور مرد وعورتوں کو خوشخبری دیں کہ عنقریب اسلام کی فتح ہوا چاہتی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو سربلند فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عازم مکہ ہوئے۔ بلدح نامی جگہ میں قریش سے ملاقات ہوئی۔ ان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ مکہ نہیں جائیں گے مگر ابان بن سعید نے ان کو پناہ دی اور اپنے گھوڑے پر سوار کیا، چنانچہ یہ مکہ گئے، ابوسفیان اور رؤساء قریش سے ملے اور ایک ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ پڑھ کر سنایا، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا بلکہ یہی اصرار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال مکہ نہیں آسکتے اور حضرت عثمانؓ کو طواف کی پیش کش کی" اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے طواف سے انکار کا واقعہ مفصل ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں" اور جب صلح نامہ کی تحریر مکمل ہوئی اور لوگ اس کے نفاذ کے منتظر تھے، اچانک ایک فریق کے کسی آدمی نے دوسرے فریق کے آدمی پر تیر پھینک دیا، اس کے نتیجہ میں تیروں اور پتھروں سے مقابلہ شروع ہوگیا، ہر فریق کے پاس دوسرے فریق کے لوگ تھے، ان کو روک لیا گیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن عمرو وغیرہ کو اور مشرکین نے حضرت عثمان کو روک لیا۔ —— پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی کہ عثمانؓ قتل کر دیئے گئے تو آپ نے لوگوں کو بیعتِ رضوان کے لئے بلایا"

اور خمیس میں ہے کہ سب سے پہلے بیعتِ رضوان بنو اسد کے ایک شخص ابوسنان بن وہب نے کی۔ اور جتنے مسلمان یہاں تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے بیعت نہ کی ہو۔ البتہ جد بن قیس انصاری جو بنو سلمہ کا ایک فرد تھا، اپنے اونٹ کے نیچے چھپ گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" وہ منظر گویا اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہ لوگوں سے چھپ کر اپنی ناقہ کی بغل سے چمٹا ہوا ہے" اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام میں گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا: یہ عثمانؓ کی جانب سے بیعت ہے۔ اور حضرت عثمانؓ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے بدرجہا بہتر تھا" اور الہدیٰ میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع نے تین بار بیعت کی، لوگوں سے اول بھی، درمیان میں بھی اور آخر میں بھی" اھ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ بیعت کی ایک مرتبہ اپنے والد

ماجدسے پہلے اور ایک مرتبہ اُن کے بعد، جیسا کہ امام بخاریؒ نے غزوۂ حدیبیہ میں متعدد طرق سے روایت کیا ہے اور حاشیہ لامع میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ اس بیعت کا نام بیعت رضوان اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی وجہ سے ہوا، لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ (راضی ہوا اللہ تعالیٰ مومنوں سے جب بیعت کر رہے تھے آپؐ سے اس درخت کے نیچے) یہ درخت کیکر یا ببول کا تھا اور صحابہؓ نے موت پر بیعت کی تھی، جیسا کہ شیخین وغیرہ کی روایت میں ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ میدان سے نہ بھاگنے کی بیعت کی تھی اور ان دونوں میں کچھ تعارض نہیں جیسا کہ معروف ہے اور یہ سب روایات امام بخاریؒ نے غزوۂ حدیبیہ میں ذکر کی ہیں۔

مکرز کی آمد: پس ان میں ایک شخص جو مکرز کہلاتا تھا، کھڑا ہوا (مکرز بکسر میم وسکون کاف وفتح راء اس کے بعد زا) ابن حفص اور ابن اسحٰق نے اسکے دادے کا نام بھی ذکر کیا یعنی مکرز بن حفص بن اخیف (ہمزۂ خاء معجمہ یا تحتانیہ اور فا کے ساتھ) یہ بنو عامر بن لوی کا ایک فرد تھا، زرقانی کہتے ہیں کہ الاصابہ میں ہے کہ "میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کو صحابہؓ میں ذکر کیا ہو، البتہ ابن حبان نے یوں کہا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اس کو شرف صحابیت حاصل تھے" پس اس نے کہا مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دو، جب یہ مسلمانوں کے قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مکرز ہے اور یہ فاجر آدمی ہے اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے فاجر کی جگہ غادر (بدعہد) کا لفظ ہے، حافظؒ کہتے ہیں کہ "یہی زیادہ راجح ہے اور مجھے ہمیشہ تعجب رہا ہے کہ اس کو فاجر کیوں فرمایا جب کہ اس سے بظاہر کوئی فجور سرزد نہیں ہوا، بلکہ اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اس کے خلاف کی طرف مشعر ہیں، جیسا کہ ابوجندل کے قصہ میں اس کا کلام آگے آتا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے مغازی واقدی میں غزوۂ بدر کے بیان میں دیکھا کہ عتبہ بن ربیعہ نے قریش سے کہا کہ تم مکہ چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو جب کہ بنوکنانہ ہمارے پیچھے ہیں اور ہمیں ان کی جانب سے اپنے اہل وعیال کے حق میں خطرہ ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی حفص ابن اخیف یعنی مکرز کے باپ کا ایک بہت ہی خوبصورت لڑکا تھا اس کو بنوبکر کے کسی شخص نے اپنے خون کے بدلہ میں جو قریش کے ذمہ تھا، قتل کر دیا، پس قریش نے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور صلح ہوگئی، بعدازاں مکرز نے بنوبکر کے سردار عامر بن یزید پر اچانک حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا، اس سے بنوکنانہ بھڑک گئے اور اسی اثناء میں واقعہ بدر پیش آیا اور مکرز بدعہدی میں بدنام تھا، اور واقدی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا اور پچاس آدمی ساتھ لے کر نکلا، مگر محمد بن مسلمہؓ نے جو پہرے پر تھے ان کو پکڑ لیا اور مکرز ان سے چھوٹ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی طرف واقعہ کے مشیر ہے۔" اھ پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرنے لگا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی وہی جواب دیا جو بدیل کو دے چکے تھے۔

سُہیل کی آمد : اس کی گفتگو کے دوران اچانک سہیل بن عمرو القرشی العامری آگیا۔ ان کا لقب خطیب قریش ہے، رہائش پہلے مکہ میں تھی پھر مدینہ میں ہوئی۔ فتح مکہ کے سال اسلام لائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا اسلام بہت ہی محمود تھا اور ابن شاہین نے روایت کیا ہے کہ سُہیل کہتے ہیں، اللہ کی قسم میں نے مشرکین کی ہمراہی میں شجاعت اور بہادری کے جتنے معرکے انجام دیئے اب مسلمانوں کی ہمراہی میں ایک ایک کا قرض ادا کروں گا۔ اور مشرکین کی معیت میں میں نے جتنا مال خرچ کیا اسی قدر مسلمانوں پر بھی خرچ کروں گا۔ اکثر علماء کے نزدیک ۱۸ھ کی طاعون عمواس میں ملک شام میں اُن کا انتقال ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ " قریش نے سہیل کو بلایا اور کہا کہ ان صاحب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ اور ان سے صلح کر لو" پس جب سہیل آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے" فرمایا تمہارے لئے تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا ہے۔ شیخ لامع میں فرماتے ہیں " تمہارا کچھ کام سہل ہو گیا" کیونکہ آپؐ نے اس کے دوبارہ آنے سے اندازہ کر لیا تھا کہ قریش صلح کی جانب مائل ہیں، اور یہ نیک فال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام سے اخذ کی تھی" اور اس کے حاشیہ میں قسطلانی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیک فالی کو پسند فرماتے تھے۔ اور " مِنْ " تبعیضیہ کے ساتھ " مِنْ امرکم " (تمہارا کچھ کام) فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس قصہ میں حاصل ہونے والی سہولت کچھ زیادہ عظیم نہیں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ غالباً یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُہَیل کی تصغیر سے اخذ کیا۔ کیوں کہ اس کی تصغیر کا تقاضہ یہ تھا کہ یہ سہولت زیادہ نہ ہو" اھ زرقانی کہتے ہیں " کہ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو گھٹنے ٹیک کر دو زانو ہو بیٹھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار زانو تشریف فرما تھے اور عباد بن بشر اور سلمہ بن اسلم آہنی لباس میں سر سے پاؤں تک غرق آپؐ کے سر پر کھڑے تھے۔ اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد حلقہ کئے بیٹھے تھے۔ اور دونوں کے درمیان بات چلی۔ اور سہیل نے دیر تک بات کی اور سوال و جواب ہوتا رہا۔ اور خمیس میں ہے کہ، جب سہیل آپ کے پاس پہنچا تو بولا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش آپ سے صلح کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو عمرہ آئندہ سال کرنا ہوگا" اھ اور حضرت عبادؓ نے اس سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

اپنی آواز پست رکھ" بالآخر دونوں کے درمیان اس شرط پر صلح طے ہوئی کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔ جیسا کہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے اور اسی پر ابن سعد نے جزم کیا ہے، اور ابوداؤد نے حضرت ابن عمرؓ سے اور حاکم نے حضرت علیؓ سے اس کو روایت کیا ہے اور یہی قابلِ اعتماد ہے۔ اس کے برعکس مغازی ابن عائذ میں ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے کہ دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ ابن عقبہ کی روایت بھی یہی ہے۔ حافظؒ کہتے ہیں: "دونوں کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ دس سال تو اصل مدت تھی جو صلح میں طے ہوئی تھی، مگر دو سال کی مدت میں صلح کا قصہ تمام ہوا۔ کیوں کہ قریش نے اس کی خلاف ورزی کی، جیسا کہ غزوۂ فتح میں آتا ہے۔" یہ تطبیق زیلعی اور ابن ہمام نے بیہقی سے نقل کی ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ: "بہت اچھی توجیہ ہے۔ جس سے تعارض اٹھ جاتا ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔" اور حافظؒ کہتے ہیں کہ کامل ابن عدی، مستدرک حاکم اور معجم اوسط طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مدت صلح چار سال تھی، یہ اول تو ضعیف ہے پھر صحیح روایت کے خلاف ہونے کی وجہ سے منکر بھی ہے۔ زرقانی میں حافظؒ کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح ہے۔

غزوۂ فتح کا سبب : میں کہتا ہوں کہ حافظؒ کے قول "جیسا کہ غزوۂ فتح میں آتا ہے۔" کا حاصل یہ ہے کہ غزوۂ فتح قریش کے نقضِ عہد کی وجہ سے ہوا تھا جیسا کہ کتب سیر میں مفصل مذکور ہے اور اس کا خلاصہ وہ ہے، جو مجمع البحار میں مذکور ہے کہ غزوۂ فتح کا سبب یہ ہوا تھا کہ بنو خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ اُن کے مقابلہ میں قریش نے بنو نفاثہ کے رؤساء کی مدد کی، اور بنو نفاثہ نے بنو خزاعہ پر شب خون مارا، بنو خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو کعب کی مدد نہ کروں تو کس کی کروں گا؟ اور یہ شعبان کا قصہ ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ تیاری کی، اور رمضان ۸ھ میں غزوۂ فتح کے لئے نکلے۔ الخ، اھ مختصراً۔ اور خمیس میں ہے کہ قریش میں سے صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو، حویطب اور مکرز نے اپنے غلاموں سمیت، ہیئت بدل کر خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی اس رات کو مدد کی، اور رات کو جب کہ وہ غفلت میں پڑے سو رہے تھے ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کے بیس افراد کو قتل کر دیا، بعد میں قریش کو اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی اور انہیں محسوس ہوا کہ جو صلح ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان طے ہوئی تھی اس کو توڑ ڈالا ہے۔ ادھر عمرو بن سالم خزاعی چالیس سواروں کی معیت میں، طلبِ مدد کے لئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت پر مدینہ حاضر ہوا، یہ تھا وہ واقعہ جو

فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔"

کتنی مدت کے لئے کافروں سے صلح کرنا جائز ہے : حافظؒ کہتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مشرکین سے کتنی مدت تک کے لئے صلح کا معاہدہ صحیح ہے؟ چنانچہ بعض فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق دس سال سے زائد کی صلح نہ ہونی چاہیئے: یہ امام شافعیؒ کا قول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ بھی صحیح ہے بعض نے زیادہ سے زیادہ چار سال، بعض نے تین سال، اور بعض نے دو سال مدتِ صلح تجویز کی ہے، مگر پہلا قول راجح ہے" اھ اور نوویؒ کہتے ہیں "کفار سے صلح کرنا جب کہ مسلمانوں کی مصلحت اس کی مقتضی ہو بوقت ضرورت بالاتفاق جائز ہے اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ صلح دس سال سے زیادہ کی نہ ہو بشرطیکہ امام کو اس میں غلبہ نہ ہو اور اگر امام کو غلبہ ہو تو چار مہینے سے زیادہ کی صلح نہ کرے۔ اور ایک قول میں ایک سال سے کم جائز ہے، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی حد متعین نہیں؛ بلکہ امام کی رائے کے موافق قلیل و کثیر مدت کے لئے صلح جائز ہے" اھ

اور اُبیؒ نے بھی امام مالکؒ کا مسلک اسی طرح نقل کیا ہے اور ابن قیمؒ الہدیٰ میں کہتے ہیں "اس قصہ میں یعنی صلح خیبر کے قصے میں اس امر کی دلیل ہے کہ صلح کا معاہدہ مطلقاً صحیح ہے اور اس کے لئے کوئی مدتِ مخصوص متعین نہیں ہے۔ بلکہ جتنی مدت کے لئے امام چاہے صلح کر سکتا ہے۔ اس قصہ کے بعد کوئی حکم ایسا نہیں آیا جو اس حکم کے لئے ناسخ ہو اس لئے صحیح یہ ہے کہ صلح جائز اور صحیح ہے اور مزنی کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ نے نیز دوسرے ائمہ نے اس کی تصریح کی ہے"۔ اور موفق کہتے ہیں "بغیر تعیین مدت کے صلح جائز نہیں کہ اس کا نتیجہ مطلقاً ترکِ جہاد ہوگا" ایک اور جگہ کہتے ہیں "عقد صلح صرف معلوم اور معین مدت تک کے لئے صحیح ہے بوجہ اس دلیل کے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ اور قاضی کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس سال سے زیادہ کی صلح جائز نہیں۔ یہی ابوبکر کا مختار اور یہی شافعیؒ کا مذہب ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد: "اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم" عام ہے۔ جس سے دس سال کی مدت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قریش سے دس سالہ مصالحت کی بنا پر مخصوص ہے۔ اس سے زائد اپنے مقتضائے عموم پر رہے گا۔ اور ابو الخطاب کہتے ہیں کہ امام احمدؒ کے کلام کا ظاہر یہ ہے کہ امام کی صوابدید کے مطابق دس سال سے زیادہ کی صلح بھی جائز ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا یہی قول ہے۔ کیوں کہ عقد اجارہ کی طرح جب یہ عقد دس سال کے لئے جائز ہے تو اس سے زیادہ کے لئے بھی جائز ہی ہوگا۔ اور عام سے وہ سالہ مدت کی تخصیص ایک علت پر مبنی ہے جو دس سال

سے زیادہ میں بھی پائی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مصلحت کبھی زیادہ مدت کے لئے صلح کو مقتضی ہوا کرتی ہے۔" اھ

اور ہدایہ میں ہے! "جب امام کی رائے ہو کہ اہل عرب سے یا ان کے کسی فریق سے صلح کرلے اور اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو اس کا مضائقہ نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ" (وہ اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کی طرف مائل ہوجائیے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے مصالحت کی تھی کہ ان کے اور آپ کے درمیان دس سال تک جنگ موقوف رہے گی۔ اور اس لئے کہ مصالحت بھی معنیً جہاد کے حکم میں ہے۔ جب کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو۔ کیونکہ مقصود، کہ وہ دفع شر ہے، اس سے بھی حاصل ہوجاتا ہے اور حکم صلح صرف اسی مدت تک محدود نہیں جو روایات میں وارد ہے۔ کیوں کہ علت اس سے زائد کی طرف بھی متعدی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں بہتر نہ ہو (تو جائز نہیں) کیوں کہ یہ صورۃً اور معناً ترکِ جہاد ہے۔" اھ۔

صلح نامہ کی تحریر کا آغاز: پس سہیل نے کہا لائیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور ہمارے درمیان تحریر لکھ دوں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کو بلایا۔ یہ حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تھے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے کتاب الصلح میں برآء بن عازب رضی اللہ عنہ سے، اسی طرح عمر بن شبہ نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے برعکس عمر بن شبہ نے ایک روایت سہیل بن عمرو سے روایت کی ہے کہ وہ تحریر ہمارے پاس موجود ہے جس کو محمد بن مسلمہ نے تحریر کیا تھا۔" (اس روایت سے مفہوم ہوتا ہے کہ صلح نامہ حضرت علیؓ نے نہیں بلکہ محمد بن مسلمہ نے لکھا تھا۔) ان دونوں میں تطبیق یوں ہوگی کہ اصل صلح نامہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اور اس کی ایک نقل محمد بن مسلمہ نے سہیل کے لئے لی تھی، اور عمر بن شبہ کی ایک روایت میں کاتب کا نام ہشام بن عکرمہ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہم اور صریح غلط ہے۔ کیوں کہ جو صحیفہ ہشام نے لکھا تھا، یہ وہ تحریر تھی جو قریش نے متفقہ طور پر بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کرتے وقت لکھی تھی۔ میں نے اس پر تنبیہ کی ضرورت اس بنا پر محسوس کی تاکہ بعض ناواقفوں کو یہ دھوکا نہ ہوجائے کہ قصۂ حدیبیہ کے کاتب میں اختلاف ہے۔" یہ بات حافظؒ نے لکھی ہے۔ زرقانی میں اسی طرح ہے

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، پس سہیل نے اور اس کے رفقاء نے

جیسا کہ خمیس میں ہے کہا بخدا! میں نہیں جانتا کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا، میں صاحب یمامہ کے سوا کسی رحمٰن کو نہیں جانتا کہ رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ لیکن باسمک اللّٰھم لکھیے جیسا کہ آپؐ ابتدا اسلام میں لکھا کرتے تھے۔ جاہلیت میں اس کے لکھنے کا دستور تھا (اور آیت نمل کے نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی غالباً یہی معمول تھا) مگر جب آیتِ نمل نازل ہوئی تو آپؐ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے لگے۔ اس لیے ان لوگوں پر جاہلی نخوت سوار ہوئی۔ اور ———————————— حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سہیل نے کہا، ہم نہیں جانتے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیا چیز ہے، لیکن آپؐ وہ لفظ لکھیے جس کو ہم جانتے پہچانتے ہیں یعنی باسمک اللّٰھم۔ اور حاکم کے الفاظ بروایت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ یہ ہیں ''پس سہیل نے اس کا (کاتب کا) ہاتھ پکڑ لیا اور کہا باسمک اللّٰھم لکھیے جس کو ہم جانتے ہیں۔ مسلمانوں نے کہا! اللہ کی قسم! ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی لکھیں گے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! باسمک اللّٰھم ہی لکھو۔ چنانچہ یہی لکھا گیا جیسا کہ حاکم کی روایت ہے۔ بظاہر ان حضرات نے اپنی قسم کا کفارہ ادا نہیں کیا، کیوں کہ ان کی نیت یہ تھی کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی حکم نہیں ہوتا ہم یہی لکھیں گے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: لکھو! یہ وہ تحریر ہے۔ اشارہ ذہن میں مستحضر مضمون کی طرف ہے جس پر مصالحت کی "قاضی"؛ فاعل کے وزن پر۔ قضیت الشیٔ کے معنی ہیں کسی چیز کا فیصلہ کرنا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مستدرک حاکم میں عبداللہ بن مغفل کی روایت ہے، ''پس کاتب نے لکھا کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل مکہ سے مصالحت ہوئی'' اس روایت سے معلوم ہوا کہ فیصلہ سے مراد مصالحت ہے اور امام بخاریؒ نے اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، کیف یکتب ھٰذا ما صالح فلان بن فلان وان لم ینسبہ الی قبیلتہ او نسبہ'' یعنی اس امر کا بیان کہ کیسے لکھا جائے کہ یہ وہ چیز ہے جس پر مصالحت کی فلاں بن فلاں نے'' اگرچہ اس کو اس کے قبیلہ کی طرف منسوب کرے نہ اس کا نسب ذکر کرے''۔ حضرت شیخؒ لامع میں اس ترجمہ کی شرح میں فرماتے ہیں'' مطلب یہ کہ نسب کا ذکر تعین اور رفع ابہام کے لئے ہوتا ہے، اور اگر یہ تعین اس کے بغیر ہی حاصل ہو تو نسبت ذکر کرنے کی ضرورت نہیں''۔ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ حافظؒ کہتے ہیں'' یعنی جب وہ اس کے بغیر مشہور ہو کہ کسی طرح کے التباس کا اندیشہ نہ ہو تو وثیقہ میں صرف مشہور نام کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ اس کے باپ دادے کا ذکر کرنا، اسی طرح نسبت اور شہر کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اور فقہاء کا یہ کہنا کہ وثیقہ میں اس کا نام، اس کے باپ دادے کا نام اور نسبت وغیرہ کا ذکر کیا

جائے، یہ اس صورت میں ہے کہ التباس کا اندیشہ ہو، اور اگر اندیشہ نہ ہو تو صرف استحباب کا درجہ رکھتے ہیں" الخ
پس سہیل نے کہا: بخدا! اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو آپؐ کو بیت اللہ سے نہ روکتے، نہ آپؐ سے جنگ و قتال کی نوبت آتی اور مغازی میں ہے کہ اس نے کہا کہ "ہم آپؐ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتے نہیں، اگر ہمیں آپؐ کا رسول ہونا مُسلّم ہوتا تو آپؐ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ لڑائی کرتے بلکہ آپؐ سے بیعت کر لیتے"

اور مغازی ابوالاسود میں ہے کہ سہیل نے کہا: "اگر ہم آپؐ کو رسول اللہ تسلیم کرتے ہوئے بھی بیت اللہ سے روکیں پھر تو ہم نے آپؐ پر بڑا ظلم کیا" اور خمیس میں شواہد النبوۃ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صُلح نامہ میں (محمد رسول اللہ کی بجائے) محمد بن عبداللہ لکھوایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "اے علیؓ تجھے بھی ایک دن اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا" اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ جب جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مصالحت ہوئی اور کاتب نے صُلح نامہ میں یہ عبارت لکھی "یہ وہ تحریر ہے جس پر امیرالمؤمنین حضرت علیؓ نے مصالحت کی" تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا: "امیرالمؤمنین نہ لکھیے، اگر میں آپ کو امیرالمؤمنین تسلیم کرتا تو آپ سے جنگ کیوں کرتا؟ اس کے بجائے "علی ابن ابی طالب" لکھیے" جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سُنا تو انہیں حدیبیہ کے دن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد آیا اور فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا، علی ابن ابی طالب ہی لکھو" زرقانی کہتے ہیں کہ نسائی نے بروایت علیؓ یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آئے گا اور تجھے مجبوراً کرنا پڑے گا" یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تحکیم کے دن پیش آیا کہ جب کاتب نے یہ تحریر کیا تھا "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر... امیرالمؤمنین حضرت علیؓ نے مصالحت کی" تو حضرت معاویہؓ نے پیغام بھیجا کہ اگر میں آپ کو امیرالمؤمنین جانتا تو تحکیم کی بات کیوں کرتا؟ اس لفظ کو مٹا دیجئے اور اس کی جگہ "علی ابن ابی طالب" کا لفظ لکھیے۔ یہ سُن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کہا: اور فرمایا ٹھیک وہی بات ہوئی، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی، بس اس لفظ کو مٹا دو" بلکہ اس کی جگہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھیے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! میں یقیناً اللہ کا رسول ہوں، اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے رہو۔ اس کی جزا محذوف ہے یعنی تب بھی میری رسالت کو مضر نہیں۔ پھر حضرت علیؓ سے فرمایا: اس لفظ کو مٹا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں

تو اس کو مٹا نہیں سکتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نہیں! اللہ کی قسم! میں آپ (کے نام) کو کبھی نہیں مٹا سکتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل ادب مستحب کے باب سے ہے کہ کبھی بزرگ شخصیت کی جانب سے کسی بات کا حکم ہو اور مامور یہ سمجھے کہ امر قطعی نہیں، اور اس میں بظاہر خلافِ ادب امر کا ارتکاب ہو، تو مامور کو توقف کرنا چاہیئے، جب تک معاملہ کی صحیح نوعیت سامنے نہیں آجاتی۔ زرقانی میں اسی طرح ہے۔ اور اوجز میں ہے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی امامت کے واقعہ میں کہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی نماز میں بدستور مشغول رہے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اس کا سب سے عمدہ جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ جو امر غیر واجب ہو وہاں تعمیل حکم کے بجائے رعایتِ ادب بہتر ہے۔ اور حضرت عبدالرحمن نے اس کے برعکس امتثالِ امر کو ترجیح دی" اھ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود مٹایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے اس لفظ کی جگہ دکھاؤ ——— چنانچہ آپ کو وہ لفظ دکھایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹا دیا۔ امام زہری فرماتے ہیں: ان دونوں باتوں میں سہیل کی ضد کو تسلیم کر لینا اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ مجھ سے جس بات کا بھی مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ اللہ کی حرمات کی تعظیم مقصود ہو، میں ان کا مطالبہ ضرور پورا کر دوں گا" پس اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عبداللہ کا لفظ لکھا اور بخاری کی کتاب المغازی کی روایت میں ہے کہ: پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیفہ خود لیا، اور آپ کتابت نہیں جانتے تھے۔ پس آپ نے تحریر فرمایا: "یہ وہ (تحریر) ہے جس پر محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کی" اور شیخ قدس سرہٗ لامع میں فرماتے ہیں: "راوی کا قول، پس آپ نے تحریر فرمایا" الخ، صحیح تر یہ ہے کہ آپ کی طرف نسبتِ کتابت مجازی ہے اور اس کو حقیقت پر محمول کر کے معجزہ قرار دینا مناسب نہیں، کیوں کہ اگر آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا ہوتا تو کفار کو یہ کہنے کا موقع تھا کہ آپ کو لکھنا آتا ہے اور اس سے ان کی یہ بدگمانی اور پختہ ہو جاتی کہ آپ۔ معاذ اللہ۔ شاعر اور کاتب ہیں، کتابیں پڑھ پڑھ کر بتاتے ہیں اور یہ خلافِ مقصود ہے" اھ اور لامع کے حاشیہ میں ان حضرات کے نام ذکر کیے جو ان دونوں اقوال کے قائل ہیں یعنی یہ معجزہ تھا یا مجاز پر محمول تھا، اور فریقین کے دلائل بھی خوب تفصیل سے ذکر کیے ہیں، جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔ پس اس کو یعنی سہیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرط یہ ہو گی کہ تم ہمارے لئے بیت اللہ جانے کا راستہ خالی کر دو تاکہ ہم اس کا طواف کر سکیں۔ پس سہیل نے کہا اللہ کی قسم! ہرگز

نہیں، ہم آپؐ کو بیت اللہ جانے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتے ورنہ عرب باتیں کیا کریں گے۔ عینیؒ کہتے ہیں کہ اس کا قول "عرب باتیں کریں گے" جملہ مستانفہ ہے اور "ہرگز نہیں" کے تحت میں داخل نہیں۔ "ہرگز نہیں"، کا مدخول محذوف ہے، یعنی ہم آپؐ کو بیت اللہ جانے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے اور بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ "ہرگز نہیں" کا لفظ بعد کے فقرے (عرب باتیں کیا کریں گے) پر داخل ہے اور مطلب یہ ہے کہ عرب ہرگز باتیں نہیں کریں گے۔ اور نہ ہم انہیں موقع دینا چاہتے ہیں، اور یہ ظن فاسد ہے۔" اھ

میں کہتا ہوں کہ جس احتمال کو عینیؒ نے رد کیا ہے۔ وہ بھی محتمل ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب الانبیاء "باب ما ینہی عنہ من دعوی الجاہلیۃ" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک مہاجر کے انصاری کو مارنے کا قصہ ذکر کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ سوال مذکور ہے کہ آپ اس کو قتل کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یحدث الناس انہ یقتل صحابہ" (یعنی نہیں، مبادا لوگ یہ نہ کہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو قتل کرتے ہیں) شیخؒ لامع میں فرماتے ہیں: "احتمال ہے کہ دونوں کو ایک ہی کلمہ قرار دیا جائے پس تحدث کی نفی ہوگی" اور اس کے حاشیہ میں کہ "حافظ کہتے ہیں کہ قتادہ کی مرسل روایت میں یہ الفاظ ہیں "لا واللہ لا یتحدث الناس" اس سے شیخؒ کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔" اھ مختصراً اور امام بخاریؒ نے "کتاب الایمان والنذور" کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے "لیس تغنی الکفارۃ" (نہیں کفایت کرتا ہے کفارہ) اور حاشیہ لامع میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ ایک جملہ ہے کہ دو جملے ہیں؟ عام شارحین نے اس کو ایک جملہ قرار دیا ہے اور میں نے اس کو ترجیح دی ہے کہ دو جملے ہیں اور میں نے اس کے متعدد نظائر ذکر کئے ہیں۔ منجملہ ان کے مسجد میں گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کے بارے میں فرمایا: لا ردھا اللہ علیک (یہاں تلاش نہ کر واپس کر دے اللہ تعالیٰ تیری چیز) وغیرہ۔ کہ ہم سے زبردستی یہ بات منوائی گئی ہے۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ "آپؐ ہم پر بزور قوت داخل ہو گئے" لیکن یہ یعنی آپؐ کے عمرہ کا ارادہ آئندہ سال پورا ہوگا۔ چنانچہ آپؐ نے یہی لکھوا دیا۔

صلح نامہ کی ایک اہم شرط: پس سہیل نے کہا اور اس شرط پر۔ یہ پہلی شرط پر عطف ہے کہ آپؐ کے پاس ہمارا جو آدمی بھی آئے، خواہ وہ آپؐ کے دین پر ہو، آپؐ اس کو ہمارے پاس واپس کر دیں گے۔ بخاری کی کتاب الشروط میں قصۂ حدیبیہ کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں اسی طرح ہے۔ زرقانیؒ کہتے ہیں "بخاری ہی کی ایک روایت میں کتاب الشروط کے شروع میں یہ الفاظ ہیں: "اور نہیں آئے گا ہم میں سے کوئی فرد" الخ۔ یہ

الفاظ مردوں کو بھی شامل ہیں اور عورتوں کو بھی ۔ اس لئے عورتیں بھی اس معاہدۂ صلح میں داخل تھیں۔ مگر بعد ازاں اُن کے حق میں معاہدہ منسوخ ہو گیا، یا (یہ کہا جائے کہ) عورتیں بطریقِ عموم ہی اس میں داخل تھیں، پھر اس عموم میں تخصیص کر دی گئی اور ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ ہے کہ " اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے جو شخص قریش کے پاس آئے، وہ اسے واپس نہیں کریں گے " اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ۔ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شرط پر مصالحت کی تھی کہ تم میں سے جو شخص ہمارے یہاں آئے ہم اُسے واپس نہیں کریں گے اور ہمارا آدمی جو تمہارے پاس آئے تمہیں واپس کرنا ہوگا "۔

پس صحابہؓ نے (از راہِ حسرت و تعجب) عرض کیا : یا رسول اللہ! کیا ہم یہ (صریح جانبدارانہ شرط بھی) لکھ لیں؟ فرمایا : ہاں! کیوں کہ ہمارا جو آدمی ان کے یہاں جائے (ہمیں اس کی ضرورت کیا ہے بس) اللہ تعالیٰ اس کو دور ہی رکھے ۔ اور جو شخص ان کے یہاں سے ہمارے پاس آئے (ہم معاہدہ کے مطابق اس کو واپس کر دیں گے مگر) عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے لئے کشائش اور نکلنے کی صورت پیدا فرما دیں گے "۔ اھ

عورتیں اس شرط میں داخل نہیں تھیں : اور یہاں دو فقہی بحثیں ہیں، جن پر لامع اور اس کے حاشیہ میں مفصل کلام کیا گیا ہے، اول یہ کہ کیا عورتیں بھی اس شرط میں داخل تھیں اور پھر نزول آیت سے اس سے مستثنیٰ ہوئیں؟ یا یہ کہ وہ شروع ہی سے معاہدہ میں داخل نہیں تھیں؟ اس ناکارہ کے نزدیک اَوْجَہ یہ ہے ۔ جیسا کہ لامع کے حاشیہ میں یہ دونوں قول ، جو زرقانی کے کلام میں ابھی اوپر گزرے ہیں، مفصل نقل کرنے کے بعد ذکر کیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں عورتوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا منظور تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صورت پیدا کر دی کہ معاہدہ ان الفاظ میں ہوا! " ہمارا جو آدمی آپ کے پاس آئے الخ " جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے مگر انہوں نے اس سے عموم سمجھا، چونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوا کرتی ہیں اس لئے بعض راویوں نے اس کو عموم کے الفاظ سے نقل کر دیا پھر جب عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیتِ امتحان نازل فرما کر اس پر تنبیہ کر دی کہ معاہدہ صرف مردوں سے مخصوص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ معاہدہ کا اصل لفظ ان تین لفظوں میں سے ایک ہوگا، یعنی کوئی مرد، کوئی فرد، جو شخص (رجل، احد، من) اور رجل کا لفظ زیادہ قرینِ قیاس ہے کیوں کہ مشرکین کو اس میں منازعت کا حق نہیں تھا اور اس سے عموم سمجھنا ان کے فہم کا قصور تھا اور اللہ عزّ اسمہٗ عالم الغیب تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا لفظ الہام فرمایا جو مقصود سے زیادہ قریب تھا۔

کیا صُلح میں ایسی شرط رکھنا اب بھی جائز ہے؟ • بحث دوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس شرط پر صُلح کا معاہدہ جائز ہے یا نہیں کہ مسلمانوں کو کافروں کی طرف واپس کر دیا جائے گا؟ شیخ قدس سرہ لامع میں فرماتے ہیں: "یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں کیوں کہ جس شخص کو واپس کیا جائے گا اس کی حالت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا (کہ وہ اپنے اسلام پر قائم رہ سکے گا یا نہیں) اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کا ایسی صلح کرنا خلاف مقتضیٰ شرع ہے" اھ اور لامع کے حاشیہ میں ہے کہ عینیؒ کہتے ہیں: "اس شرط پر مشرکوں سے صُلح کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ ایک قوم کا قول یہ ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے منسوخ ہے کہ "میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو کسی کافر کے ساتھ دار الحرب میں قیام پذیر ہو" اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دار الحرب سے ہجرت کرنا تمام مردوں اور عورتوں پر فرض ہے، یہ کوفیین اور امام مالکؒ کا قول ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم مردوں کے حق میں منسوخ نہیں، مگر اس قسم کے معاہدہ کا حق صرف خلیفہ کو ہے، یا ایسے شخص کو خلیفہ کی طرف سے مامور ہو، خلیفہ کے علاوہ اگر کسی شخص نے ایسا معاہدہ کیا تو وہ مردود ہوگا اور توضیح میں ہے کہ امام شافعیؒ کے اس قول سے کہ: "یہ مردوں کے حق میں منسوخ نہیں" مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عورتوں کے حق میں یہ حکم منسوخ ہے" — میں کہتا ہوں کہ مالکیہ سے مختلف روایات منقول ہیں جیسا کہ حاشیۂ لامع میں دردیر اور دسوقی سے نقل کیا ہے اور دردیر نے امام مالکؒ کا مذہب امام شافعیؒ کے موافق نقل کیا ہے اور مسلمانوں کو واپس کرنے کی شرط حنابلہ کے نزدیک صحیح ہے، جیسا کہ حاشیۂ لامع میں المغنی سے نقل کیا ہے اور شیخ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "عورتوں کو واپس کرنے کی شرط جائز نہیں اور نصِ قرآن اس عقد (صلح حدیبیہ) میں صرف یہی چیز موضع نسخ ہے، اس کے ماسوا میں نسخ کے دعویٰ کی کوئی سبیل نہیں، کیوں کہ کوئی چیز موجب نسخ نہیں"۔ مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ! اس کو مشرکین کی طرف کیسے واپس کر دیا جائے جب کہ وہ مسلمان ہو کر آیا ہے؟ حافظ کہتے ہیں کہ یہ بات غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہی ہوگی، جیسا کہ آگے آتا ہے اور واقدی نے اس بات کے کہنے والوں میں اُسَید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ اور اسعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے نام بھی ذکر کئے ہیں اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بھی نے اس کا انکار کیا تھا جیسا کہ بخاری شریف کی کتاب المغازی میں ہے۔

ابوجندل کا قصہ: اور ابھی وہ اسی حالت میں تھے اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ صلح نامہ ابھی ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابوجندل بر وزن جعفر بن سہیل بن عمرو اپنی بیڑیوں میں لڑکھڑاتے ہوئے آئے (ابو یوسف

(بصیغہ مضارع از نصر) یعنی بیڑیوں کے سبب آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے] ان کا نام عاصی تھا جس کو انہوں نے ترک کر دیا تھا، یہ جب اسلام لائے تو مکہ میں محبوس کر دیئے گئے، انہیں ہجرت سے روک دیا گیا اور اسلام کی خاطر ایذائیں دی گئیں اور یہ اسفل مکہ سے نکل کر آئے تھے یہاں تک کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان لا ڈالا۔ ابن اسحاق کی، روایت میں یہ اضافہ ہے کہ سہیل، ابوجندل کی طرف اٹھا، اس کے چہرے پر طمانچہ مارا، اس کا گریبان پکڑا اور اس کی گردن دبائی۔" پس اس کے باپ سہیل نے کہا " اے محمد! سب سے پہلی چیز جس پر میں آپ سے محاکمہ کرتا ہوں یہ ہے کہ آپ اس کو واپس کر دیں۔ آپ نے فرمایا ابھی تک تو ہم نے صلح نامہ پورا نہیں کیا یعنی ابھی تک تو اس کی کتابت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا: پھر اللہ کی قسم! میں آپ سے کسی چیز پر صلح نہیں کرتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چلئے اس کو میری خاطر اجازت دے دیجئے أَجِزْهُ : "اِجازۃ" سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اس کے حق میرے فعل کو نافذ رہنے دیجئے کہ میں اس کو واپس نہ کروں یا اس کو صلح سے مستثنیٰ کر لیجئے۔ اور حمیدی کی جمع بین الصحیحین میں: أَجِزْهُ! "ز" کے ساتھ ہے اور ابن جوزی نے "زا" کو ترجیح دی ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ عقود میں اصل اعتبار زبانی معاہدہ کا ہے اگرچہ اس کی تحریر اور اس پر شہادت ثبت کرنے میں تاخیر واقع ہو جائے۔ اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو اس کا لڑکا ابوجندل واپس کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد: "ابھی تک تو ہم نے تحریر مکمل نہیں کی" کے ذریعہ یہ چاہا تھا کہ کسی حیلہ سے سہیل راضی ہو جائے تو باقی قریشی بھی انکار نہیں کریں گے کہ یہ اس کے اپنے بیٹے کا معاملہ تھا لیکن جب اس نے انکار پر ضد باندھ لی۔ تو آپ نے اس کو واپس کر دیا، پس سہیل نے کہا میں اس کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ نے مکرر فرمایا: کہ اس کو تو مجھے اجازت دے ہی دو، سہیل بولا: میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور مکرز نے کہا اور واقدی کے مطابق مکرز اور حویطب نے کہا کہ نہیں بلکہ ہم آپ کی خاطر اس کو اجازت دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر ان دونوں نے ابوجندل کو پکڑ کر خیمہ میں داخل کر لیا اور اس کے باپ کو اس کے مارنے سے ہٹا دیا۔ حافظ رح کہتے ہیں کہ یہاں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ سہیل نے مکرز کو کیا جواب دیا، بعض شارحین کا کہنا ہے کہ "اس کو کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ مکرز کا عقد صلح سے کوئی تعلق نہیں تھا" لیکن یہ محل نظر ہے کیوں کہ واقدی اور ابن عائذ کی روایت ہے کہ مکرز بھی سہیل کے ساتھ صلح کے سلسلہ میں آیا تھا اور ان کے ساتھ حویطب بن عزّیٰ بھی تھا۔ مگر ان دونوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ اجازت صرف عذاب وغیرہ سے امن دینے تک محدود تھی، مسلمانوں کے پاس اس کے رہنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ صحیح کی روایت میں ہے کہ مکرز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب

ہو کر کہا کہ ہم نے آپ کی خاطر اس کی اجازت دی اور اسی بنا پر اس کا رویہ اشکال کا باعث سمجھا گیا۔ کیوں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے خلاف تھا کہ " وہ فاجر آدمی ہے " بظاہر اس کے فاجر ہونے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ سہیل کی ہمنوائی کرتا۔ اور اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا فاجر ہونا تو ایک حقیقت ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے شاذ و نادر بھی کوئی نیکی وقوع میں نہ آئے، یا ممکن ہے کہ اس نے یہ بات از راہِ نفاق کہی ہو اور باطن میں اس کے خلاف ہو، یا ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد سن لیا ہو کہ " وہ فاجر ہے "۔ اس لئے اسکے خلاف کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہو اور اگر واقدی اور ابن عائذ کی روایت ثابت ہو تو وہ ان احتمالات سے قوی تر ہے کیونکہ اس کے اجازت دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسکو سزا دینا بند کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کی طرف رجوع ہو جائے پس وہ اس اجازت کے ساتھ بھی فجور سے خارج نہیں ہوا۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ " سہیل نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی آمد سے پہلے میرے اور آپ کے درمیان قطعی فیصلہ ہو چکا تھا آپ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا "۔

اور شیخ قدس سرہٗ " لامع " میں فرماتے ہیں کہ مکرز کا یہ کہنا کہ " ہم نے آپ کی خاطر اس کو اجازت دے دی " چونکہ مکرز نہ تو قریش کی جانب سے وکیل تھا نہ ابوجندل کا ولی تھا اس لئے اس کی بات نہیں سنی گئی " اور لامع کے حاشیہ میں اس پر مفصل کلام کیا گیا ہے اور اس میں حافظ کا وہ کلام بھی ذکر کیا ہے جو ابھی اوپر گذرا اور اس کے آخر میں ہے کہ حافظؒ نے جو کہا ہے کہ : " بعض شارحین کا خیال ہے کہ سہیل نے مکرز کو کوئی جواب نہیں دیا " الخ اس سے کرمانی مراد ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں : " اگر تم کہو کہ جب مکرز نے کہہ دیا تھا کہ ہم نے اس کو اجازت دے دی تو آپ نے ابوجندل کو مشرکین کی طرف کیوں واپس کیا ؟ جواب یہ ہے کہ عقد صلح کو طے کرنیوالا سہیل تھا نہ کہ مکرز، پس اسی شخص کا قول معتبر ہے جو صلح طے کر رہا ہے نہ کہ مکرز کا قول " اھ ابوجندل نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا : اے مسلمانو ! کیا مجھے مشرکوں کے حوالے کیا جائے گا جب کہ میں مسلمان ہو کر آیا ہوں ؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مجھے کن مصائب سے سامنا ہے ؟ ان کو اللہ کے راستہ میں بہت ہی سخت عذاب دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ " ابوجندل بلند آواز سے فریاد طلبی کے انداز سے کہنے لگا، " اے مسلمانو ! کیا مجھے مشرکین کے حوالے کر دیا جائے گا کہ وہ مجھے دین سے بچلاتے رہیں ؟ " یہ سن کر مسلمانوں کے غم و اندوہ میں اور بھی اضافہ ہو گیا " اھ اور خمیس میں ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ سہیل ایک کیکر کے درخت کی طرف گیا اس سے ایک شاخ کاٹی اور اس سے ابوجندل کے منہ پر مارنے لگا، یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے

لگے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے ابوجندل صبر کر اور اللہ سے ثواب کی امید رکھ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے اور مسلمانوں کے لئے کشائش اور مخرج (اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ) پیدا فرمادیں گے، ہم ان لوگوں سے ایک معاہدہ کر چکے ہیں اور ہماری صلح ہو چکی ہے جس میں واپسی کی شرط بھی ہم نے قبول کرلی ہے، ان لوگوں نے ہمیں اللہ کا عہد دیا ہے اور ہم ان سے بدعہدی نہیں کریں گے۔" اور حضرت عمرؓ بن خطاب اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کر ابوجندل کے پہلو میں چلنے لگے اور ان سے فرما رہے تھے: اے ابوجندل! یہ تو مشرک ہیں، ان میں سے ایک ایک کا خون کتے کے خون کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عمرؓ تلوار اس کے قریب کر رہے تھے اور بعد میں فرماتے تھے، مجھے توقع تھی کہ وہ تلوار لے کر اپنے باپ کا سر اڑا دے گا۔ مگر ان صاحب کو اپنے باپ سے یہ سلوک گوارا نہ ہوا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابوجندل نے کہا: اے عمرؓ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مجھ سے زیادہ مستحق نہیں ہو۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب گھر سے چلے تھے تو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اس لئے انہیں فتح میں قطعاً شک نہیں تھا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں صلح ہو گئی ہے اور وہ فتح کے بغیر واپس جا رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کڑی شرطیں بھی قبول فرما لی ہیں تو انہیں اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ وہ اس صدمے سے مر جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا واللہ! میں جب سے اسلام لایا اس دن کے سوا مجھے کبھی کسی معاملہ میں تردد نہیں ہوا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں؟"۔ الخ خمیس میں اسی طرح ہے اور یہ پوری گفتگو بخاری کی روایت سے آگے آتی ہے۔ زرقانیؒ، حافظؒ کی متابعت میں کہتے ہیں "علماء نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال اور ان کی گفتگو خدانخواستہ دین میں شک کی وجہ سے نہیں ہوئی، تو بہ توبہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا: آپؐ کی رکاب تھامے رکھو کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں" تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ واقعی اللہ کے سچے رسول ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔" بلکہ اُن کی ساری گفتگو کا منشا اس صلح کی مصلحت دریافت کرنا تھا جو ان سے مخفی تھی، اور ان کی (کفار کی) تذلیل کرنا اور اسلام کے غلبہ پر برانگیختہ کرنا تھا، جیسا کہ نصرتِ دین اور تذلیلِ مبطلین کے بارے میں ان کی عادت اور شدت معروف ہے۔ میں کہتا ہوں! پس یہ شک جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں ذکر ہے وہ نہ تو دین میں تھا نہ رسالت میں، بلکہ اس امر میں تھا کہ صلح مصلحتِ دین کے حق میں

ہے یا نہیں؟ اور اس کا منشا یہ تھا کہ وہ اللہ کے معاملے میں سب سے سخت تھے۔ حافظؒ کہتے ہیں "جو بات میرے لئے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا توقف اس مقصد کے لئے تھا کہ وہ اس قصہ کی حکمت سے واقف ہو جائیں اور ان کا شبہ زائل ہو جائے۔ اس کی نظیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ قصہ ہے جو عبداللہ بن ابی ابن سلول کی نمازِ جنازہ کے وقت میں آیا۔ اگرچہ صلح حدیبیہ کے قصہ میں ان کا اجتہاد حکم کے مطابق واقع نہیں ہوا، بخلاف آخر الذکر قصہ کے۔ اور انہوں نے جو اعمال کئے وہ اسی بنا پر کئے ورنہ ان سے جو کچھ صادر ہوا تھا وہ اس میں معذور ہی نہیں بلکہ ماجور بھی تھے کہ وہ اس معاملہ میں مجتہد تھے۔" اھ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اعمال کئے ان کا بیان آگے آتا ہے۔

تکمیل صلح سے قبل دو غلاموں کی آمد: اور اس قصہ پر اس حدیث سے اشکال نہیں ہوتا جو مشکوٰۃ میں بروایت ابوداؤد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "حدیبیہ کے دن صلح سے پہلے دو غلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اُن کے آقاؤں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ! واللہ یہ آپ کے پاس اس لئے نہیں آئے کہ انہیں آپ کے دین سے رغبت ہے، بلکہ محض غلامی سے فرار کی بنا پر آئے ہیں۔" صحابہؓ میں سے کچھ لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ! انہوں نے صحیح لکھا ہے آپ ان کو واپس کر دیجئے۔" پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہوئے اور فرمایا اے جماعت قریش! میرا خیال ہے تم اس سے باز نہیں آؤ گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسے افراد مسلط کر دے جو اس پر تمہاری گردنیں ماریں۔" اور فرمایا: "یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہیں" (اشکال وارد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے) کہ یہ قصہ صلح سے قبل پیش آیا اور شیخؒ بذل میں اس طرف مائل ہوئے ہیں کہ یہ قصہ حدیبیہ کا نہیں بلکہ غزوۂ طائف کا ہے اور اس کو تین وجوہ سے ترجیح دی ہے، لیکن اس ناکارہ کے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ قصہ دونوں جگہ پیش آیا ہو۔ کیوں کہ ابوداؤد، ترمذی اور حاکم کی روایت میں یوم حدیبیہ کی تصریح ہے اور ابوداؤد کی روایت میں "یعنی یوم حدیبیہ" کا لفظ ہے اور ترمذی اور حاکم کی روایت میں "یعنی" کا لفظ نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بے چینی: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، پس عرض کیا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں؟ آپ نے فرمایا: "بلاشک" میں نے عرض کیا: کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟ فرمایا "بے شک" اور بخاری کی کتاب الجزیہ اور کتاب التفسیر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں جائیں گے؟ فرمایا: "بے شک" اور یہ جملہ کتاب الشروط میں نہیں۔ عرض کیا: جب یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر ہم ہمارے دین کے معاملہ میں خست اور ذلت کیوں دی جا رہی ہیں؟ اور تفسیر اور جزیہ میں یہ اضافہ ہے کہ کیا ہم یوں ہی واپس لوٹ جائیں

جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان فیصلہ نہیں کیا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اللہ کا رسول ہوں کہ
میں اس کے حکم کے خلاف نہیں کر رہا اور وہ میری مدد فرمائیں گے، اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قلق اور اضطراب
زائل کرنے کے لئے ان کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ آپ نے یہ معاہدہ کسی ایسے مقصد کی خاطر کیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے
آپ کو مطلع فرمایا ہے اور یہ کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ وحی سے کیا ہے میں نے عرض کیا کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں
فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ اس میں تنبیہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب
مدینہ منورہ میں دیکھا تھا، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اور ابن اسحاق کی روایت ہے کہ صحابہؓ کو اس بارے میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ
ضرور فتح ہوگی مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو صلح ہوگئی تو انہیں اس سے اتنا صدمہ ہوا کہ قریب تھا کہ
صدمہ سے ہلاک ہو جائیں" فرمایا: یہ تو صحیح ہے مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال جائیں گے؟ میں نے عرض کیا
یہ تو نہیں فرمایا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس تم بالضرور بیت اللہ جاؤ گے اور طواف کرو گے" اور واقدی
نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اس دن مجھے عظیم صدمہ ہوا اور میں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم سے ایسا سوال جواب کیا جو اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا" اور بزار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گئے مگر میں انکار ہی کرتا رہا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا: اے عمر! تم دیکھ رہے ہو کہ میں راضی ہو گیا ہوں مگر تم انکار ہی کئے جاتے ہو" اور بخاری کی کتاب الجزیہ
اور کتاب التفسیر میں حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے
ابن خطاب! میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے ہرگز ضائع نہیں فرمائیں گے" پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
غم و غصہ کی حالت میں واپس ہوئے مگر کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس
آئے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "پس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا،
حافظؒ کہتے ہیں کہ "حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے
اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی اور سے بھی مراجعت کی ہو۔ اور یہ اس لئے کہ حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جلالت قدر اور وسعت علم مسلّم تھی" زرقانیؒ کہتے
کہ ابن اسحٰق کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل حضرت ابوبکرؓ سے سوال کرنا مذکور ہے، مگر صحیح کی روایت
زیادہ صحیح ہے خصوصاً جب کہ ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس جانے کا سبب کیا تھا" اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت ابوبکرؓ سے سوال و جواب کرنے کا سبب وہ شدید غم و غصہ تھا جو انہیں لاحق تھا،

اور دین کی نصرت و سربلندی اور کافروں کی تذلیل کا وہ شدید داعیہ تھا جو اُن میں موجزن تھا، جیساکہ حضرت سہل بن حنیف اس کو اپنے لفظوں میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ، وہاں سے غم و غصہ کی حالت میں لوٹے، مگر کسی کروٹ چین نہیں آیا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے" اھ پس میں نے کہا! اے ابوبکرؓ! کیا آپ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں، بے شک سچے نبی ہیں۔ میں نے کہا، کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں؟ یقیناً۔ میں نے پھر کہا ہیں ہمارے دین کے بارے میں ذلت اور خست کیوں دی جا رہی ہے۔ ابوبکرؓ نے عمر رضی اللہ عنہا سے کہا: ارے میاں! یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں، اور آپ اپنے رب کے حکم کے خلاف نہیں کرتے، اور اللہ تعالےٰ آپ کی ضرور مدد کرے گا، اس لئے آپ کی رکاب تھامے رکھو، غرز (بفتح غین معجمہ و سکون را اور اس کے بعد زا، اونٹ کی رکاب کو کہا جاتا ہے۔) یعنی آپ کے حکم کو مضبوطی سے پکڑو، اور آپ کی مخالفت نہ کرو، جس طرح کوئی شخص سوار کی رکاب تھامے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا اور الہدی میں یہ اضافہ ہے: "یہاں تک کہ تمہاری موت آجائے" اور لامع میں ہے کہ "یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حکم کیا گیا ہے کہ مرتے دم تک آپ کا ساتھ دیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر و نہی میں آپ کے خلاف نہ کریں" اھ کیوں کہ اللہ کی قسم! آپ حق پر ہیں، میں نے کہا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے یہ نہیں فرماتے تھے کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ کہا: یہ تو صحیح ہے مگر کیا آپ نے تم سے یہ بھی فرمایا تھا کہ تم اسی سال جاؤ گے؟ میں نے کہا، یہ تو نہیں فرمایا تھا۔ کہا: پھر تم ضرور جاؤ گے اور بیت اللہ کا طواف کرو گے۔ الغرض حضرت ابوبکرؓ نے لفظ بلفظ ٹھیک وہی جواب دیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اس سے ثابت ہوا کہ؟ حضرت ابوبکرؓ تمام صحابہؓ میں سب سے کامل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے سب سے زیادہ واقف، امور دین کے سب سے بڑے عالم اور امر الٰہی کی موافقت میں سب سے مضبوط تھے۔

اور فتح میں ہے " اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ مسلمانوں نے صلح مذکور کو ناگوار سمجھا، عام مسلمان اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر تھے، اور اس جملہ سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس میں ان کے موافق نہیں تھے، بلکہ آپؓ کا قلب ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کے ہم رنگ تھا، اور ہجرت کے بیان میں آتا ہے کہ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ٹھیک وہی اوصاف بیان کئے ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے تھے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناداروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور ناگہانی مصائب میں لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں، وغیرہ چونکہ دونوں کی

صفات ابتدا ہی سے ہمرنگ تھیں، اس لئے یہ ہمرنگی نہ صرف آخر تک رہی بلکہ انتہا کو پہنچ گئی۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ وہی حالت ہے جس کو حضرات صوفیہ "نسبتِ اتحادیہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ان چاروں نسبتوں میں سے ایک ہے جو صوفیہ کے یہاں معروف ہیں۔ یعنی نسبتِ انعکاسیہ، نسبت القائیہ، نسبت اصلاحیہ اور نسبت اتحادیہ۔ میں نے حاشیۂ لامع کے ابتدائی اوراق میں جہاں ابتداء وحی کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بغل میں لے کر دبانے کا ذکر ہے، ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اور کتب حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس "نسبت اتحادیہ" کی بہت سی مثالیں مذکورۃ الصدور دو واقعات کے علاوہ بھی مذکور ہیں، ان میں ایک اُساریٰ بدر کا واقعہ ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کی تھی۔ اور اسی "نسبتِ اتحادیہ" کے نتیجے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بلا فصل ہوئے کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق سے نہایت وحشت و دہشت طاری تھی، ان حالات میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کسی ایسے شخص کے سپرد ہوتی جس کی طبیعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کے ذرا بھی خلاف ہوتی تو اس کے احکام میں مزید وحشت پیدا ہو جاتی، اور میں نے حاشیۂ لامع میں اسی کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے، چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے تقدم کے وجوہ و اسباب میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات و عواطف کے یکسر تابع تھی اور یہی سبب تھا کہ حضرات صحابہ کو ان کے احوال سے اُنس حاصل ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "بعد ازاں اس کی خاطر میں نے بہت سے عمل کئے"۔ بعض شارحین نے "بہت سے اعمال" کی تفسیر آمد و رفت اور سوال و جواب سے کی ہے، حافظؒ کہتے ہیں "بہت سے اعمال" کی یہ تفسیر مردود ہے، بلکہ اس سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں، تاکہ ان سے ابتداء میں امتثالِ امر سے جو توقف سرزد ہوا، اس کا ازالہ اور تکفیر ہو جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تصریح منقول ہے، چنانچہ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن میں نے جو کچھ کیا اور جو گفتگو ہوئی اس کے خوف سے میں نے صدقے کئے، روزے رکھے، نمازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے"۔ اور واقدی کی روایت میں ہے کہ: "میں نے اس کی وجہ سے بہت سے غلام آزاد کئے اور مدت تک روزے رکھے"۔

صلح نامہ کی دس دفعات: زرقانی کہتے ہیں: اور دس سال کے لئے صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ جیسا کہ سہیل کی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ابتدائی گفتگو میں مفصل گزر چکا۔ اور خمیس میں ہے کہ "سہیل نے جو شرط بھی پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول کرتے گئے، اور حضرت علی رضی اللہ تعالٰے عنہ لکھتے گئے اور لکھا کہ: یہ وہ تحریر ہے، جس پر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً) نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی۔ اور دونوں نے دس برس تک لڑائی موقوف رکھنے پر اتفاق کیا تاکہ لوگ اس مدت میں امن سے رہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں، اور یہ کہ قریش کا جو شخص ولی کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اگرچہ وہ مسلمان ہو، وہ اسے واپس کریں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفقاء میں سے جو شخص قریش کے پاس آئے وہ واپس نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ ہمارے درمیان راز بند رہیں گے، یعنی بہت سے امور میں جو صاف سینوں میں دفن رہیں گے، یہ اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ اس کے قبل اسباب حرب وغیرہ کے جو قصے فریقین کے درمیان پیش آچکے ہیں ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اور یہ کہ چوری اور خیانت نہیں ہوگی۔ اسلال سل سے ماخوذ ہے یعنی چوری کرنا اور اغلال کے معنی خیانت کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ فریقین امن وامان سے رہیں گے اور فریقین کے جان ومال سراً وجہراً مامون ومحفوظ رہیں گے، اور یہ کہ جو قبیلہ قریش کے عقد ومعاہدہ میں شامل ہونا چاہے شامل ہوسکتا ہے اور جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب شامل ہونا چاہے، اس جانب شامل ہوجائے۔ چنانچہ خزاعہ فوراً اُٹھے اور کہا: ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد ومعاہدہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اور بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے عقد ومعاہدہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں، پس ہمارے یہاں مکہ میں نہ آئیں، اور یہ کہ آئندہ سال ہم مکہ سے نکل جائیں گے، پس آپ اور آپ کے صحابہؓ داخل ہوں اور تین دن رہیں، آپ لوگوں کے ساتھ صرف وہ ہتھیار ہوں جو سوار کے پاس ہوتے ہیں یعنی نیام میں بند تلواریں، ان کے علاوہ آپ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے۔" اھ خمیس کی عبارت ختم ہوئی۔ اور زرقانی میں ہے کہ "ایک شرط یہ تھی کہ آپ اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال مکہ آئیں گے، تین دن رہیں گے اور صرف بند ہتھیار ساتھ لائیں گے۔ جُلُبّان بضم جیم وسکون لام باء موحدہ بغیر تشدید کے پھر الف پھر نون یا تھیلے جیسی ایک چیز ہوتی ہے جس میں نیام بند تلوار رکھی جاتی ہے۔ اور ایک روایت میں جُلُبّان بضم جیم ولام اور تشدید باء کے ساتھ ہے یعنی وہ تھیلے جن میں اسلحہ رکھا جائے۔ یہ شرط اس بناء پر لگائی تاکہ یہ صلح کی علامت ہو کہ ان کا داخلہ صلحاً تھا۔"

گواہوں کے دستخط: جب صلح نامہ کی تحریر سے فارغ ہوئے۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ جب

بین القوسین کی عبارت اصل عربی نسخہ میں رہ گئی تھی، حضرت شیخ مد ظلہم کے حکم سے ترجمہ میں اضافہ کیا گیا۔ مترجم

صلح نامہ کی تحریر سے فراغت ہوئی تو صلح نامہ پر طرفین کے چند افراد کی شہادت ثبت کر دی گئی، مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، محمود بن مسلمہ، عبداللہ بن سہیل بن عمرو اور ابوعبیدہ بن جراح کے اور مشرکین کی طرف سے مکرز بن حفص اور حویطب بن عبد عزیٰ کے نام ذکر کئے گئے ہیں فتح الباری میں اسی طرح ہے اور کچھ اضافہ خمیس سے کیا گیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اٹھو! نحر اور حلق کرو۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ ابوالاسود کی روایت میں عروہ سے مروی ہے کہ "جب صلح سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کا حکم فرمایا۔ پس مسلمانوں نے ہدی کے جانور حرم کی طرف کھینچے، اور مشرکین قریش نے ان کو روک دیا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کا حکم فرمایا" اور زرقانیؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ۔

"ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہدی کے اونٹوں کو بیت اللہ شریف سے روک دیا گیا تو وہ اس طرح آوازیں نکالتے تھے جس طرح اپنی اولاد کے اشتیاق میں آواز نکالا کرتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے اونٹوں کو حدیبیہ میں اسی جگہ نحر کیا جہاں ان کو روک دیا گیا تھا" یعنی اکثر کو۔ لہٰذا یہ روایت اس دوسری روایت کے منافی نہیں جو ابن سعد نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو اسلم کے ایک شخص کے ساتھ بیس اونٹ بھیجے تاکہ انہیں مروہ کے پاس نحر کیا جائے" زرقانی میں اسی طرح ہے اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث ابن کثیرؒ نے امام احمدؒ کے حوالہ سے ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن ستّر اونٹ نحر کئے، جن میں ابوجہل کا اونٹ بھی شامل تھا، پس جب ان کو بیت اللہ سے روک دیا گیا تو وہ ایسی مشتاقانہ آواز نکالتے تھے جیسے اپنی اولاد کے اشتیاق میں نکالتے ہیں۔ پس اللہ کی قسم! صحابہؓ میں سے ایک بھی نہ اٹھا۔ کہا گیا ہے کہ غالباً انہوں نے اس بنا پر توقف کیا کہ شاید یہ حکم استحباب کے لئے ہو یا اس توقع پر کہ شاید نزول وحی کے ذریعہ صلح مذکور کو کالعدم قرار دے دیا جائے یا انہیں اسی سال عمرہ کے لئے مکہ جانے کی اجازت دے کر اس میں تخصیص ہو جائے، اور اس کی گنجائش اس لئے تھی کہ یہ زمانہ نسخ کا تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ صلح جو دب کر ہوئی تھی اس نے انہیں مبہوت اور بے خود کر دیا ہو اور یہ اس فکر میں مستغرق ہوں کہ باوجود ظہور قوت کے ان کے خیال میں انہیں ذلت لاحق ہوئی، جبکہ انہیں یقین تھا کہ وہ قہر و غلبہ کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور ادائے عمرہ کی قدرت رکھتے ہیں۔ یا انہوں نے تعمیل حکم میں اس لئے تاخیر کی کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ امر مطلق کا فی الفور بجا لانا ضروری نہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ امور مجموعی طور پر ان کے مجموعہ کو پیش آئے ہوں۔ (یعنی بعض حضرات کے لئے بعض امور اور دوسرے بعض کے لئے دوسرے بعض امور) جیسا

کہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے کلام میں آگے آتا ہے، یہاں تک آپؐ نے تین بار یہی فرمایا: پس جب کوئی نہ اٹھا تو آپؐ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ صرف اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں، جیسا کہ ابتدا میں گذر چکا ہے۔ پس ان سے اُس امر کا تذکرہ کیا جو لوگوں کی جانب سے آپؐ کو پیش آیا تھا۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ: آپؐ نے اُن سے فرمایا: "تم لوگوں کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو کہ میں انہیں حکم دیتا ہوں مگر وہ اس کو بجا نہیں لاتے"۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "یہ بات آپؐ کو بہت گراں گزری، پس اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: مسلمان ہلاک ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کو حکم دیا کہ حلق اور نحر کریں مگر انہوں نے نہیں کیا"۔ راوی کا بیان ہے کہ اس دن صحابہ کرامؓ کی مشکل اللہ تعالیٰ نے حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا کے ذریعہ حل فرمائی، چنانچہ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ اس کو پسند فرماتے ہیں؟ باہر تشریف لے جائیے اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر اپنی ہدی ذبح کر دیجئے، اور حلاق کو بلا کر حلق کرا لیجئے۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ: "اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یارسول اللہ! ان سے بات نہ کیجئے، آپؐ نے امر صلح میں جس مشقت کا تحمل فرمایا ہے اس کی وجہ سے نیز بغیر فتح کے واپس لوٹنے کی وجہ سے انہیں صدمہ عظیم لاحق ہے"۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے صحابہ کے بارے میں یہ سمجھا ہو کہ انہیں یہ خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رخصت پر عمل کرنے کے لئے احرام کھولنے کا حکم فرمایا ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عزیمت پر عمل فرماتے ہوئے احرام باقی رکھیں گے۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپؐ خود اپنا احرام کھولیں تاکہ صحابہ کرامؓ کے سامنے یہ احتمال باقی نہ رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ صائب مشورہ ہے اس لئے یہی کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، کسی سے کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے اونٹوں کا اور ایک روایت میں ہے کہ اپنی ہدی کا نحر کیا۔ ابن اسحاق نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ اضافہ کیا ہے کہ آپؐ کی ہدی کے ستر اونٹ تھے، جن میں ابوجہل کا اونٹ بھی تھا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حلاق کو بلا کر حلق کرایا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں: "مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جن صاحب نے اس دن آپؐ کا حلق کیا، ان کا نام خراش (خاء، راء، الف، اور شین کے ساتھ) ابن امیہ خزاعی تھا، پس جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو فوراً اُٹھے اور نحر کیا، حافظؒ کہتے ہیں "پس جب صحابہؓ نے یہ دیکھا تو فوراً امر نبوی کی طرف سبقت کی کیونکہ اس کے بعد کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہ گئی تھی" اور ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل ہی کر دیں۔ اور بخاری میں حضرت

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (عمرہ کے لئے) نکلے، پس کفارِ قریش حائل ہو گئے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کیا اور صحابہؓ نے قصر کیا۔" ملا علی قاری مرقات میں کہتے ہیں! "یعنی بعض صحابہؓ نے قصر کیا اور باقی حضرات نے حلق کیا تھا۔"

حلق کرانے والوں کے لئے تین بار دُعا کرنا: اور طبقات میں ہے کہ "آپ کے صحابہؓ نے نحر کیا اور عام حضرات نے حلق کرایا اور کچھ لوگوں نے قصر۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرانے والوں پر رحم فرمائے!" یہ دُعا تین بار فرمائی عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! اور قصر کرنے والوں پر بھی؟ فرمایا اور قصر کرنے والوں پر بھی۔ ابن اسحاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس دن حلق کرایا اور کچھ حضرات نے قصر کرایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حلق کرنیوالوں پر رحم فرمائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اور مقصرین پر بھی — الحدیث — اور اسکے آخر میں ہے کہ "عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! آپ نے حلق کرانے والوں کو رحمت کی دعا کرنے میں ترجیح کیوں دی؟ فرمایا! وہ شک میں نہیں پڑے"۔ زرقانی کہتے ہیں کہ مغلطائی نے کہا ہے: اور اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جیسا کہ ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بیت اللہ سے روک دیا گیا۔ اور انہوں نے حلق و نحر کیا تو اللہ تعالیٰ نے زور کی ہوا بھیجی جس نے ان کے بالوں کو اٹھا کر حرم میں لا ڈالا۔ یہ ان کے بیت اللہ سے روک دیئے جانے کی تلافی تھی، ابو عمر کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ وہ قبول عمرہ کی نیک فالی سے بہت ہی خوش ہوئے غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس سے مستثنیٰ تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ خراشؓ نے جب آپ کا حلق کیا تو آپ کے موئے مبارک کیکر کے سرسبز درخت پر جو ان کے قریب ہی تھا، پھینک دیئے پس لوگ اس کے اوپر سے لینے لگے اور اُم عمارہ نے آپ کے موئے مبارک کے کئی گچھے لئے، وہ ان کو دھو کر کے بیماروں کو پلاتی تھیں جس سے وہ شفایاب ہو جاتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ موئے مبارک کا اکثر حصہ صحابہؓ نے لے لیا ہو اور باقی ماندہ ہوا سے اڑ کر حرم شریف میں جا پڑے ہوں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن ہم سے فرمایا: تم لوگ تمام روئے زمین کے لوگوں سے افضل ہو"۔ اور مسلم وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "کوئی شخص جو بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا دوزخ میں داخل نہیں ہوگا"۔ اور امام مسلم نے حضرت اُم مبشر رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ "اصحاب شجرہ میں سے کوئی شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا"۔ ابو عمر کہتے ہیں کوئی غزوہ، غزوہ بدر کے مساوی یا اس کے قریب نہیں، بجز

غزوۂ حدیبیہ کے، کہ وہاں بیعت رضوان ہوئی تھی، لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کو غزوۂ حدیبیہ پر ترجیح حاصل ہے اور وہ فضیلت میں غزوۂ بدر کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔

حدیبیہ میں قیام کی مدت : اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں دس دن سے کچھ زیادہ فروکش رہے، بعض نے بیس دن بتائے ہیں اور واقدی اور ابن سعد نے "کچھ زیادہ" کو مبہم رکھا ہے۔ شامی میں ان دونوں سے انیس دن نقل کئے ہیں اور ابن عائذ نے ڈیڑھ ماہ قیام کا ذکر کیا ہے۔

قصۂ حدیبیہ سے متعلق فقہی مباحث : مخفی نہ رہے کہ قصۂ حدیبیہ میں بہت سے فقہی ابحاث ہیں جن کی تفصیل اوجز اور لامع کے حاشیہ میں مذکور ہے۔ اس مختصر رسالہ میں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ اوجز میں "باب ما جاء فیمن احصر بعدو" کے ذیل میں ہے کہ "اس میں بہت سے ابحاث ہیں: ۱۔ احصار کس چیز سے متحقق ہوتا ہے؟ ۲۔ کیا عمرہ میں بھی احصار متحقق ہوتا ہے؟ ۳۔ وجوب قضا کی بحث۔ ۴۔ وجوب ہدی کی بحث۔ ۵۔ نحر ہدی کے زمان و مکان میں اختلاف۔ ۶۔ جو شخص ہدی سے عاجز ہو کیا وہ کسی اور چیز کی طرف انتقال کر سکتا ہے؟ ۷۔ وقوف عرفات کے بعد بیت اللہ سے روک دیئے جانے کی بحث۔ ۸۔ کیا محصر کے لئے احرام کھولتے وقت حلق کرانا لازم ہے؟ ۹۔ کیا احرام کے وقت شرط لگا لینا محصر کے لئے مفید ہے؟ ۱۰۔ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احصار۔ ۱۱۔ حدیبیہ حل میں داخل ہے یا حرم میں؟ ۱۲۔ جس شخص کو احرام سے قبل احصار کا علم ہو جائے اس کا حکم؟ ۱۳۔ ما استیسر من الہدی سے کیا مراد ہے؟ علاوہ ازیں دیگر مباحث جو اوجز میں مذکور ہیں۔

سورہ فتح کا نزول : پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہوئے۔ درآنحالیکہ صحابہؓ کے دل میں اس بات کا قلق تھا کہ فتح نہیں ہوئی۔ جب کہ مدینہ منورہ سے چلتے وقت انہیں اس کے ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں تھا، پس جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی راستہ ہی میں تھے سورۃ فتح نازل ہوئی۔ زرقانی کہتے ہیں کہ "یہ سورت مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی، جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابن سعد کی روایت ہے کہ اس کا نزول موضع ضجنان میں ہوا۔ ضجنان۔ ضاد مہملہ کا فتح، جیم کا سکون، اور دو نون، اور ان کے درمیان الف۔ مکہ سے ایک برید پر ایک پہاڑ کا نام ہے اور سیوطیؒ درمنثور میں کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ، امام احمدؒ، امام ترمذیؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ میں نے تین بار آپ سے ایک بات دریافت کی، مگر آپ نے جواب نہ دیا، میں نے اپنے جی میں کہا اے خطاب کے بیٹے! تجھ کو تیری ماں گم پائے، تو نے تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا مگر آپ نے تجھے جواب نہیں دیا۔ پس میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی اور سب

لوگوں سے آگے ہوگیا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ میرے حق میں کہیں قرآن نہ نازل ہو جائے۔ زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ میں نے ایک شخص کو سنا کہ مجھے زور زور سے پکار رہا ہے، میں لوٹ آیا اور میرا خیال تھا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہو چکا ہے۔ (میں حاضر ہوا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آج رات مجھ پر ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے یعنی انا فتحنالک فتحاً مبیناً" اور امام احمد، ابو داؤد وغیرہ نے حضرت مُجمّع بن جاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم حدیبیہ میں حاضر ہوئے جب واپسی میں "کراع الغمیم" پہنچے تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ اونٹ دوڑا رہے ہیں۔ پس لوگوں نے دریافت کیا (ایک دوسرے سے) کہ کیا قصہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی ہے۔ پس ہم بھی لوگوں کے ساتھ اونٹ دوڑاتے ہوئے نکلے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کراع الغمیم" میں اپنی اونٹنی پر ہیں۔ پس لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے، آپ نے ان کے سامنے اُنا فتحنالک فتحاً مبیناً پڑھی۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے یہ یقیناً فتح ہے" میں کہتا ہوں کہ بخاری شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ تم لوگ تو فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور فتح مکہ تو فتح تھی ہی، مگر ہم لوگ تو فتح بیعت رضوان کو سمجھتے تھے" اور لامع میں ہے: "کیونکہ یہ بیعت، فتح مکہ کا سبب تھی کہ صلح حدیبیہ بہت سے فوائد کا ذریعہ ثابت ہوئی چنانچہ اسلام کی باتیں اور مسلمانوں کے اخلاق و عادات تمام عرب میں پھیل گئے، وغیر ذالک" اور اس کے حاشیہ میں حضرت مُجمّع بن جاریہ انصاری کی حدیث جو ابھی در منثور کے حوالے سے اوپر گذری ہے، ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: اور کتاب الجہاد میں: باب اثم من عاہد ثم غدر" کے بعد ایک بلا ترجمہ باب میں حدیث حدیبیہ بروایت سہیل بن حنیف گذر چکی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: پس عمر رضی اللہ عنہ ———— ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اُن سے بھی وہی گفتگو ہوئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی پس سورۃ فتح نازل ہوئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پوری پڑھ کر سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا، ہاں" حافظؒ کہتے ہیں "فتح سے مراد یہاں حدیبیہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے فتح مبین کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس پر صلح مرتب ہوئی، اور جو حضرات اسلام لانے اور مدینہ آنے سے ڈرتے تھے ان کو موقع ملا، جیسا کہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کو یہی صورت پیش آئی، اس کے بعد ایسے اسباب پے در پے وقوع پذیر ہوئے کہ بالآخر فتح مکمل ہوئی۔ اور ابن اسحاق نے امام زہری سے نقل کیا ہے کہ حدیبیہ سے قبل کوئی فتح اسلام میں اس سے عظیم تر ثابت نہیں ہوئی۔ گذشتہ (انیس) سالوں میں جتنے لوگ اسلام لائے تھے ان دو سالوں میں

اتنے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ اسلام لائے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ حدیبیہ کے لئے تشریف لے گئے تو کل چودہ یا پندرہ سو آدمی آپ کے ساتھ تھے اور اس کے دو سال بعد فتح مکہ میں آپ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ نکلے" الخ

زرقانیؒ کہتے ہیں کہ " موسیٰ بن عقبہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے تھے کہ ایک صحابی نے کہا : کیا یہ فتح ہے ؟ انہوں نے ہم کو بیت اللہ سے روک دیا ، ہماری ہدی روک دی گئی اور دو مسلمان مشرکوں کے حوالے کر دیئے گئے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا : بہت ہی بری بات کہی ۔ ارے یہ تو سب سے بڑی فتح ہے کہ مشرکین ...... صرف اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ اپنے علاقے میں جانے سے تمہیں روک دیں اور وہ تم سے صلح کی درخواست کرتے ہیں اور امن کی خاطر تمہاری طرف رغبت کرتے ہیں ، جو چیز ان کو ناگوار تھی اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف سے اس کا موقع نہیں آنے دیا اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کامیابی دی اور تمہیں اجر و ثواب کے ساتھ صحیح و سالم واپس کر دیا ، اس لئے یہ سب سے بڑی فتح ہے ، کیا تم اُحُد کا دن بھول گئے جب کہ تم دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور میں پیچھے سے تم کو بلا رہا تھا ؟ کیا تم جنگِ احزاب کا دن بھول گئے جب کہ وہ تمہارے اوپر کی جانب سے اور تمہارے نیچے کی جانب سے چڑھ آئے تھے اور جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آرہے تھے اور تم اللہ کے بارے میں مختلف خیال باندھ رہے تھے ؟ پس مسلمانوں نے کہا ، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ، واقعی یہ بہت بڑی فتح ہے ، اللہ کی قسم ! یا نبی اللہ ، ہم نے اس بات پر غور نہیں کیا جو آپ کے پیش نظر تھی ، بلاشبہ آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے امر کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں " امام زہریؒ نے صلح حدیبیہ کی جو مصلحت ذکر کی ہے اس کے علاوہ یہ مصلحت بھی ہے کہ وہ فتح اعظم کا مقدمہ تھی اور اس کے بعد لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے ، اور قصۂ حدیبیہ چونکہ فتح کا مقدمہ ہے اس لئے وہ بھی فتح کے ساتھ موسوم ہوا " اور شیخ ابن قیمؒ نے صلح حدیبیہ کے مصالح بہت ہی تفصیل سے ذکر کئے ہیں ، جن کا خلاصہ چار چیزیں ہیں : اول یہ کہ یہ فتح اعظم کا مقدمہ ثابت ہوئی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے رسول ، صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اپنے لشکر کو معزز کیا اور جس کے ذریعہ لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوئے ، دوم یہ کہ یہ خود بھی سب سے بڑی فتح تھی ، کیوں کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے امن نصیب ہوا ، مسلمانوں کو کافروں سے اختلاط کا موقع ملا اور مسلمانوں نے ان کو کھل کر دعوت دینا شروع کی ، ان کو قرآن سنایا ، اور نہایت امن و سکون سے علی الاعلان ان کے ساتھ اسلام کے موضوع پر گفتگو اور مناظرے کئے ، اور جو

لوگ اپنے اسلام کا اظہار نہیں کر پاتے تھے ان کو اظہار اسلام کا موقع ملا اور مدت صلح کے درمیان وہ سب لوگ اسلام میں داخل ہوئے جن کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے ایمان و اذعان میں اضافے کا ذریعہ بنا دیا اور ان کو ہر پسند و ناپسند میں انقیاد اور مکمل سپردگی کی مشق ہوئی اور اس ضمن میں انہیں رضا بالقضاء اور وعدۂ الٰہی کی تصدیق کی دولت حاصل ہوئی، چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان انعامات کا ذریعہ بنایا جن کا ذکر سورۂ فتح میں ہے یعنی آپ کی اگلی پچھلی تمام خطاؤں کی مغفرت، آپ پر اپنے انعامات کی تکمیل، صراط مستقیم کی طرف آپ کی راہنمائی، آپ کی قوی نصرت، آپ کا ان امور سے راضی ہونا، اور آپ کا انشراح الصدر"۔ انتہی مختصرًا

مسلمان عورتوں کی آمد: پھر مومن عورتیں آئیں۔ حافظؒ کہتے ہیں: اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورتیں آپ کے پاس اس وقت آئیں، جب کہ آپ حدیبیہ میں فروکش تھے۔ مگر ایسا نہیں، بلکہ وہ مدت صلح کے دوران آئی تھیں، امام بخاری نے کتاب الشروط کے اوّل میں جو روایت ذکر کی ہے وہ اس مدعا پر شاہد ہے چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں "اور اس مدت کے دوران جو مرد بھی آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واپس کر دیا اگرچہ وہ مسلمان تھا اور کچھ مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں"۔ انتہی۔ اور خمیس کی ایک روایت میں ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں تھے کہ آپ کے پاس مومن عورتوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے آئی، ان ہی میں ام کلثوم بنت عقبہ اور سُبَیعہ بنت الحارث الاسلمیہ تھیں، سُبَیعہ کا شوہر مسافر مخزومی اس کی طلب میں آیا اور مشرکین نے چاہا کہ آپ اسے واپس کر دیں، پس جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے: یاایھا الذین اٰمنوا اذا جاءکم المومنات مھاجرات الایہ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبیعہؓ سے حلف لیا، اس نے قسم کھائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شوہر مسافر کو اس کا خرچہ ادا فرما دیا اور سبیعہ سے حضرت عمرؓ نے نکاح کیا"۔ اھ

اور الاکتفاء میں ہے، کہ مدت صلح میں ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئیں۔ ان کے دو بھائیوں عمارہ اور ولید نے مطالبہ کیا کہ ان کو واپس کیا جائے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس نہیں کیا اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتے ہیں" اھ حافظ ابن عبدالبر "استیعاب" میں لکھتے ہیں: "کہا گیا ہے کہ یہ سب سے پہلی خاتون تھیں جو ہجرت کر کے آئیں، ان کی ہجرت مدت صلح میں ۷ھ میں ہوئی اور اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اذا جاءکم المومنات مہاجرات[1] الایۃ۔ حافظ ابو عمر ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ

---

[1] وفی الاصل اذا جاءکم المہاجرات

مکہ سے چل کر پیدل مدینہ پہنچی تھیں" حافظ کہتے ہیں! جو مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں ان میں سے مندرجہ ذیل کے نام ذکر کئے گئے ہیں۔ ۱۔ امیمہ بنت بشر، یہ حسان کے نکاح میں تھیں، پھر سہل بن حنیف نے ان سے نکاح کیا۔ ۲۔ ام حکم بنت ابی سفیان ۔ ۳۔ بروع بنت عقبہ۔ ۴۔ عبدہ بنت عبد العزیٰ۔ ۵۔ بنت حمزہ بن عبد المطلب" انتہیٰ مختصراً۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل نازل کی: یاایھا الذین اٰمنوا اذا جاءکم المومنات مہاجرات فامتحنوھن۔ حتی بلغ بعصم الکوافر (اے ایمان والو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کا امتحان کر لیا کرو۔ آخر تک) قسطلانیؒ ابن کثیر کی متابعت میں کہتے ہیں کہ، اس روایت کے مطابق جس میں صلح نامہ کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے: " اور نہیں آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی فرد الخ" یہ آیت سنت کے لئے مخصص ہوگی اور یہ اسکی بہترین مثال ہے (کہ قرآن مجید سے سنت کی تخصیص صحیح ہے) اور بعض سلف کے طریقہ پر اس کے لئے ناسخ ہوگی، از قبیل نسخ سنت بالکتاب۔ اور جس روایت میں " نہیں آئے گا آپ کے پاس ہمارا کوئی آدمی الخ" کے الفاظ مروی ہیں اس کے مطابق اس میں کوئی اشکال ہی نہیں" اھ۔

ابن عربی احکام القرآن میں لکھتے ہیں: " واپسی کے معاہدے سے عورتوں کا خارج ہونا، اس معاہدہ کے عموم کی تخصیص تھی، اس کی تنسیخ نہیں جیسا کہ بعض نافہین کو وہم ہوا ہے" نیز آیت کے مسائل میں کہتے ہیں " تیسرا مسئلہ اس علت میں جس کی وجہ سے عورتوں کو واپس نہیں کیا گیا اگرچہ شرط کے عموم میں وہ بھی داخل تھیں، اور اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ ان کی نرم دلی اور ضعف کی وجہ سے، دوم یہ کہ حرمت اسلام کی وجہ سے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد: " نہ یہ ان کافروں کے لئے حلال ہیں، نہ وہ (کافر) ان (مسلمان عورتوں) کے لئے حلال ہیں" اس پر دلالت کرتا ہے، اور دونوں معنی صحیح ہیں اور جائز ہے کہ حکم دو علتوں کے ساتھ معلل ہو" آگے لکھتے ہیں " اور امتحان کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد قسم ہے اور دوسرا وہ جو صحیح میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے ساتھ ان کا امتحان کیا کرتے تھے" الخ مختصراً۔ میں کہتا ہوں کہ صلح نامہ کی تحریر کے آغاز میں گذر چکا ہے کہ اس ناکارہ کے نزدیک لا یأتیک منا رجل (نہیں آئے گا آپ کے پاس ہم میں سے کوئی آدمی) کی روایت زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ تفصیل سے گذر چکا ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے کیوں کہ اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

ابو بصیر کا قصہ: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ آگئے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور بخاری کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ کی واپسی سے قبل ہوا تھا۔ پس قریش کا ایک آدمی ابو بصیر (بفتح باء موحدہ وکسر صاد مہملہ) آپ کے پاس آیا۔ اس کا نام عتبہ (بضم عین مہملہ وسکون تاء) ہے اور بعض نے عبید

(بصیغۂ تصغیر) فرمایا ہے۔ مگر یہ وہم ہے، اور یہ بنی زہرہ کا حلیف تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث الباب میں "قریش کا آدمی" سے مراد ——— قریش کا حلیف ہے کیوں کہ زہرہ قریش کی ایک شاخ تھی، پس قریش نے اس کی طلب میں دو آدمی بھیجے، ابن سعد نے ایک کا نام خنیس (خاء معجمہ نون اور آخر میں سین مہملہ کے ساتھ، بصیغۂ تصغیر) ابن جابر ذکر کیا ہے، اور دوسرا اس کا غلام تھا جو "کوثر" کہلاتا تھا۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ۔ اخنس بن شریق اور ازہر بن عبد عوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط لکھا اور اپنے ایک غلام اور بنو عامر کے ایک شخص کو، جس کو دو اونٹ اجرت کے دیئے گئے تھے، یہ خط دے کر بھیجا۔ اخنس تو ابو بصیر کے قبیلہ بنو ثقیف کا ایک فرد تھا، اور ازہر کا تعلق ابو بصیر کے حلفاء بنو زہرہ سے تھا، اور دونوں کی طرف سے اس کی واپسی کا مطالبہ تھا" اور واقدی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ " یہ دونوں شخص ابو بصیر کے تین دن بعد آئے" اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حدیبیہ میں جو عہد آپ نے ہم سے ٹھہرایا تھا کہ ہمارے یہاں سے جو شخص آئے آپ اسے واپس کریں گے، اس کو پورا کیجئے، اور انہوں نے ابو بصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفاء عہد کی خاطر اسے ان دونوں کے حوالے کر دیا۔ حافظؒ کہتے ہیں کہ: ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر سے فرمایا: "تجھے معلوم ہے کہ ان لوگوں سے کن شرائط پر ہماری صلح ہوئی ہے، اور ہم معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اس لئے اپنی قوم میں واپس چلا جا۔ اس نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھے مشرکوں کی طرف واپس فرماتے ہیں جو مجھے دین سے بچلائیں گے اور مجھے سزائیں دیں گے؟ آپ نے فرمایا: صبر کر اور ثواب کی نیت رکھ، اللہ تعالیٰ جلد ہی تیرے لئے اس مخمصہ سے نکلنے کا راستہ پیدا فرما دیں گے"۔ اور ابو الملیح کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ " حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بصیر سے کہا، تو بھی آدمی ہے وہ بھی آدمی ہیں اور تیرے پاس تلوار موجود ہے۔ یہ اس کے قتل کی طرف اشارہ تھا" میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد " اور تیرے پاس تلوار ہے" میں غالباً دشمن کی تلوار مُراد ہے جو ذو الحلیفہ میں ابو بصیر نے اس سے طلب کی تھی، گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس بات پر برانگیختہ کیا کہ اسے جب بھی موقع ملے دشمن کی تلوار لے کر اس کا فیصلہ چکا دے۔ پس یہ دونوں شخص اس کو لے کر نکلے۔ یہاں تک کہ جب ذو الحلیفہ پہنچے تو وہاں اُتر کر کھجوریں کھانے لگے اور واقدی کی روایت میں ہے کہ جب ذو الحلیفہ پہنچے تو ابو بصیر مسجد میں داخل ہوئے، دو رکعتیں پڑھیں اور بیٹھ کر کھانا شروع کیا اور ان دونوں کو بھی کھانے کی دعوت دی، چنانچہ ان کے لئے دسترخوان بچھایا اور سب مل کر کھانے لگے، پس ابو بصیر نے ایک شخص سے کہا۔ ابن اسحٰق کی روایت میں مروی ہے کہ عامری کو کہا اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ

خنیس بن جابر کو کہا: واللہ تمہاری یہ تلوار تو بہت ہی عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے یعنی عامری نے جس کی تلوار تھی تلوار نیام سے
نکال کر کہا: ہاں: اللہ کی قسم! یہ بہت بہترین ہے، میں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ، جیسا کہ
زرقانی میں ہے: کہ میں دن رات اس شخص کو اس کے ساتھ ماروں گا۔ ابو بصیر نے کہا: ذرا مجھے دکھاؤ، دیکھوں
یہ کیسی ہے؟ اس نے تلوار اس کو پکڑا دی۔ پس ابو بصیر نے اس کو ایسی ماری کہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ "وہیں ٹھنڈا ہو گیا"
یہ موت سے کنایہ ہے، کیوں کہ میت کی حرکت سکون سے بدل جاتی ہے، کذا فی الفتح " اور عینیؒ کہتے ہیں کہ برودت موت
کو لازم ہے۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ: پس ابو بصیر اس پر چڑھ گیا، یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا"۔ ابن قیمؒ
قصہ کے فوائد میں لکھتے ہیں " کہ معاہدین نے جب اس کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد انہی نے
ان میں سے کسی کو قتل کر ڈالا تو وہ مقتول کا ضامن نہیں، نہ دیت کے ساتھ نہ قصاص کے ساتھ۔ اور امام بھی اس کا ضامن
نہیں۔ بلکہ اس کا حکم اس شخص کا ہے جو خود ان کے اپنے علاقہ میں قتل کیا گیا ہو، کیوں کہ اس پر امام کا حکم نافذ نہیں۔
چنانچہ ابو بصیر نے اس کو ذوالحلیفہ میں قتل کیا تھا، اگرچہ مدینہ کے زیر حکم ہے، مگر وہ اس کو اپنے قبضہ میں لے چکے تھے اور امام کی
ذمہ داری اور اس کے حکم سے نکل چکا تھا۔ اور دوسرا بھاگ گیا۔ اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ " غلام بھاگ نکلا"
اور ابن عائذ کی روایت میں ہے کہ: " وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، بایں کیفیت بھاگا کہ اپنے کپڑے کا نیچے کا حصہ
منہ میں دبا رکھا تھا اور شرمگاہ کا ایک حصہ ننگا ہو رہا تھا اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کنکریاں اس کے قدموں کے نیچے
اڑ رہی تھیں اور ابو بصیر اس کے پیچھے آ رہے تھے" حافظؒ کی پیروی میں زرقانی میں اسی طرح ہے۔ یہاں تک کہ
مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاً وکرامۃً) آیا تو بھاگتے ہوئے مسجد میں داخل ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے
دیکھ کر فرمایا: اس نے تو کوئی خوف کی بات دیکھی ہے" جب یہ بھگوڑا غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا
تو کہا: میرا ساتھی قتل کر دیا گیا اور مجھے بھی قتل کر دیا جائے گا" یعنی اگر تم لوگوں نے اس کو نہیں ہٹایا۔ اور واقدی
کی روایت میں ہے کہ: " میں تو بچ نکلا ہوں، میں نے اس کا بدلہ نہیں لیا" اور ابو الاسود کی روایت عروہ سے
مروی ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیر کو ان دونوں کے ساتھ واپس کر دیا انہوں نے اس کی مشکیں باندھ
لیں راستہ میں وہ کہیں سو رہے تھے۔ اس نے منہ سے تلوار لے کر ان رسیوں پر پھیری اور بندھن کاٹ ڈالی اور ایک
کے تلوار ماری اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھاگ نکلا" مگر پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ کذا فی الفتح۔ اتنے میں ابو بصیر
بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ پس عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ
کا ذمہ بری کر دیا قسطلانیؒ کہتے ہیں: قسم محذوف ہے اور جو عبارت ذکر کی گئی ہے۔ یہ قسم محذوف کی مؤکد ہے"

حافظؒ کہتے ہیں: "یعنی میں نے جو کچھ کیا ہے اس سلسلہ میں ان کی جانب سے آپؐ پر تو کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور واقدی نے زہری سے یہ فقرہ بھی روایت کیا ہے کہ: ابو بصیر نے کہا: یارسول اللہ! میں جانتا تھا کہ قریش کے پاس جاؤں گا تو مجھے دین سے برگشتہ کر دیں گے۔ اس لئے میں نے یہ کچھ کیا اور (معاہدہ تو اُن کے اور آپؐ کے درمیان ہے) میرے اور ان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں۔ آپؐ تو مجھے ان کی طرف واپس کر ہی چکے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن سے نجات دلادی۔ زرقانیؒ کہتے ہیں کہ ابن عقبہ کی روایت میں ہے کہ ابو بصیر مقتول کا سامان لے کر آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! اس کا خمس لیجئے: فرمایا: میں اس کا خمس لے لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا، لیکن تو جانے اور تیرے مقتول کا سامان، جہاں جی چاہے چلا جا، چنانچہ اس کے ساتھ جو پانچ مسلمان مکہ سے آئے تھے وہ بھی نکل گئے" اھ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ پانچ افراد ابو بصیر کے بعد مدینہ آئے تھے، کیوں کہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو بصیر تنہا آیا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دو شخصوں کے ساتھ واپس کر دیا جو اس کی طلب میں آئے تھے روایات کے سیاق یہی آیا ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا روایت میں راوی کا یہ کہنا کہ وہ پانچ آدمی بھی اس کے ساتھ نکل گئے اس سے مُراد دوسری مرتبہ مدینہ سے نکلنا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی ماں کی ہلاکت "وَیْلُ اُمِّہٖ" بضم لام، وقطع ہمزہ وکسر میم مشدد۔ یہ لفظ اصل میں بددعا کے لئے ہے۔ مگر یہاں تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی جنگ کی طرف اس کے اقدام کرنے، جنگ کی طرف جلد بازی کرنے اور جنگ کی آگ بھڑکانے پر تعجب کا اظہار مقصود تھا، اور ایک روایت میں یہ لفظ ہمزہ اور تخفیف کے ساتھ "وَیْلِمِہٖ" مروی ہے، یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور جوہری کہتے ہیں کہ جب یہ مضاف ہو تو صرف نصب ہی پڑھا جاتا ہے پوری تفصیل عینیؒ میں ہے، یہ جنگ بھڑکاتا ہے مِسْعَرُ حَرْبٍ "بکسر میم وسکون مہملہ وفتح عین مہملہ تمیز کی بنا پر منصوب ہے اور ابن اسحٰق کی روایت میں "مَحَشُّ حَرْبٍ" کا لفظ ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی وہ لکڑی جس سے آگ کو حرکت دی جاتی ہے۔ اگر کوئی اس کے لئے ہوتا۔ یعنی اگر کوئی شخص اس کی مدد اور پشت پناہی کرتا۔ کذا فی الفتح۔ عینیؒ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ لفظ "اگر" کا جواب محذوف ہے یعنی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کا کوئی ہمنوا ہو تو جو اس کی مدد کرتا اور تائید کرتا" اھ اور میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ لفظ "لو" تمنا کے لئے ہے اور ایک روایت میں ہے کہ "لو کان لہٗ رجال" یعنی کاش کچھ لوگ اس کے ہمنوا ہوتے، پس ابو بصیر نے اس تمنا کو سمجھ لیا اور چلا گیا۔ اس میں اس کے فرار کی طرف اشارہ تھا تاکہ

اسے مشرکوں کی طرف دوبارہ واپس نہ کرنا پڑے اور لطیف اشارہ اس طرف بھی تھا کہ جن مسلمانوں کو اس کی اطلاع پہنچے وہ آکر اس کے ساتھ مل جائیں۔ جمہور علماء شافعیہ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس کی تصریح صحیح نہیں البتہ تعریض جائز ہے جیسا کہ اس قصہ میں ہوا۔ یہاں تک کہ ابوبصیر سیف البحر پہنچ گئے۔ سیف بکسر مہملہ وسکون تحتانیہ اس کے بعد فاء۔ ساحل سمندر کو کہتے ہیں اور ابن اسحاق نے اس جگہ کی بھی تصریح کی ہے چنانچہ کہا ہے "یہاں تک کہ وہ عیص بکسر مہملہ وسکون تحتانیہ اس کے بعد صاد مہملہ" پہنچے اور یہ جگہ شام جاتے ہوئے اہل مکہ کے راستے میں تھی" کذا فی الفتح۔ اور خمیس میں ہے کہ سیف البحر ایک جگہ ہے جس کو عیص کہا جاتا ہے ساحل سمندر پر مروہ کی جانب واقع ہے، قریش ملک شام جاتے تھے تو یہ جگہ ان کے راستہ میں آتی تھی" اھ حافظؒ کہتے ہیں کہ یہ ساحل کی جانب مدینہ کے محاذات میں واقع ہے اور بنو سلیم کے علاقہ کے قریب ہے۔

ابوجندل کا ابوبصیر سے جا ملنا: راوی کہتے ہیں: "اور ابوجندل بن سہیل بھی ان سے یعنی اپنے باپ سے یا اہل مکہ سے چھوٹ کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہ وہی ابوجندل ہیں جن کو صلح کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سے واپس کیا تھا۔ حافظؒ کہتے ہیں: اس کو مشاہدہ حال کے ارادہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے مستقبل کے صیغے سے تعبیر کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابوجندل چھوٹ کر ستر مسلمان سواروں کی معیت میں بھاگ نکلے ابوبصیر سے جا ملے۔ پس انہوں نے ذی المروہ، یہ وادی القریٰ میں ایک بستی ہے۔ کذا فی المعجم۔ کے قریب قافلہ قریش کے راستہ پر ڈیرہ لگایا، چنانچہ ان کے قافلوں کو لوٹنا شروع کیا۔ کذا فی الفتح۔ زرقانی نے یہ اضافہ کیا ہے: کہ ابوبصیر اپنے رفقاء کو نماز پڑھاتے تھے، جب ابوجندل آئے تو چونکہ وہ قریشی تھے اس لئے امامت کے فرائض ان کے سپرد ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کی ایک جماعت وہاں جمع ہو گئی۔ عصابہ: اس کا کوئی مفرد اس کے لفظوں سے نہیں اور اس کا اطلاق چالیس یا اس سے کم پر ہوتا ہے، اور حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات چالیس سے کہیں زیادہ تھے، چنانچہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ وہ ستر افراد کے قریب پہنچ گئے تھے اور عروہ نے جزم سے کہا ہے کہ وہ ستر کی تعداد کو پہنچ گئے تھے اور سہیلی کا خیال ہے کہ وہ تین سو تک پہنچ گئے تھے اور عروہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "یہ لوگ آآکر ابوبصیر سے ملتے رہے اور انہوں نے مدتِ صلح میں مدینہ آنا پسند نہیں کیا اس خیال سے کہ کہیں انہیں مشرکوں کی طرف واپس نہ کر دیا جائے" زرقانیؒ کہتے ہیں "فتح الباری میں اسی طرح ہے مگر اس میں یہ بحث ہے کہ سہیلی نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ اس کے لئے معمر عن الزہری کا حوالہ دیا ہے۔ اور ابن عقبہ نے بھی اپنی مغازی میں اسی پر جزم کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ "ابوجندل کے ساتھ غفار، اسلم، جہینہ اور دوسرے قبائل کے لوگ جمع ہو گئے تھے یہاں تک کہ تین سو جنگی جوان جو سب مسلمان تھے جمع ہو گئے" اھ پس اللہ کی قسم! وہ قریش کے کسی قافلہ کی آمد کی خبر نہیں سنتے تھے مگر اس سے ضرور تعرض کرتے

یعنی اس کا راستہ روک لیتے اور آگے جانے سے منع کرتے، پس انہیں قتل کر دیتے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیتے اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ جو کافر بھی ہاتھ لگتا اسے قتل کر دیتے اور ان کے پاس سے جو قافلہ گزرتا اُسے لوٹ لیتے۔ پس قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا، اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے ابوسفیان بن حرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور نہایت منت و زاری سے درخواست کی کہ ابوجندل اور اس کے رفقاء کو اپنے پاس بُلالیں۔ اور جو شخص ہمارے پاس سے نکل کر آپؐ کے پاس آئے گا وہ آپؐ کے لئے بغیر حرج کے حلال ہے در آں حالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کا اور رشتہ قرابت کا واسطہ دے رہے تھے۔ یعنی وہ آپؐ سے کہہ رہے تھے ہم آپؐ کو اللہ تعالیٰ کا حق قرابت کا واسطہ دیتے ہیں کہ آپؐ اس کو اپنے پاس بلا بھیجیں پس جو شخص بھی آپؐ کے پاس آئے اس کو امن یعنی اجازت ہے۔ عینیؒ کہتے ہیں کہ لا بتشدید یعنی اِلّا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش نے کچھ درخواست نہیں کی بجز اس کے کہ آپؐ ابوبصیر اور ان کے رفقاء کو پیغام بھیجیں کہ وہ قریش کی ایذا رسانی سے باز رہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف پیغام بھیج دیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کے نام گرامی نامہ تحریر فرمایا، اور آپؐ کا نامہ مبارک اس وقت پہنچا جب کہ ابوبصیر نزع کی حالت میں تھے چنانچہ ان کا انتقال ـــــ میں اس وقت ہوا جب آپؐ کا نامہ مبارک ان کے ہاتھ میں تھا۔ ابوجندل نے ان کو وہیں دفن کر دیا اور ان کی قبر کے پاس مسجد بنائی۔ اور ابوجندل اپنے رفقاء سمیت مدینہ آگئے، بعد ازاں ہمیشہ وہیں رہا کرتے، یہاں تک کہ جہاد کے لئے ملکِ شام گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شہید ہوئے، راوی کہتے ہیں کہ جن حضرات نے مشورہ دیا تھا کہ ابوجندل کو اس کے باپ کے حوالہ نہ کیا جائے ان کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس چیز سے بہتر تھی جس کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ کذا فی الفتح۔

اور خمیس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل اور ابوبصیر کے نام تحریر فرمایا کہ وہ دونوں آپؐ کے پاس مدینہ آجائیں اور ان کے ساتھ جتنے مسلمان ہیں انہیں حکم دیں کہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں، اور قریش کا کوئی شخص یا قافلہ ان کے پاس سے گزرے تو اس سے تعرض نہ کریں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ابوبصیر اور ابوجندل کے پاس پہنچا، تو ابوبصیر کا آخری وقت آپہنچا، چنانچہ اُن کا انتقال ہو گیا تو ابوجندل اپنے چند رفقاء کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باقی لوگ اپنی اپنی جگہ واپس ہو گئے اور قریش کے قافلوں نے امن و سکون کا سانس لیا اور ابوجندل ہمیشہ آپؐ کے پاس رہے اور اس کے بعد جتنے غزوات ہوئے ان میں شریک ہوئے اور فتح مکہ میں بھی شریک ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واپس ہو گئے پس آپؐ کے پاس مدینہ میں رہے

تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ان کے والد ماجد سہیل بن عمروؓ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دورِ خلافت میں مدینہ آتے، ایک مہینہ رہے اس کے بعد جہاد کے لیے ملک شام کی طرف نکلے ان کے ہمراہ ان کے صاحبزادے ابوجندل بھی تھے۔ پس باپ بیٹا دونوں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ وہیں ان دونوں کا انتقال ہوا۔ رضی اللہ عنہما۔

حافظ قصۂ ابوبصیرؓ کے فوائد میں کہتے ہیں "ظالم مشرک کو حیلہ سے اچانک قتل کر دینا جائز ہے، ابوبصیر نے جو کچھ کیا اسے غدر (عہد شکنی) نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا، ابوبصیر اس میں داخل نہیں تھا، کیونکہ وہ اس وقت مکہ میں محبوس تھا، لیکن جب اسے اندیشہ ہوا کہ یہ مشرک اس کو مشرکین کے حوالے کر دے گا تو اس نے اس مشرک کو قتل کر کے اپنی ذات سے اس کے شر کو دفع کیا اور اس حیلہ سے اپنے دین کی مدافعت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، اور ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ "سہیل ابن عمرو کو عامری کے قتل کی اطلاع ہوئی تو اس نے مقتول کی دیت کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ اس کے قبیلے کا فرد تھا، مگر ابوسفیان نے اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ آپؐ نے تو اپنا عہد پورا کر دیا تھا، اور اس کو تمہارے قاصد کے سپرد کر دیا تھا، اور اس نے آپؐ کے حکم سے اس کو قتل نہیں کیا، اور ابوبصیر کے ذمہ بھی اس کی دیت نہیں کیونکہ وہ مقتول کے دین پر نہیں" اھ

اونٹ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مالک کی شکایت کرنا

اور یہ بات منجملہ عجائب کے ہے کہ میں نے اس زمانے میں خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے فرمائش کرتا ہے کہ میں عمرۂ حدیبیہ کے بیان میں اس اونٹ کا قصہ بھی ذکر کروں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مالک کی یہ شکایت کی تھی کہ وہ اس سے کام پورا لیتا ہے مگر اسے بھوکا رکھتا ہے۔ میں بیدار ہوا تو اس خواب سے حیرت ہوئی، کیونکہ ایک زمانے سے یہ بات دل میں راسخ تھی کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے، اور اونٹ کا مالک ایک انصاری شخص تھا، چنانچہ میں نے اپنے احباب سے اس کی تفتیش کیلئے کہا، مگر کسی کو یہ تصریح نہیں ملی کہ یہ واقعہ حدیبیہ کا ہے جو عمرۂ حدیبیہ میں پیش آیا ہو، اور میں خود ضعف بصر کی بنا پر تلاش اور تتبع سے معذور تھا، لیکن میرے حاشیۂ بذل میں ملا کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ یہ قصہ شفا۔ اور اس کی شرح میں مختلف طرق سے اور مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قصہ نہیں چنانچہ شفا اور اس کی شرح میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کی شکایت کرنے اور آپ کو سجدہ کرنے کے کئی واقعات مذکور ہیں، اور مشکوٰۃ میں حضرت یعلیٰ بن مُرّہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزیں (تین معجزات) دیکھی ہیں ایک یہ کہ ہم ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ ہمارا گذر ایک اونٹ کے پاس سے ہوا جس پر پانی لاد کر لایا جاتا تھا، پس جب اونٹ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اپنی گردن رکھ دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہر گئے اور دریافت فرمایا کہ اس اونٹ کا مالک کہاں ہے؟ وہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: "اس کو میرے پاس فروخت کر دو" اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اس کو آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں، اور بات یہ ہے کہ یہ اونٹ ایسے گھر کا ہے جس کے پاس اس کے سوا کوئی اور ذریعۂ معاش نہیں" فرمایا: "جب تو نے اس کا یہ قصّہ ذکر کیا ہے تو (ہم اس کو تم سے لینا نہیں چاہتے، مگر) اس نے شکایت کی ہے کہ اس سے کام زیادہ لیا جاتا ہے اور چارہ کم دیا جاتا ہے اس لیے (آئندہ اس کو شکایت کا موقعہ نہ دو) اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ" پھر ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک منزل پر اُترے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے — یہاں ایک درخت کے آنے کا قصّہ مذکور ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم آگے چلے، پس ایک پانی کے پاس سے گذرے تو ایک عورت آپ کے پاس اپنے بچے کو لاتی جس پر جنّات کا اثر تھا" الخ یہ حدیث صاحبِ مشکوٰۃ نے شرح السُّنّۃ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور ابھی تک مجھے اس سفر کی تعیین نہیں ملی۔ اور مُلّا علی قاریؒ نے اس کی شرح میں صرف یہ لکھا ہے: "تین چیزیں یعنی تین معجزات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھے۔ یعنی ایک ہی سفر میں" مگر سفر کی تعیین نہیں کی اور سیوطی نے الخصائص میں ایک فصل ان معجزات میں ذکر کی ہے جو حجۃ الوداع میں صادر ہوئے، اور ان میں یعلی بن مرّہ کی حدیث بروایت احمد وغیرہ نقل کی ہے، لیکن حدیث میں حج کا ذکر نہیں بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کا سفر کیا" الخ اور اس میں سفرِ حج اور عمرہ دونوں کا احتمال ہے۔ پس اگر اس واقعہ کا سفرِ عمرہ میں ہونا ثابت ہو تو کوئی مانع نہیں کہ اس کا عمرۂ حدیبیہ میں ہونا تسلیم کیا جائے البتہ اونٹ کو بھوکا رکھنے اور اس سے زیادہ کام لینے کا واقعہ بظاہر مدینہ میں پیش آیا، چنانچہ یہ قصّہ ابوداؤد نے کتاب الجہاد میں عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پیچھے سوار کیا، پس آپ انصار کے ایک شخص کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ تھا، جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بلبلایا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے" الخ اس حدیث کے آخر میں

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مالک سے فرمایا: اس نے میرے پاس شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور ہمیشہ کام لیتے ہو۔" پس اس سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مدینہ منورہ میں پیش آیا۔

تیسری فصل، عمرۂ قضا میں

حنفیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک محصر کے عمرہ کی قضا واجب ہے ان کے نزدیک یہ عمرۃ القضاء (مد کے ساتھ) کہلاتا ہے، اور شافعیہ اور ان کے موافقین جن کے نزدیک قضا واجب نہیں ان کے نزدیک یہ عمرۃ القضاء (بغیر مد کے) اور عمرۃ القضیہ کہلاتا ہے، حافظ ابن قیمؒ "الہدیٰ" میں کہتے ہیں: "دوم عمرۃ قضیہ۔ اس میں اختلاف ہے کہ گذشتہ سال جب عمرہ سے آپؐ روک دیئے گئے یہ اس کی قضا تھی یا یہ مستقل عمرہ تھا؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں امام احمدؒ سے دونوں روایتیں مروی ہیں، ایک یہ کہ یہ قضاء تھا، اور یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، دوم یہ کہ قضاء نہیں تھا اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، جو حضرات کہتے ہیں کہ یہ قضا تھا ان کا استدلال یہ ہے کہ اس کا نام ہی "عمرۃ القضا" ہے اور یہ نام تابع ہے حکم کے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہاں قضا کے معنی بدلہ ادا کرنے کے نہیں بلکہ قضا بمعنی مقاضات یعنی فیصلہ کے ہیں۔ چونکہ اس عمرہ کے ادا کرنے کا اہل مکہ سے فیصلہ ہوا تھا اس لیے اس کو عمرۃ القضا اور عمرۃ القضیہ کہا گیا" اھ

اور "زاد" میں ہے کہ اس کا نام عمرۃ القضیہ، عمرۃ القضاء اور عمرۃ القصاص ہے، زرقانی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کا نام عمرۃ الصلح بھی ہے جو الحاکم نے ذکر کیا ہے اور صاحب خمیس نے اس پر غزوۃ الامن کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا نام عمرۃ القضاء اس لیے ہوا کہ یہ اس عمرہ کی قضا تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا گیا تھا، اور ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کو عمرۃ القضاء اس لیے کہتے ہیں کہ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۶ھ میں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بدلہ لیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ سال اسی حرمت کے مہینے (شہر حرام) ذی القعدہ میں مکہ تشریف لے گئے جس میں انھوں نے روکا تھا، موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اسی عمرہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص"

میں کہتا ہوں کہ کون نہیں جانتا کہ اس کا نام عمرۃ القضاء بہ نسبت دوسرے ناموں کے زیادہ مشہور ہے اور

ابن قیمؒ کا الہدیٰ میں یہ کہنا کہ "جن حضرات کو بیت اللہ سے روکا گیا تھا ان کی تعداد چودہ سو تھی اور یہ سب حضرات عمرۃ القضا میں آپ کے ساتھ نہیں گئے تھے اور اگر یہ قضا ہوتی تو کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہتا" یہ کتب سیر کے خلاف ہے، چنانچہ تاریخ خمیس میں ہے: "اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ تمام مسلمان (عمرۃ قضا کے لیے نکلے جو گذشتہ عمرہ سے روک دیئے گئے تھے۔ پس جب اہل مکہ نے یہ سنا تو وہ مکہ چھوڑ کر نکل گئے" الاکتفاء میں اسی طرح ہے اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ جب ذی القعدہ کا چاند نظر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ اپنے اس عمرہ کی قضا کے لیے عمرہ کریں جس سے ان کو حدیبیہ میں روک دیا گیا تھا، اور جو لوگ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے، چنانچہ ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہا، بجز ان حضرات کے جو خیبر میں شہید ہو گئے تھے یا جن کا انتقال ہو چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکاء حدیبیہ کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے، چنانچہ عمرۃ القضا میں دو ہزار افراد تھے۔ اور مواہب میں ہے کہ "حاکم نے "الاکلیل" میں کہا ہے کہ اس مضمون کی روایات متواتر ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں جب ذوالقعدہ کا چاند دیکھا تو صحابہؓ کو حکم فرمایا کہ حدیبیہ میں مشرکین نے جس عمرہ سے روک دیا تھا اس کی قضا کے لیے عمرہ کریں، اور یہ بھی حکم فرمایا کہ شرکاء حدیبیہ میں سے کوئی ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے ماسوائے ان لوگوں کے جو خیبر میں شہید ہو چکے ہیں یا جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ واقدی کی روایت میں ہے کہ عرب کے کچھ لوگوں نے جو مدینہ میں حاضر تھے عرض کیا یا رسول اللہ! بخدا، نہ تو ہمارے پاس سفر خرچ ہے، نہ کوئی ایسا شخص ہے جو ہمیں کھانا کھلا سکے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور صدقہ کریں اور ان کے ہاتھوں کو ہلاکت سے بچائیں" الخ

<u>محصر کے ذمہ قضا واجب ہے یا نہیں؟</u> محصر کے ذمہ ہدی اور قضا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں ناقلین مذاہب کا اختلاف ہے، اور صحیح وہ ہے جو اوجز میں ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے تین قول ہیں ایک یہ کہ جس کو (احرام باندھنے کے بعد) عمرہ کے ادا کرنے میں رکاوٹ پیش آجائے۔ اس پر قضا بھی لازم ہے اور ہدی بھی یہ امام احمدؒ کی ایک روایت ہے بلکہ ان کی سب سے مشہور روایت یہی ہے۔ اور یہی حنفیہ کا مسلک ہے کہ اس کے ذمہ قضا اور ہدی لازم ہے۔ اور بعض لوگوں نے حنفیہ سے جو نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک اس شخص کے ذمہ ہدی لازم نہیں یہ غلط ہے، جو ان کی کتب فقہ کے خلاف ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے ذمہ قضا تو واجب نہیں مگر ہدی لازم ہے، یہ امام شافعی کا قول ہے اور امام احمدؒ کی ایک روایت ہے تیسرا قول یہ ہے کہ نہ اس کے ذمہ قضا واجب ہے نہ ہدی۔ یہ امام احمدؒ سے ایک روایت۔ اور امام مالکؒ کا صحیح مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہدی ساتھ لایا

ہوتواس کو ذبح کردے" اھ

عمرۃ القضاء کے لیے روانگی : حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے واپس ہوتے تو (مختلف اطراف کو) سرایا بھیجے اور خود مدینہ طیبہ میں تشریف فرما رہے، یہاں تک کہ جب ذوالقعدہ کا چاند ہوا تو لوگوں میں (عمرۂ قضا کے لیے) نکلنے کا اعلان فرمایا" اھ اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ "ابن اسحاق نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے مدینہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے، تو ربیع الاول سے شوال تک مدینہ میں اقامت پذیر رہے اور اس دوران حضرت صحابہؓ کے مختلف دستے جہاد کے لیے بھیجتے رہے، پھر ذوالقعدہ میں عمرۃ قضا کے لیے نکلے، اسی مہینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین نے روکا تھا" میں کہتا ہوں پس جب ذوالقعدہ سنہ ۷ھ کا چاند ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ قضا کے لیے روانہ ہوئے۔ اور لوگوں میں روانگی کا اعلان فرمایا، جیسا کہ ابن قیمؒ کے حوالے سے پہلے گذر چکا ہے۔ اور حکم فرمایا کہ جو لوگ پہلے حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ان میں سے کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہے چنانچہ ان میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہا، سوائے ان کے جو خیبر میں شہید ہو چکے تھے یا جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ جیسا کہ الاکلیل اور خمیس کے حوالے سے گذر چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے علاوہ دو ہزار مسلمان نکلے جیسا کہ زرقانی میں ہے۔ اور اس کو حافظؒ نے امام حاکم کی الاکلیل سے بھی نقل کیا ہے، اور تاریخ خمیس کے حوالے سے بھی یہی مضمون اوپر گذر چکا ہے۔ اور مدینہ طیبہ زادہا اللہ تکریماً وتعظیماً میں ابورُہم (بضم را وسکون ہا) کلثوم بن حصین الغفاری کو جو مشہور صحابی ہیں اپنا جانشین بنایا اور بقول ابن ہشام عویف بن الاضبط (ضاد معجمہ اور طا مہملہ کیساتھ) الدیلی کو۔ اور بلاذری نے کہا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جانشین بنایا، اور بقول بعض عویف کو، جو عوف کا مصغر ہے اور اس کو فا کے بجائے ثائے مثلثہ کے ساتھ "عویث" بھی کہا جاتا ہے۔ زرقانی میں اس طرح ہے اور تاریخ خمیس میں ابورُہم کا اور قاموس میں عویف بن الاضبط کا جانشین بنانا مذکور ہے۔

حضرت ناجیہؓ کو ہدی کا نگران مقرر کرنا : اور اپنے ساتھ ہدی کے ساٹھ اونٹ ہنکاتے۔ زرقانی اور تاریخ خمیس میں اسی طرح ہے، اور حافظ ابن کثیرؒ نے واقدی کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدی پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو مقرر کیا تھا، وہ ہدی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے درختوں میں چراتے جاتے تھے، اور ان کے ساتھ بنو اسلم کے چار جوان اور تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء میں قربانی کے ساٹھ اونٹ اپنے ساتھ لیے تھے" اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ہدی کے جانوروں کو قلادے پہناتے۔ اور اپنی ہدی

پر ناجیہ بن جندل اسلمی کو مقرر کیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے درختوں میں چراتے جا رہے تھے ان کے ساتھ بنو اسلم کے چار جوان تھے، اس کو واقدی نے روایت کیا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نے ہتھیار، زرہیں، خودیں اور نیزے اور سو گھوڑے بھی اپنے ساتھ لیے۔ پس جب ذوالحلیفہ پہنچے تو گھوڑے آگے بھیج دیئے اور محمد بن مسلمہ انصاری کو ان پر نگران مقرر فرمایا، اور مذکورہ بالا ہتھیار بھی آگے بھیج دیئے اور بشیر بن سعد کو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ عاصم کو ان کی نگرانی پر مامور فرمایا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ نے ہتھیار بھی ساتھ اٹھاتے حالانکہ ان کی شرط یہ تھی کہ آپ مکہ میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل نہیں ہوں گے، بجز نیام میں بند تلوار کے جو مسافر کا ہتھیار ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم ان کو حرم میں نہیں لے جائیں گے بلکہ وہ حرم کے قریب رہیں گے، خدانخواستہ ان کی طرف سے کوئی شرارت ہوئی تو ہتھیار ہمارے قریب تو ہوں گے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باب مسجد سے احرام باندھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرع کا راستہ اختیار فرمایا تھا، اگر یہ نہ ہوتا تو بیداء سے احرام باندھتے، اس کو واقدی نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے، اور محب طبری نے اس کو حضرت جابر سے بغیر حوالہ کسی کتاب کے ذکر کیا ہے، زرقانی میں اسی طرح ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے تلبیہ پڑھا اور محمد بن مسلمہؓ گھوڑے لے کر مرالظہران جا پہنچے جو قرب مکہ میں ایک وادی ہے، وہاں قریش کے چند آدمیوں سے ملاقات ہوئی، انھوں نے گھوڑے ساتھ لانے کا سبب پوچھا یہ بولے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل صبح سویرے یہاں آیا چاہتے ہیں، یہ لوگ قریش کے پاس گئے اور انہیں اس قصہ سے آگاہ کیا، وہ گھبرا گئے اور بولے واللہ! ہم نے تو کوئی نئی حرکت نہیں کی، ہم تو اپنی تحریر اور معاہدے کی مدت پر قائم ہیں پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو لے کر ہم پر کیوں چڑھائی کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مکرز نامی ایک شخص کو قریش کے چند لوگوں کے ہمراہ بھیجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت "بطن یاجج" میں صحابہؓ کے ہمراہ تشریف فرما تھے اور ہدی کے جانور اور ہتھیار بھی یہاں پہونچ گئے تھے ان لوگوں نے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کیا "آپ نے بچپن سے آج تک کبھی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اب آپ حرم میں اپنی قوم پر ہتھیاروں سمیت داخل ہوں گے؟ حالانکہ آپ نے ان سے شرط کر رکھی ہے کہ آپ صرف مسافر کے ہتھیار کے ساتھ داخل ہوں گے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان پر ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوں گا" یہ سن کر مکرز بولا: آپ اسی نیکی اور وفاء عہد کے ساتھ

معروف ہیں "پھر وہ اپنے رفقاء کے ساتھ واپس ہوا اور اہل مکہ سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو شرط تم لوگوں سے طے کر رکھی ہے وہ اس پر قائم ہیں"۔ یہ قصہ واقدی نے روایت کیا ہے (زرقانی میں اسی طرح ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرالظہران میں فروکش ہوتے، یہ مکہ کے قریب ایک وادی ہے۔ اور تاریخ خمیس میں ہے کہ "مرالظہران" کو "وادی فر" بھی کہا جاتا ہے"۔ اور بکری کے قول کے مطابق "وادی" اور مکہ کے مابین ۲۶ میل کا فاصلہ ہے اور بعض نے ۱۸ میل اور بعض نے ۱۲ میل ذکر کیا ہے (شفاء الغرام) اور مرالظہران سے موضع سرف تک سات میل ہے اور سرف سے مکہ تک چھ میل ہے"۔ اھ اور مکہ اور سرف کے مابین مسافت میں چند اقوال ہیں جو حجۃ الوداع میں گذر چکے ہیں، اور ہتھیار اپنے آگے بطن یاجج میں بھیج دیتے۔ یاجج: یا تحتانی، پھر ہمزہ ساکنہ، پھر دو جیم، اور پہلی جیم پر تینوں حرکتیں صحیح ہیں۔ یہ مکہ کے قریب ایک جگہ ہے جو مکہ سے آٹھ میل ہے، اور یہاں سے حدود حرم کے نشان نظر آتے ہیں۔ اور اوس بن خولی (بفتح خائے معجمہ وفتح واؤ) الانصاری الخزرجی کو دو سو رفقاء کی معیت میں ان کی نگرانی پر مامور فرما کر ان کو پیچھے چھوڑ کر مکہ تشریف لے گئے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ "پھر (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ عمرہ سے فارغ ہوتے تو) اتنے ہی اور آدمی ان کی جگہ بھیج دیئے، یہاں تک کہ سب حضرات نے عمرہ کے مناسک ادا کر لیے"۔ اور الخمیس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف، نحر اور حلق سے فراغت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند صحابہ کو حکم فرمایا کہ وہ اسلحہ کی حفاظت کے لیے بطن یاجج میں ٹھہریں، اور دوسرے لوگ جو اب تک اس مہم پر مامور تھے) آ کر مناسک عمرہ ادا کریں، چنانچہ صحابہؓ نے یہی کیا"۔ مواہب لدنیہ میں اسی طرح ہے۔

موضع سرف میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے موضع سرف میں بحالت احرام نکاح کیا اور الخمیس میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کہتے ہیں: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے فارغ ہوتے تو بقصد عمرہ عازم مکہ ہوتے، اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حبشہ سے آتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام نکاح دے کر پہلے بھیج دیا۔ حضرت میمونہؓ کی ماں شریک بہن اسماء بنت عمیسؓ حضرت جعفرؓ کے نکاح میں تھیں۔ پس حضرت میمونہؓ نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

احرام کی حالت میں تھے۔ اور آپؐ کی جانب سے ان کو چار سو درہم مہر ادا کیا گیا" اھ اس کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے یا ذوالحلیفہ سے روانہ کیا تھا، مگر یہ اس بارے میں صریح نہیں اور حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "بطن یاجج" پہنچے تو سارا سامان وہاں رکھ دیا، اور جعفرؓ بن ابی طالب کو حضرت میمونہؓ کی طرف نکاح کا پیغام دے کر روانہ کیا، انہوں نے پیغام پہونچایا تو حضرت میمونہؓ نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا، اور انھوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا" اھ اور ابن کثیرؒ نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ نیز الخمیس میں ہے کہ "ان کے نکاح کے قصہ میں یہ بھی مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام جحفہؓ میں ملاقات کی۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میمونہ بنت حارث بیوہ ہوگئیں ہیں، کیا آپ کو ان سے نکاح کی رغبت ہے؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام ان سے نکاح کیا" اھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت جعفرؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس بھیجنے اور حضرت عباس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نکاح کی سفارش کرنے کے مابین تعارض نہیں کیونکہ بظاہر حضرت عباس کی درخواست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کو حضرت میمونہؓ کے پاس نکاح کا پیغام دے کر بھیجا اس پر انھوں نے اپنا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد کر دیا۔ اور حضرت عباسؓ نے ان کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا دیا۔

میں کہتا ہوں کہ امام مالکؒ نے موطا میں سلیمان بن یسارؒ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم ابو رافعؓ کو انصار کے ایک شخص کی معیت میں روانہ کیا، ان دونوں نے حضرت میمونہؓ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مدینہ میں ہی تشریف فرما تھے، اور سفر کا آغاز نہیں فرمایا تھا" گذشتہ دونوں قول یعنی حضرت جعفر کو بھیجنا، اور حضرت عباسؓ کا نکاح کی درخواست کرنا ان ______ دونوں کے درمیان اور موطا امام مالک کی روایت کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان دونوں صاحبوں کو حضرت میمونہؓ کی رائے دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا، پھر حضرت عباسؓ نے جحفہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا درخواست کی تو آپؐ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے اپنا معاملہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تو

انھوں نے مقام سرف میں ان کا نکاح کیا۔

بحالت احرام نکاح کرنے کا حکم

اور یہاں ایک مشہور طویل الذیل فقہی بحث ہے کہ مُحرم کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ بذل اور اوجز وغیرہ شروح حدیث میں اس پر بہت تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مُحرم کا نکاح ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صحیح نہیں۔ اگر اس نے نکاح کیا تو وہ باطل ہوگا۔ اور حضرات حنفیہ اور ان کے موافقین کے نزدیک جائز ہے، اور اس باب میں جو ممانعت وارد ہے وہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے۔ اس لیے کہ وہ خلاف اولیٰ ہے کیونکہ یہ وقت اہم ترین عبادت میں مشغول ہونے اور ظاہر اور باطن کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانے کا ہے۔ اور حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بیان جواز کے لیے تھا، اور کسی فعل کو، باوجود کراہت کے، بیان جواز کی خاطر کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجر عظیم کا موجب تھا۔ جیسا کہ علماء کے ہاں معروف ہے۔ اور فریقین کے دلائل اور وجوہ ترجیح کی تفصیل بذل میں ہے، اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں۔ اور شیخ المشائخ گنگوہیؒ قدس سرہٗ نے کوکب میں اس پر بہت ہی عمدہ کلام کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: "ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب کہ نکاح باطل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح فعل سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس ایک روایت میں جو آتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے اس وقت نکاح کیا جبکہ آپؐ احرام کی حالت میں نہیں تھے" یہ یا تو غلط ہے یا مجاز پر محمول ہے کہ نکاح سے مراد مقاربت لی جائے کیونکہ تمام مورخین اور محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جاتے ہوتے موضع سرف میں یہ نکاح کیا تھا۔ اب کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام کے بغیر مکہ تشریف لے گئے تھے، جب سب کا اتفاق ہے کہ نکاح موضع سرف میں ہوا اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ جا رہے تھے، تو اندریں صورت یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت عدم احرام نکاح کیا ہو؟ اس مقام کے لطائف میں سے یہ ہے کہ اسی جگہ حضرت میمونہؓ کا نکاح ہوا اور مکہ سے واپسی پر اسی جگہ ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ اور بالآخر ایک سفر میں اسی جگہ ان کا وصال ہوا۔ اھ

میں کہتا ہوں کہ ان تینوں امور کا عجائبات میں سے شمار کیا جانا، جیسا کہ اہل تاریخ کو مسلّم ہے، اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہ تینوں واقعات تین الگ الگ اسفار میں پیش آتے ہوں۔ اور اگر نکاح اور رخصتی ایک ہی سفر میں ہوتی ہو تو اس میں کچھ بھی غرابت اور تعجب انگیز بات نہیں۔ نیز کتب تاریخ

اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رخصتی کا قصد فرمایا تھا اور اہل مکہ کو ولیمہ کی دعوت دی تھی۔ مگر انھوں نے قبول نہیں کی۔ تو کیا نکاح سے قبل ہی ولیمہ کا قصد فرمالیا تھا، چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے، جب چوتھے دن کی صبح ہوتی تو سہیل اور حویطب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آئے اور حویطب نے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ ابھی تک تم ہماری زمین سے نہیں نکلے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، اگر میں اس کی رخصتی تک ٹھہروں تو تمہارا کیا حرج ہے ---؟ ہم کھانا تیار کریں گے ہم بھی کھائیں گے اور تم بھی ہمارے ساتھ کھاؤ گے" اس پر انھوں نے کہا "ہم آپؐ کو اللہ تعالیٰ کا اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں" پورا قصہ آگے آتا ہے۔ اور یہ پورا قصہ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اور امام طحاوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ احرام حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا، پھر مکہ میں تین روز قیام پذیر رہے اور تیسرے دن حویطب قریش کے چند افراد کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی میعاد ختم ہو چکی، اس لیے یہاں سے نکل جائیے" الخ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخل ہونا اور کفّار کا مکہ چھوڑ کر باہر نکل جانا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہوئے اور مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف تلواریں حمائل کئے ہوئے تلبیہ پڑھ رہے تھے۔

اور کفارِ قریش یعنی ان کے اکابر واشراف خدا اور رسول سے عداوت کی بنا مکہ چھوڑ کر پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف نکل گئے۔ انہیں اس بات پر یارائے صبر نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کو طواف کرتے دیکھ سکیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ نفرت اور تکبّر کی بنا پر باہر نکل گئے کیونکہ انھیں غیظ و عداوت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا گوارا نہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی کے اونٹ آگے بھیج دیئے اور انھیں مکہ کے قریب وادی طوٰی میں رکھا گیا تاکہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عمرہ سے فارغ ہوں تو ان کو نحر کے لیے لایا جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثنیۃ کدا سے (مکہ میں) داخل ہوئے۔ کَدَا: بفتح اول و مد کے ساتھ۔ وہ گھاٹی جو حَجُون پر چڑھتی ہے اور حَجُون: بفتح حائے مہملہ۔ وضم جیم، اور واؤ اور نون کے ساتھ۔ مکہ میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور "ثنیۃ الوداع"

میں گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج اور عمرہ میں کدا سے داخل ہوتے تھے۔

عبداللہ بن رواحہؓ کے اشعار

اور عبداللہ بن رواحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی مہار تھام رکھی تھی ـــــ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ آپ کی رکاب تھامے ہوتے تھے۔ ممکن ہے کبھی مہار پکڑتے ہوں اور کبھی رکاب تھام لیتے ہوں اور کبھی آپؐ کے آگے آگے چلتے ہوں ـــــ اور تلوار حمائل کئے یہ رجزیہ شعر پڑھ رہے تھے

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ　　　الیوم نضربکم علی تنزیلہ

ضربًا یزیل الھام عن مقیلہ　　　ویذھل الخلیل عن خلیلہ

(ترجمہ)، اے کافروں کی اولاد! آپؐ کا راستہ چھوڑ دو، آج اس (قرآن کی تنزیل پر ہم تمہیں ماریں گے۔

اور ایسا ماریں گے کہ سر تن سے جدا ہو جائیں گے، اور دوست دوستوں کو بھول جائیں گے۔

ابن رواحہؓ کے اشعار کے سلسلہ میں مختلف روایات وارد ہیں، جیسا کہ الخمیس میں ہے اور حافظ نے یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف بیت اللہ کے وقت ذکر کئے ہیں۔ یہ اشعار سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر پڑھتے ہو؟" زرقانی کہتے ہیں: یعنی ان اشعار سے اعداء کا غصہ بھڑک جاتے تو حرم میں قتال کی نوبت آسکتی ہے یا یہ مطلب تھا کہ اس موقعہ پر شعر خوانی اس کمال ادب کے منافی ہے جس کے ہم عادی ہیں، خصوصًا عبادت کی حالت میں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: "اے عمر! ان کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ اشعار کفار کے لیے تیروں کی بارش سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں" اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابن رواحہ یہ پڑھو:

"لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ نصر عبدہٗ واعز جندہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اسی نے اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور اپنے لشکر کو عزت بخشی، اور جماعتوں کو تنہا شکست دی)۔

چنانچہ ابن رواحہؓ نے یہ کلمات کہے اور ان کے ساتھ مسلمانوں نے بھی یہ کلمات کہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ امام ترمذی اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا میں مکہ میں داخل ہوتے، اور عبداللہ بن رواحہؓ آپؐ کے آگے یہ شعر پڑھتے جا رہے تھے۔: خلوا بنی الکفار عن سبیلہ الخ پس حضرت عمرؓ نے

ان سے کہا کہ اے ابن رواحہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر کہتے ہو؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! ان کو کہنے دو۔ کیونکہ یہ شعر کافروں میں تیروں کی بارش سے بھی زیادہ اثر انداز ہیں" امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ "یہ حدیث اس سند سے حسن صحیح ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء میں مکہ میں داخل ہوتے۔ اور کعب بن مالک آپؐ کے آگے آگے تھے، اور بعض علماء حدیث کے نزدیک یہ دوسری حدیث زیادہ صحیح ہے، کیونکہ عبداللہ بن رواحہ جنگ موتہ میں شہید ہوتے اور عمرۃ القضاء اس کے بعد ہوا" اھ

امام ترمذی کا یہ کہنا کہ عمرۃ القضاء غزوہ موتہ کے بعد ہوا، وہم ہے۔ کیونکہ عمرۃ القضاء ۷ھ میں ہوا اور غزوہ موتہ ۸ھ میں۔ جیسا کہ معروف ہے، حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ ذہول شدید اور غلط مردود ہے۔ میں نہیں جانتا کہ امام ترمذیؒ باوجود معرفت کے باوجود اس غلطی میں کیسے جا پڑے، عمرۃ القضاء میں حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ اور زید بن حارثہؓ کا حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کے بارے میں جھگڑنا ایک معروف واقعہ ہے جیسا کہ آگے آتے گا، اور حضرت جعفرؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ ایک ہی معرکہ میں شہید ہوتے۔ آخر امام ترمذی پر ایسی چیز کیسے مخفی رہ گئی؟ بعد ازاں مجھے بعض لوگوں کی یہ تحریر ملی کہ ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث کے ذیل میں یہ لکھا ہے کہ "یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے" اگر یہ صحیح ہو تو امام ترمذی کا اعتراض بجا ہے، لیکن ترمذی کے راوی کروخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو نسخہ موجود ہے اس میں یہی عبارت ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔ واللہ اعلم" اھ میں کہتا ہوں کہ "بعض لوگوں" سے حافظ کی مراد غالباً حافظ ابن قیمؒ ہیں۔ کیونکہ انھوں نے الہدیٰ میں کہا ہے کہ "ترمذی وغیرہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے دن مکہ میں داخل ہوتے۔ درآنحالیکہ عبداللہ بن رواحہؓ آپؐ کے آگے آگے یہ شعر پڑھ رہے تھے: ـــــــ

خَلُّوْا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيْلِهِ مگر یہ وہم ہے کیونکہ ابن رواحہ مکہ کے فتح ہونے سے چار ماہ قبل جنگ موتہ میں شہید ہو چکے تھے، وہاں آپؐ کے سامنے ابن رواحہ کے شعر پڑھے جاتے تھے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس میں اہل نقل کا کوئی اختلاف نہیں" اھ اور کوکب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عمرؓ کے انکار کی وجہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر تلبیہ کہتے رہے یہاں تک کہ آپؐ نے اپنی چھڑی کے ساتھ رکن یعنی حجر اسود کا استلام کیا۔ درآنحالیکہ آپؐ نے اپنے کپڑے سے اضطباع کر رکھا تھا۔ (اضطباع کے معنی یہ ہیں کہ چادر کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے دونوں پلے بائیں

کندھے پر آگے پیچھے لٹکا لیے جائیں) ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ آپؐ نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ اپنے کندھے برہنہ رکھیں اور طواف میں تیز چلیں، تاکہ مشرکین کے سامنے ان کی قوت وطاقت کا مظاہرہ ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ممکن طریقہ سے ان کو مرعوب کرنے کی تدبیر کیا کرتے تھے۔ اور آپؐ نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا جیسا کہ ابن سعد اور واقدی نے ذکر کیا ہے، اور ان دونوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپؐ کو کوئی عذر نہیں تھا۔ اور ابن اسحاق وغیرہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدل طواف کیا، تین پھیروں میں تیز چلے اور باقی پھیروں میں اپنی معتاد رفتار سے چلے۔ اور مسلمان آپؐ کے ساتھ پیدل طواف کرتے تھے، زرقانی کہتے ہیں: "اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ عمرہ کیا، پس جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے طواف کیا اور ہم نے آپؐ کے ساتھ طواف کیا، اور آپؐ صفا و مروہ پر آتے تو ہم بھی آپؐ کے ساتھ آتے۔ اور ہم آپؐ کو اہل مکہ سے چھپاتے رکھتے تھے کہ کہیں کوئی شخص آپؐ پر تیر نہ پھینکے" اور ایک روایت میں ہے کہ "ہم آپؐ کو مشرکوں اور مشرکوں کے لڑکوں سے بچا رہے تھے کہ کہیں آپؐ کو ایذا نہ دیں" یہ دونوں روایتیں بخاری میں ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپ مکہ تشریف لاتے اور عمرۃ القضاء میں بیت اللہ کا طواف کیا تو ہم آپ کو احمقوں اور بچوں سے بچا رہے تھے کہ مبادا آپؐ کو تکلیف پہنچائیں" اھ درانحالیکہ انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اضطباع کر رکھا تھا (اضطباع کی تفسیر اوپر گذر چکی ہے) اور انھوں نے رمل کیا۔ رمل اور اضطباع کی بحث جزء حجۃ الوداع میں گذر چکی ہے، پس اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے کھڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو طواف کرتے دیکھ رہے تھے۔

رمل کا سبب اور اس کی ابتداء

اور خمیس میں بروایت بخاری حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ "مشرکین نے کہا کہ یہ لوگ تمہارے پاس آ رہے ہیں ان کو یثرب کے بخار نے لاغر کر رکھا ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ پہلے تین پھیروں میں رمل کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے مابین معتاد رفتار سے چلیں، اور تمام پھیروں میں رمل کا حکم دینے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی بجز اس کے کہ آپؐ ان پر شفقت کرتے ہوئے ان کی رعایت فرمانا چاہتے تھے" اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: رمل کرو تاکہ مشرکین تمہاری قوت کا مشاہدہ کریں اور مشرکین جبل قیقعانؓ کی جانب کھڑے تھے" اور اسد الغابہ میں ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اضطباع اور

رَمل کیا، اور یہ اسلام میں سب سے پہلا رَمل اور اضطباع تھا" اور اکتفاء میں ہے کہ قریش نے باہم چہ میگوئیاں کیں، جیسا کہ ابنِ اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ عسرت و مشقت اور سختی میں ہیں، پس وہ "دار الندوۃ" کے پاس صف باندھ کر بیٹھ گئے تاکہ آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو دیکھیں۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوتے تو اپنی رداء مبارک کے ساتھ اضطباع کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرماتے جو آج ان کافروں کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کرے" پھر آپؐ نے حجرِ اسود کا استلام کیا اور دوڑتے ہوتے نکلے اور حضراتِ صحابہ نے بھی آپؐ کے ساتھ دوڑ لگائی (یعنی رَمل کیا) یہاں تک جب آپؐ اُن سے بیت اللہ کی آڑ میں آتے اور رکنِ یمانی کا استلام کیا تو معتاد رفتار سے چلے، اور حجرِ اسود کا استلام کرنے کے بعد پھر رَمل کیا، تین پھیرے اسی طرح پورے کئے، اور باقی پھیروں میں عام رفتار سے چلے" فقط

میں کہتا ہوں کہ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ آئندہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ آئے تو صحابہ کرامؓ یثرب کے بخار کی وجہ سے لاغر تھے۔ پس مشرکوں نے کہا کہ تمہارے یہاں ایسے لوگ آرہے ہیں جن کو بخار نے لاغر کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے اس سے سخت تکلیف اٹھائی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گفتگو سے مطلع فرمایا، پس آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ وہ تین پھیروں میں رَمل کریں اور رکنِ یمانی اور رکنِ اسود کے درمیان عام رفتار سے چلیں، پس جب مکہ کے لوگوں نے ان کو رَمل کرتے دیکھا تو کہنے لگے کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم کہتے تھے کہ ان کو بخار نے کمزور کر رکھا ہے؟ یہ لوگ تو ہم سے بھی زیادہ قوی اور مضبوط ہیں۔ الخ" اور ایک روایت میں ہے کہ قریش کہتے تھے کہ یہ تو ہرنوں جیسے ہیں۔

زرقانی کہتے ہیں کہ "امام احمد نے ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمرہ میں "مرّ الظہران" میں اترے تو آپؐ کے صحابہ کو خبر ہوئی کہ قریش ان کے ضعف کے افسانے بیان کر رہے ہیں، پس انھوں نے کہا کہ اگر ہم اپنی سواریوں کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھائیں اور شوربا پیئں تو کل جب ان لوگوں کے یہاں جائیں گے تو تازہ دم ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایسا نہ کرو بلکہ اپنے توشے جمع کر کے میرے پاس لاؤ" چنانچہ انھوں نے جمع کر کے دسترخوان بچھاتے اور خوب کھایا اور کچھ کھانا باقی بچ رہا تو ہر ایک نے اپنے توشہ دان میں بھر لیا، اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی گفتگو سے مطلع کر دیا۔ پس آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ رَمل کریں۔ الخ"

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر صفا اور مروہ کے درمیان طواف کیا یعنی سعی کی، سعی کو طواف کہنا حق تعالیٰ کے ارشاد اَن یَطّوَّفَ بِھِما کی اقتداء کی بنا پر ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ہدی کے جانور "ذی طویٰ" میں چھوڑے گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف وسعی سے فارغ ہونے تک وہ آپؐ کے حکم سے مَروہ کے پاس لاتے جا چکے تھے۔ چنانچہ آپ جب سعی کے ساتویں پھیرے سے فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ نحر کی جگہ اور مکہ کا ہر گلی کوچہ منحر ہے" پھر آپؐ نے ان ساٹھ اونٹوں کو جو ساتھ لاتے تھے مَروہ کے پاس نحر کیا اور اسی جگہ حلق کرایا۔ صاحب امتاع نے ذکر کیا ہے کہ معمر بن عبداللہ العدویؓ نے آپؐ کا حلق کیا تھا۔ یہی عمل مسلمانوں نے کیا، واقدی کہتے ہیں کہ آپؐ کے ساتھ ان لوگوں نے بھی عمرہ کیا تھا جو حدیبیہ میں شریک نہیں تھے۔ مگر انھوں نے نحر نہیں کیا، اور جو لوگ حدیبیہ میں شریک تھے اور عمرۃ القضاء کے لئے بھی آتے انھوں نے ہدی میں اشتراک کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سو صحابہ کو ان کے طواف وسعی سے فارغ ہونے کے بعد حکم فرمایا کہ وہ "بطن یاجج" چلے جائیں، اور اسلحہ کی نگرانی کریں۔ اور دوسرے لوگ جو وہاں ہیں اور انھوں نے ابھی تک مناسک ادا نہیں کئے وہ آکر مناسک ادا کریں۔ چنانچہ آپؐ کے ارشاد کی تعمیل کی گئی۔

عمرۃ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوتے

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی شرط کیمطابق مکہ میں تین دن رہے، اور اس عمرۃ القضاء میں کعبہ کے اندر داخل نہیں ہوتے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ امام بخاری کی روایت ہے کہ "ایک شخص نے حضرت ابن ابی اوفیؓ سے دریافت کیا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے سال کعبہ میں داخل ہوتے، فرمایا: نہیں" اور واقدی کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء میں کعبہ کے اندر نہیں گئے۔ آپؐ نے ان کو پیغام بھیج کر اجازت طلب کی تھی۔ مگر انھوں نے یہ بات کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ آپؐ کی شرط میں یہ بات داخل نہیں تھی۔"

حضرت بلالؓ کا کعبہ کی چھت پر اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے

اور بیہقی نے بطریق واقدی ابن مسیبؒ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۃ القضاء میں جب طواف پورا کیا تو بیت اللہ کے اندر داخل ہوتے۔ بس وہیں رہے۔ یہاں تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کعبہ پر چڑھ کر ظہر کی اذان کہی" الحدیث اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ "عکرمہ، صفوان اور خالد بن اسید (بروزن ابیر) نے اس امر پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کے باپ مر چکے ہیں اور انھوں نے اس غلام کو کعبہ کی چھت پر (معاذ اللہ) گدھے کی طرح آواز لگاتے نہیں دیکھا" مگر یہ روایت وہم ہے، چنانچہ ابو یعلیٰ، ابن ابی شیبہ، ابن ہشام اور خود بیہقی نے دوسری سند سے اور دیگر حضرات نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ شریف میں داخل ہونا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اس کی چھت پر اذان کہنا فتح مکہ کا واقعہ ہے" اور بعض نے تصریح کی ہے کہ یہی مشہور ہے، اور واقدی کسی روایت میں منفرد ہو تو بھی قابلِ احتجاج نہیں چہ جائیکہ وہ دوسروں کے خلاف روایت نقل کرے، بالخصوص صحیح بخاری کی روایت کے خلاف؟" اھ

اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ "بیہقی نے بطریق واقدی اسی طرح ذکر کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت اللہ میں داخل ہونا عمرۃ القضا کا واقعہ ہے، مگر مشہور یہ ہے کہ یہ فتح مکہ کے سال ہوا۔ واللہ اعلم" اھ اور جزء حجۃ الوداع میں گذر چکا ہے کہ عمرۃ القضاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کعبہ میں داخل نہ ہونا اجماعی ہے۔ اور صحیح بخاری میں عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا، پس بیت اللہ کا طواف کیا۔ اور مقام ابراہیم (علیہ السلام) کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، اور آپؐ کے ساتھ وہ لوگ تھے جو آپؐ کو لوگوں سے (بچانے کے لیے) پردہ کر رہے تھے، پس ایک شخص نے ان سے (عبد اللہ بن ابی اوفیٰ) سے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوتے ہ؟ فرمایا: نہیں" اور شیخ لامع فرماتے ہیں: "یہ عمرۃ القضا کا واقعہ ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے اندر نماز نہیں پڑھی، کیونکہ اس کے اندر جو تصاویر آویزاں تھیں، ان کے ہٹانے اور مٹانے کی قدرت نہ تھی، اور ان کی موجودگی میں داخل ہونا جائز نہ تھا۔ اور اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مقامات متبرکہ میں جب کسی نوع کا کفر و شرک ہوتا ہو تو ان کی زیارت کو ترک کر دینا چاہیے" اھ اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ شیخ کا یہ ارشاد کہ "یہ عمرۃ القضا کا قصہ ہے" یہی واقعہ ہے، نووی کہتے ہیں کہ علماء نے کہا ہے کہ آنحضرت کے ترکِ دخول کا سبب یہ تھا کہ بیت اللہ میں اصنام و تصاویر تھیں اور مشرکین آپؐ کو ان کی تغییر کی اجازت نہیں دے سکتے تھے، پھر فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے تصاویر کو ہٹانے کا حکم فرمایا بعد ازاں بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، جیسا کہ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ پس جب چو تھا دن

ہُوا، اور خمیس میں ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہُوا تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپؐ کے پاس آئے اور کہا: آپؐ کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہاں سے تشریف لے جائیے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنے صاحب سے کہیے کہ ہمارے یہاں سے نکل جائیں۔ کیونکہ مدت ختم ہو چکی ــــ اس کے بعد صاحبِ خمیس کہتے ہیں: "پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے دن کی صبح کی تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبد العزیٰ آپؐ کے پاس آئے" ان کا یہ بیان گذشتہ بیان کے خلاف ہے کہ وہ چوتھے دن کی ظہر کے وقت آئے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی مجلس میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ پس حویطب نے چیخ کر کہا: ہم آپؐ کو اللہ تعالیٰ اور معاہدہ (حدیبیہ) کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپؐ ہماری سرزمین سے نکل جائیں۔ کہ تین دن گذر چکے ہیں۔" پس سعد نے کہا: "تو غلط کہتا ہے۔ تیری ماں نہ رہے۔ یہ نہ تیری زمین ہے نہ تیرے باپ کی، واللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنی خوشی سے جائیں گے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہُوئے فرمایا: اے سعد! ان لوگوں کو جو ہمارے ڈیرے میں ہماری ملاقات کو آتے ہیں، ایذا مت دو۔"

زرقانی کہتے ہیں کہ "یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن رہے۔ اس روایت کے منافی نہیں جو عروہ سے مروی ہے کہ جب چوتھے دن ظہر کا وقت ہوا تو سہیل آپؐ کے پاس آیا۔ الخ" چنانچہ حافظ، فتح میں کہتے ہیں کہ "غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں تشریف آوری دن کے نصف اوّل میں ہوتی ہوگی۔ اور کل وقت ملا کر چوتھے دن اسی وقت تین دن پورے ہوتے، جس وقت کہ آپ مکہ میں داخل ہوتے تھے۔ اور سہیل اور حویطب قریباً اسی وقت آ کر آپؐ سے مستدعی ہُوتے کہ آپؐ تشریف لے جائیں۔" اھ

آنحضرتؐ کا مکہ میں زفاف اور ولیمہ کا ارادہ کرنا اور اہلِ مکہ کا انکار کرنا

زرقانی کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے حویطب کو آپؐ کے مکہ سے نکالنے پر مامور کیا تھا، چنانچہ اس نے کہا: یہاں سے نکل جاؤ، آپ نے فرمایا: تمہارا کیا حرج ہے اگر تم مجھے رہنے کی اجازت دو تاکہ میں تمہارے یہاں رہ کر رخصتی کی رسم انجام دوں۔ اور ہم کھانا تیار کریں۔ اس میں تم لوگ بھی شرکت کرو، انہوں نے کہا ہمیں آپؐ کے کھانے کی حاجت نہیں، پس یہاں سے چلے جائیے۔" اور خمیس میں ہے کہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ سے فارغ ہو کر تین

دن مکہ میں رہنے، اہل مکہ سے تین ہی دن کی شرط ٹھہری تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو (کفار کے پاس یہ پیغام دے کر) بھیجا کہ اگر تم چاہو تو تمہارے پاس تین دن اور رہوں اور اپنی اہلیہ سے زفاف کروں۔ اور تمہیں ولیمہ کھلاؤں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ سے پہلے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا، اور ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اہل مکہ نے کہا: "ہمیں آپ کے ولیمے کی ضرورت نہیں، بس یہاں سے نکل جائیے" اس روایت سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آپؐ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا" اور حافظ ابن قیمؒ اور حافظ موسیٰ بن عقبہ کے الفاظ ابن کثیر کی نقل کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حویطب کے مطالبہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ ہیں: "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حویطب اور سہیل کو آواز دے کر فرمایا: میں نے تمہارے یہاں کی ایک خاتون سے نکاح کیا ہے۔ اس میں تمہارا کیا نقصان ہے کہ میں کچھ وقت مزید ٹھہروں یہاں تک کہ اس سے زفاف کروں، اور ہم کھانا تیار کریں گے، تم بھی ہمارے ساتھ مل کر کھاؤ گے" پس انھوں نے کہا: "ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کا اور معاہدہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ فوراً نکل جائیں" پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کو حکم دیا اور انھوں نے اُبطح سے کوچ کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے کسی مکان میں نہیں ٹھہرتے تھے۔"

آپؐ کا قیام اُبطح میں رہا

زرقانی کہتے ہیں: "واقدی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مکان میں نہیں ٹھہرتے تھے، بلکہ اُبطح میں آپؐ کے لیے چمڑے کا خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ آپؐ مکہ سے واپسی تک اسی میں رہے، اور مکہ کے کسی مکان کی چھت کے نیچے نہیں گئے" اور طبقات میں کوچ کے اعلان کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ "شام تک کوئی مسلمان یہاں مکہ میں نہ رہے"

مدینہ واپسی اور حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا قصہ:

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے، اور حضرت حمزہ کی صاحبزادی آپؐ کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ زرقانی نے اس بچی کے نام میں سات قول نقل کر کے حافظؒ کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کا مشہور نام اُمامہ ہے" زرقانی نے حافظؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے لیکن فتح الباری کے جو نسخے ہمارے پاس ہیں ان میں یہ ہے کہ "حمزہ کی صاحبزادی کا نام عمارہ یا فاطمہ یا اُمامہ یا امۃ اللہ یا سلمیٰ ہے، اور اول ہی مشہور ہے" یہ بچی آپؐ کو چچا چچا کہہ کر پکار رہی تھی، حافظ کہتے ہیں کہ غالباً اس نے تعظیم کی بنا پر آپ کو چچا کہا ہوگا، ورنہ آپؐ اس کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں، پس حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھا لیا۔ شیخ بذل میں

فرماتے ہیں کہ "اس روایت کا یہ بیان کہ حضرت علیؓ نے اس کو لے لیا۔ اس حدیث کے خلاف ہے جو پہلے گذر چکی ہے یعنی ابوداؤد میں کہ "حضرت زید بن حارثہؓ مکہ گئے اور حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو لاتے" الخ

دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مکہ سے تو سب سے پہلے زید بن حارثہؓ لاتے تھے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حافظ نے مغازی سلیمان تیمی سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اہل خانہ کی طرف واپس آتے تو حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کو پایا، اس سے دریافت کیا تو کیسے آئی؟ اس نے کہا آپ کے اہل میں سے ایک شخص مجھے لایا ہے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ میں پہنچی تو لوگوں میں گھومنے لگی اور آپ پر نظر پڑی تو "یا عم یا عم" کہتی ہوئی آپ کے پیچھے چل پڑی۔ پس حضرت علیؓ نے اس کو اٹھا لیا اور حضرت فاطمہؓ کے ہودج میں سوار کر دیا۔" اس کی تائید حافظؒ کے قول سے ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن سعد کی روایت میں بسند صحیح مروی ہے "اس اثناء میں کہ وہ لوگوں میں گھوم رہی تھی کہ حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت فاطمہؓ کے سپرد کر دیا۔" انتہی مختصراً۔ اور حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ لے اپنی چچازاد بہن کو پکڑ۔ اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا جب کہ وہ اپنے ہودج میں سوار تھیں، اس کو اپنے پاس رکھ۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔

اس بچی کی کفالت میں تنازعہ

پھر حضرت علی، حضرت زید، حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کا اس کی کفالت میں جھگڑا ہوا، اور یہ تنازعہ مدینہ آنے کے بعد ہوا تھا، جیسا کہ مسند احمد اور حاکم میں حضرت علیؓ کی حدیث سے واضح ہے۔ اور مغازی ابو الاسود میں عروہ سے مروی ہے کہ "جب مدینہ کے قریب پہنچے تو زیدؓ نے اس کے بارے میں آپ سے بات کی اور زیدؓ، حضرت حمزہؓ کے وصی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مواخات کی رو سے ان کے بھائی تھے۔" یہ روایت اس امر کے منافی نہیں کہ مخاصمت مدینہ میں ہوئی ہو، غالباً حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں درخواست کی ہوگی، اور منازعت بعد میں ہوتی ہوگی۔" (کذا فی زرقانی)

شیخ بذل میں فرماتے ہیں کہ محل خصومت میں اختلاف ہے۔ حافظ نے فتح میں کہا ہے کہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ کی مخاصمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں "مر الظہران" پہنچنے کے بعد ہوئی۔ بعد ازاں حافظ کہتے ہیں کہ "اس سلسلہ میں ان کی خصومت مدینہ آنے کے بعد ہوئی یہ مسند احمد اور حاکم میں حضرت علیؓ کی روایت سے ہے۔ اور مغازی ابو الاسود میں ہے کہ "(یہاں وہی گذشتہ بالا عبارت

ہے جو زرقانی کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے) اس کے بعد شیخ فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں اگر پہلا قول صحیح اور محفوظ ہو کہ خصومت مر الظہران پہنچنے کے بعد ہوئی تب بھی ان دونوں قولوں کے درمیان مخالفت نہیں، کیونکہ ممکن ہے منازعت پہلے مر الظہران میں ہوئی ہو جب کہ حضرت علیؓ نے اس کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا، کیونکہ یہ منازعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچی، پھر مدینہ پہنچنے سے پہلے حضرت زیدؓ نے آپؐ سے گفتگو کی، پھر مدینہ آنے کے بعد یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہوا اور اس وقت آپؐ نے فیصلہ فرمایا۔"

خالہ ماں کی مثل ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ جعفر کے حق میں فرمایا کیونکہ ان کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ اس بچی کی خالہ تھیں، اور آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسئلہ حضانت مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ جس کی تفصیل مطولات میں اور اوجز کی کتاب الاقضیہ" میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہے اور اس کا خلاصہ میرے حاشیۂ بذل میں ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: "اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کے بعد خالہ حضانت میں تمام اقارب سے مقدم ہے۔" آگے چل کر کہتے ہیں اس قصہ میں ان حضرات کے قول کی دلیل ہے جو خالہ کو پھوپھی پر اور ماں کی قرابت کو باپ کی قرابت پر ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچی کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں فرمایا، جب کہ اس کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اس وقت موجود تھیں۔ اور یہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے اور یہی ایک روایت امام احمدؒ سے مروی ہے اور ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ پھوپھی خالہ سے مقدم ہے اور یہی روایت ہمارے شیخ (حافظ ابن تیمیہؒ) کی مختار ہے۔ اسی طرح باپ کے رشتہ کی عورتیں ماں کے رشتہ کی عورتوں سے مقدم ہیں، کیونکہ بچے کی ولایت باپ کا حق ہے۔ اور ماں کو محض بچے کی مصلحت سے مقدم کیا گیا، کہ ماں میں کمال تربیت اور محبت و شفقت ہوا کرتی ہے۔ اور عورتیں پرورش کا کام مردوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ الخ"

موضع سرف میں حضرت میمونہؓ کی رخصتی - اور وفات پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام سرف پہنچے تو پڑاؤ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابو رافعؓ کو چھوڑ گئے تھے تاکہ وہ حضرت میمونہؓ کو لے کر آئیں۔ چنانچہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ہمراہیوں کے آنے تک آپؐ یہاں ٹھہرے۔ اور ان لوگوں کو مشرکین کے سفہا اور بچوں سے اذی اور مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کذا فی الہدی۔"

پس حضرت میمونؓ سے یہاں زفاف کیا اور خمیس میں ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا وارضاہا آخری خاتون ہیں جو حریم نبوت میں آئیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ امہات المومنین میں سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔ مگر ان کے سن وفات میں چند اقوال ہیں" زرقانی کہتے ہیں: "سن اکیاونؔ میں ان کی وفات ہوئی" اور حافظ نے ۱۱ھ میں ان کے سن وفات میں بہت سا اختلاف ذکر کیا ہے، اور وہ خود اس طرف مائل ہیں کہ ان کی وفات کے بعد حضرت عائشہ زندہ رہیں، اور خمیس میں ہے کہ یہ مکہ میں بیمار ہوئیں تو فرمایا کہ مجھے مکہ سے لے چلو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا تھا کہ میں یہاں نہیں مروں گی، چنانچہ ان کو مکہ سے اٹھا لائے، جب موضع سرف پہنچے تو اس درخت کے نیچے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شب زفاف میں قبہ نصب کرایا تھا، ان کو رکھ دیا، اسی جگہ ان کا وصال ہوا اور اسی جگہ ان کی قبر ہے" اھ حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں": پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موضع سرف سے رات کے آخری حصہ میں روانہ ہوئے، اور منزل بمنزل چلے یہاں تک کہ مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفا وکرما پہنچے" وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

چوتھی فصل، عمرہ جعرانہ میں

جعرانہ کا ضبطِ حرکات اور محلِ وقوع "جعرانہ" بکسرِ جیم و سکونِ عینِ مہملہ و تخفیفِ راء۔ اور بکسرِ عین و تشدیدِ راء" اور اوجز میں اس کی حرکات کے ضبط پر مفصل لکھا ہے۔ اور اس میں ہے کہ یاقوت حموی کہتے ہیں: "جیم کے کسرہ پر تو اجماع ہے مگر اصحابِ حدیث اس کی عین پر کسرہ اور راء پر تشدید پڑھتے ہیں" یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک کنواں ہے، جو مکہ سے قریب تر ہے، یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور کئی کنوئیں قریب قریب ہیں۔ اور یہ مکہ سے ایک برید کے فاصلہ پر عراق کے راستہ میں واقع ہے" اور باجی کہتے ہیں کہ اس کے اور مکہ کے مابین اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے"

فتحِ مکہ کیلئے روانگی کا سبب عمرۂ حدیبیہ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفارِ قریش نے اس شرط پر صلح کی تھی کہ دونوں فریقوں کے مابین دس سال تک لڑائی موقوف رہیگی۔ مگر قریش اپنی شرط پر قائم نہیں رہے بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حُلفاء بنو خزاعہ کے مقابلہ میں بنو نفاثہ کی خفیہ مدد کی، اس کے نتیجہ میں بنو خزاعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی درخواست کی، اور یہ صلحِ حدیبیہ کے ٹھیک بائیس مہینے بعد شعبان ۸ھ کا واقعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ دس رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان کو مکہ فتح ہوا۔ پس آپؐ وہاں پندرہ راتیں یا اس سے زیادہ مقیم رہے اور اس مدت میں مختلف اطراف کی جانب چھوٹے چھوٹے دستے (سرایا) بھیجتے رہے۔

غزوۂ حنین کے لیے روانگی بعد ازاں شوال کی دس تاریخ کو اہلِ مدینہ کا بارہ ہزار کا لشکر لے کر حُنین کی طرف روانہ ہوئے، مسلمانوں کو پہلے تو خود پسندی اور اپنی کثرت پر ناز کرنے کی وجہ سے ظاہری شکست کا ابتلا پیش آیا۔ مگر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے انہیں غلبہ نصیب ہوا۔ چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکری اور چار ہزار اوقیہ چاندی غنیمت میں ہاتھ آئی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے۔ اور اٹھارہ دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جعرانہ کی جانب) مراجعت فرما ہوئے۔ کذا فی المجمع

جعرانہ میں مال غنیمت کی تقسیم اور خمیس میں ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحنا، پھر قرن المنازل پھر نخلہ سے گزرتے ہوئے واپس لوٹے یہاں تک کہ جعرانہ آنکلے" اور اسی میں ہے: "پس ۵، ذی قعدہ کو جعرانہ آپہنچے۔ وہاں تیرہ دن قیام رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف جاتے ہوئے حکم فرما گئے تھے کہ جنگ حُنین میں حاصل شدہ قیدیوں اور مال غنیمت کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ یہ ساری چیزیں جعرانہ میں جمع کر دی گئیں تھیں" اور اسی جگہ مال غنیمت تقسیم فرمایا، چنانچہ امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ کیا، جہاں آپؐ نے حُنین کا مال غنیمت تقسیم فرمایا تھا۔"

وفد ہوازن کی آمد اور لامع کی کتاب الھبہ کے حاشیہ میں ہے کہ حافظؒ کہتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی میں یہ قصہ پوری تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوال میں طائف سے جعرانہ واپس ہوئے اور یہاں بنو ہوازن کے قیدی جمع تھے۔ ہوازن کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض اسلام حاضر ہوا۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام اور بیعت سے مشرف ہوئے پھر آپؐ سے اپنے قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں گفتگو کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مال اور قیدی سب تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ لیکن میں تمہاری خاطر ان کی واپسی کا مطالبہ کرونگا۔ مگر دونوں چیزوں میں سے کس کی واپسی تمہیں زیادہ محبوب ہے۔ قیدیوں کی؟ یا مال کی؟ (بس ایک چیز واپس کی جاسکتی ہے)۔ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ نے ہمیں مال اور حسب میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے، حسب ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ (یعنی مال کے بجائے قیدی واپس کئے جائیں)۔ فرمایا: "بنی ہاشم کے حصہ کے قیدی تو تمہارے رہے اور دوسرے مسلمانوں سے تمہاری خاطر گفتگو کرونگا"۔۔۔۔۔

یہاں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آخر میں ہے ـــــ "پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں نے تمہارے انتظار میں قیدیوں کی تقسیم میں تاخیر کی تھی۔ مگر تم نے آنے میں تاخیر کی" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو تقسیم کئے بغیر چھوڑ کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ کئی دن طائف کا محاصرہ رہا، پھر وہاں سے جعرانہ واپس ہوئے، پھر وہاں اموال غنیمت تقسیم کئے۔ اس کے بعد ہوازن کا وفد آیا۔"

زرقانی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس دن سے زائد تک جعرانہ میں بنو ہوازن کا انتظار

فرماتے رہے کہ وہ مسلمان ہو کر آئیں گے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور جعرانہ وہ جگہ ہے جہاں طائف اور مکہ سے مدینہ جانے کے دونوں راستے جمع ہوتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ میں حنین کے اموال غنیمت تقسیم فرمائے تھے۔

زرقانی کہتے ہیں کہ اہلِ مغازی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو حکم فرمایا کہ لوگوں کو جمع کیا جائے اور مال غنیمت لایا جائے۔ پھر آپؐ نے لوگوں میں مالِ غنیمت تقسیم کیا، چنانچہ ہر شخص کا حصہ چار اونٹ اور چالیس بکریاں لگا۔ پھر آپؐ نے وہاں سے عمرہ کیا۔" اور صاحب خمیس کہتے ہیں: "پھر آپؐ جعرانہ سے عمرہ کے لیے نکلے، اور باقی ماندہ "فے" کے بارے میں حکم فرمایا کہ اسے مرّ الظہران کی جانب مجنہ نامی جگہ پر رکھا جائے۔" پھر عمرہ سے فراغت کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "پھر واپس مدینہ کی طرف روانگی ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ "فے" کو ساتھ لیا۔" اور اس بات کو ابن ہشام نے ابن اسحاق سے بھی نقل کیا ہے۔

عمرۂ جعرانہ کا احرام باندھنا اور امام ابوداؤد نے محرش کعبی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں داخل ہوئے۔ پس وہاں جو مسجد تھی اس کی طرف آئے۔ پس جتنی رکعتیں اللہ کو منظور تھیں ادا کیں۔ پھر عمرہ کا احرام باندھا۔ واقدیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدھ کو احرام باندھا تھا جب کہ ذیقعدہ کی بارہ راتیں باقی تھیں۔ کذا فی التلخیص اور ابن قیمؒ کہتے ہیں: "عمرۂ جعرانہ اوّل ذی قعدہ میں ہوا۔ عینیؒ کہتے ہیں: "تیسرا عمرہ، عمرۂ جعرانہ ہے، اور یہ بھی ذیقعدہ میں ہوا۔ یہ عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کا قول ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ عمرۂ جعرانہ شوال میں ہوا۔ محب طبریؒ کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نہیں کہی اور مشہور یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا۔" کذا فی الاوجز۔

عمرۂ شوال کا مصداق اور اوجز ہی میں ایک جگہ شوال کے عمرہ پر مفصل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن قیم کہتے ہیں: "اگر یہ بات محفوظ ہو تو غالباً یہ عمرۂ جعرانہ کا واقعہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شوال میں نکلے تھے اور احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا۔" اور ابن ہمامؒ نے فتح میں اور قسطلانیؒ نے شرح بخاری میں بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ چنانچہ وہ دونوں کہتے ہیں: "اس میں اختلاف نہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے عمرے چار سے زائد نہیں تھے ۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کی تعیین کر دی ہے اور ان کو شمار کرکے بتا دیا ہے ۔ ان میں غیر ذی قعدہ کے کسی عمرے کا ذکر نہیں بجز اس عمرے کے جو آپؐ نے حج کے ساتھ کیا تھا ۔ پس جہاں تطبیق ممکن ہو تعارض دور کرنے کے لیے تطبیق دینا ضروری ہے ، اور جہاں تطبیق ممکن نہ ہو وہاں اصح و اثبت کے مقتضیٰ پر حکم کیا جاتا ہے ۔ اور یہاں عمرۂ جعرانہ مراد لیکر تطبیق ممکن ہے ۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی طرف شوال میں نکلے تھے اور عمرہ کا احرام ذیقعدہ میں باندھا تھا ۔ لہٰذا قرب کی وجہ مجازاً شوال کا مہینہ کہلایا ؛ اور اس تطبیق کی ضرورت جب ہے ۔ جبکہ شوال کا عمرہ صحیح اور محفوظ روایت سے مروی ہو ۔ ورنہ جو ثابت ہے وہی قابل اعتماد ہے ۔"

اوجز میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے کہ محققین کے نزدیک عمرۂ شوال کا محمل عمرۂ جعرانہ ہے ۔ اور اوجز میں یہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جعرانہ سے یہ احرام باندھنا متعدد وجوہ کے لیے محتمل ہے ۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کو ہی مقصد بنا کر اس کا ارادہ کیا ہو ۔ کیونکہ آپؐ اس وقت ان علاقوں سے مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کرنے والے تھے ، اس لئے ارادہ فرمایا کہ اس وقت آپؐ کا آخری عمل عمرہ ہو ۔ اس صورت میں آپؐ کے اس فعل میں اس امر کی دلیل ہے کہ جو شخص داخل میقات ہو اور وہ حج یا عمرہ کا ارادہ کرے تو اس کے احرام باندھنے کی جگہ وہی مقام ہے ، جہاں وہ موجود ہو ، چنانچہ حدیث میں ہے کہ "جو شخص میقات کے اندر ہو ۔ پس وہ جہاں سے حج یا عمرہ کا قصد کرے وہی جگہ اس کے لیے میقات ہے ۔"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مدینہ کی طرف واپسی کا وقت تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے ۔ اس صورت میں آپؐ احرام کے بغیر بھی مکہ میں داخل ہو سکتے تھے ۔ لیکن عمرہ کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھا اور خود عمرہ مقصود نہیں تھا ان کے علاوہ اور وجوہ بھی محتمل ہیں ۔

پس رات کو مکہ میں داخل ہوئے اور راتوں رات طواف اور سعی کی اور مروہ کے پاس عمرہ کا احرام کھولا ۔ صاحب خمیس کہتے ہیں کہ :" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا اور سعی کی اور اپنے سر کا حلق کرایا ۔ حلق کرنے والے کا نام ابو ہند ہے ۔"

حضرت معاویہؓ کی حدیث کا مصداق اور شارحِ حدیث کے یہاں معروف یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی یہ حدیث کہ "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کا قصر کیا مروہ کے پاس تیر کے پرسے کے ساتھ" اس کا محمل عمرۂ جعرانہ ہے۔ جیسا کہ جزء حجۃ الوداع میں گزر چکا۔ اور بخاری کے حاشیہ میں ہے کہ نوویؒ کہتے ہیں: "اور یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے) عمرۂ جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قصر کیا تھا۔ کیونکہ حجۃ الوداع میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قران تھا اور یہ ثابت ہے کہ منیٰ میں آپؐ نے حلق کرایا۔ اور عمرۃ القضاء پر محمول کرنا اس بنا پر صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے یہی مشہور ہے" الخ:

راتوں رات جعرانہ واپس آنا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات ہی کو جعرانہ واپس آ گئے چنانچہ جعرانہ میں اسی طرح صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے۔ تمام روایات میں صحیح روایت یہی ہے، اس کے برعکس ابوداؤد میں جو آیا ہے کہ "آپؐ نے مکہ میں صبح کی گویا رات یہیں رہے تھے" یہ وہم ہے جیسا کہ شیخؒ نے بذل میں کہا ہے کہ "صحیح وہ ہے جو ترمذی، نسائی اور احمد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ پس جعرانہ میں صبح کی مثل رات یہاں رہنے والے کے"

جعرانہ سے مدینہ کی طرف واپسی پس جب اگلے دن زوال آفتاب ہوا، بظاہر بدھ کا دن مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدھ کی رات احرام باندھا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، تو اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور بطن سرف کا رخ کیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے راستہ سے جا ملے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ راستہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرہے تھے راہ مدینہ سے آملا اور یہ بطن سرف ہے (جو جامع الطرق کہلاتا ہے) کیونکہ مکہ اور جعرانہ سے جو راستے مدینہ جاتے ہیں۔ وہ دونوں یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

جامع الطریق طریق المدینہ کی بحث میں کہتا ہوں کہ اس لفظ میں روایات کا اختلاف ہے۔ یہاں جو لفظ ذکر کیا گیا یہ ابوداؤد کا لفظ ہے، اور یہ زیادہ واضح ہے اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ کا لفظ یہ ہے: حتی جامع الطریق طریق المدینۃ (یہاں تک کہ جمع ہو گیا راستہ راہ مدینہ کے ساتھ) یعنی جس راستہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ سے تشریف لا رہے تھے وہ مدینہ کے راستہ کے ساتھ جمع ہو

گیا، اس روایت میں الطریق کا لفظ فاعل اور طریق مدینہ کا لفظ مفعول ہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں:
"خرج فی بطن سرف حتی جاء مع الطریق طریق جمع ببطن سرف" (آپؐ آ نکلے بطن سرف میں، یہاں تک کہ اس راستہ کے ساتھ وہ راستہ آملا جس نے بطن سرف میں (حرمین کے راستہ کو) جمع کر رکھا تھا۔)

اور شیخؒ کوکب میں فرماتے ہیں: "سرف ایک وسیع و عریض جگہ ہے جس میں مکہ اور جعرانہ سے مدینہ کو جانے والے دونوں راستے جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر راوی نے یہ کہا: "یہاں تک آیا اس راستے کے ساتھ" اور "اس راستہ" سے مراد جعرانہ کا راستہ ہے جس سے آنحضرت تشریف لا رہے تھے، اور لفظ طریق جاء کا فاعل ہے۔ اور جمع ببطن سرف اس کی صفت ہے اور جمع کا مفعول شاید محذوف ہے یعنی طریق الحرمین (یعنی جس نے جمع کیا تھا بطن سرف میں حرمین کے راستہ کو) پس دریافت کیا جائے۔"
اور اس کا نقشہ جو میں نے ۱۳۵۱ھ میں کوکب کے حاشیہ میں دیا تھا حسب ذیل ہے۔

مکہ — سرف — مغرب — مدینہ
جعرانہ — مشرق
طائف
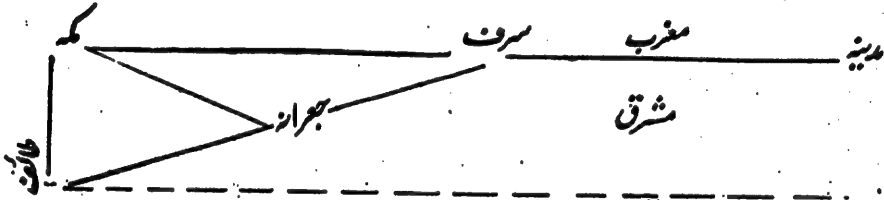
عتاب ابن اسیدؓ کو گورنر بنا کر مدینہ واپس آنا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور آنے سے پہلے حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور ان کے ساتھ معاذ بن جبلؓ کو۔ اور واقدیؒ اور حاکمؒ نے ابو موسیٰؓ کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ دونوں لوگوں کو قرآن اور فقہ فی الدین کی تعلیم دیں۔ ابن ہشامؒ کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عتابؓ کو مکہ کا حاکم مقرر کیا تو یومیہ ایک درہم ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ انہوں نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کا پیٹ ہمیشہ بھوکا رکھے جو ایک درہم کے باوجود بھوکا رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے ایک درہم یومیہ کا وظیفہ مقرر فرمایا ہے۔ اب مجھے کسی کی حاجت نہیں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو[۲] مہینے سولہ دن مدینہ سے باہر رہنے کے بعد اس وقت مدینہ میں تشریف لائے جب کہ ذیقعدہ کی تین[۳] راتیں باقی تھیں۔ اور ابن ہشامؒ نے کہا کہ چھ[۶] راتیں باقی تھیں اور حافظؒ فتح میں فرماتے ہیں کہ غیر حاضری کی مدت اسّی دن سے زیادہ تھی۔ واللہ اعلم۔ کذا فی الزرقانی۔

حضرت ابن عمر کا عمرۂ جعرانہ سے انکار اور یہاں اس امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ یہ عمرۂ جعرانہ اصحابِ مغازی و سیر مثلاً عروۃ ابن زبیر، موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن حبان اور واقدی وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع نے اس سے انکار کیا ہے؛ چنانچہ امام بخاریؒ نے بطریق ایوب نافع سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اور اگر کیا ہوتا تو عبد اللہ (بن عمر رضی اللہ عنہ) پر مخفی نہ رہتا۔ اور امام مسلمؒ نے اس سند سے نافع کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ابن عمرؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۂ جعرانہ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، جعرانہ سے آپؐ نے عمرہ نہیں کیا۔" ان دونوں بزرگوں نے جس چیز کی نفی کی ہے دوسرے حضرات نے اس کا اثبات کیا ہے اور اثبات، نفی سے مقدم ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں "یہ انکے علم کی نفی پر محمول ہے۔ یعنی ان کو اس کا علم نہیں، اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے عمرہ کیا تھا اور اثبات نفی سے مقدم ہے کہ اس میں زیادت علم ہے، اور امام مسلمؒ نے کتاب الحج میں حُنین کے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جعرانہ سے عمرہ کرنا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ذکر کیا ہے۔"

عمرۂ جعرانہ کی احادیث کی تخریج میں کہتا ہوں کہ حضرت انسؓ کی حدیث امام احمدؒ، شیخینؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کی ہے۔ اور عمرۂ جعرانہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں بھی آیا ہے جس کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ نیز حضرت جابرؓ سے بھی ثابت ہے جس کو بزارؒ اور طبرانیؒ نے اوسط میں روایت کیا ہے اور ہیثمیؒ نے کہا ہے کہ اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔ نیز حدیث محرش کعبیؓ سے ثابت ہے جسکو امام احمدؒ، حمیدیؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔ نیز حدیث خالد بن عبد العزیٰ ابن سلامۃ الخزاعی سے ثابت ہے اس کو حسن بن سفیان اور نسائیؒ نے "الکنیٰ" میں روایت کیا ہے جیسا کہ اصابہ وغیرہ میں ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "ان دو بزرگوں (ابن عمرؓ۔ نافع) کے علاوہ تمام اہلِ نقل، اصحابِ صحاح، اصحابِ سنن اور اصحابِ مسانید اس کی روایت پر متفق ہیں اور اس کو تمام اصحاب مغازی و سیر نے ذکر کیا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ خفاء کی وجہ وہ ہے جو محرش کعبیؓ کی حدیث میں مسندِ احمد اور جامع ترمذی میں مذکور

ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، رات ہی کو مکہ گئے اور راتوں رات عمرہ کر کے واپس جعرانہ پہنچ گئے۔ اور وہاں اس طرح صبح کی گویا رات وہیں رہے تھے" الخ۔ اسی روایت میں ہے کہ "اسی وجہ سے آپؐ کا یہ عمرہ لوگوں سے مخفی رہا" اور امام احمد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ محرشؓ فرماتے ہیں "پس اسی وجہ سے آپؐ کا یہ عمرہ بہت سے لوگوں سے مخفی رہا" عینی کہتے ہیں "نافع کا قول حجت نہیں کیونکہ ابن عمرؓ کو جتنی احادیث معلوم تھیں وہ ساری انھوں نے نافع سے بیان نہیں کر دی تھیں؛ نہ یہ ضروری تھا کہ جتنی انھوں نے بیان کیں وہ سب نافع کو یاد بھی رہی ہوں، نہ یہ ضروری تھا کہ جتنے امور ابن عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں آئے ہوں ان میں سے ایک حدیث بھی ان کے حافظہ سے نہ اتری ہو۔ اور جعرانہ کا عمرہ اسقدر مشہور اور ظاہر ہے کہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

پانچویں فصل، متفرقات میں

یعنی عمرہ کے ابواب میں جو سقیم روایات مروی ہیں ان پر بحث اور دیگر مباحث؛

بحث اوّل عمرۂ رجب میں امام بخاریؒ وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ان میں سے ایک رجب میں ہوا اور حضرت عائشہؓ نے ان پر انکار کرتے ہوئے فرمایا؛ "اللہ تعالیٰ ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمرؓ پر رحم فرمائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے عمرے کئے وہ ان سب میں حاضر تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کبھی عمرہ نہیں کیا" اور اوجز میں چار عمروں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "روایات حدیث میں مزید دو عمروں کا ذکر آتا ہے، ایک عمرۂ رجب جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے صحیحین وغیرہ میں مذکور ہے۔ حافظ کہتے ہیں، ابن عمرؓ نے اس کا ذکر کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابن عمرؓ پر انکار کیا ہے۔ اور عینی کہتے ہیں؛ ابو عبدالملک نے کہا ہے کہ یہ ابن عمرؓ کا وہم ہے کیونکہ باجماع مسلمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین (مستقل) عمرے کئے اور اسی طرح ابن قیمؒ نے "الہدیٰ" میں لکھا ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا وہم ہے۔

عینی کہتے ہیں؛ "اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی نفی کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ

نے اس کا اثبات کیا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ابن عمرؓ کے حق میں فیصلہ کیوں نہ کیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ ثابت کرنا کہ رجب میں عمرہ کیا۔ اس کے معارض ایک دوسرا اثبات ہے کہ آپؐ نے ذی قعدہ میں عمرہ کیا، لہٰذا دونوں ایک وقت کی نفی کرتے ہیں اور دوسرے وقت کا اثبات کرتے ہیں، پس حضرت عائشہؓ نے اگرچہ رجب میں ہونے کی نفی کی ہے، مگر ذیقعدہ میں ہونے کا اثبات کیا ہے۔ اور پھر حضرت عائشہؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ تینوں متفق ہیں کہ آپؐ کے عمروں کی تعداد چار سے زائد نہیں اور حضرت عائشہؓ عمرۂ حج کے علاوہ تینوں عمروں کا ذلقعدہ میں ہونا ثابت کرتی ہیں، لہٰذا حضرت عائشہؓ کا اثبات مقدم ہے، کیونکہ ابن عباسؓ کا اثبات بھی اسکا مؤید ہے اور عمرۂ رجب کے اثبات میں ابن عمرؓ متفرد ہیں۔ مزید برآں یہ کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرۂ رجب کی نفی کی تو ابن عمر اس پر خاموش رہے۔ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی طرف رجوع ضروری ہوا۔"

اور نووی کہتے ہیں: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار پر ابن عمر رضی اللہ عنہ کا سکوت اختیار کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خود انہیں بھی اشتباہ ہوگیا تھا، یا وہ بھول گئے تھے، یا انہیں شک ہوگیا تھا" الخ۔ ابن عابدینؒ کہتے ہیں: "بعض نے ملا علی قاری کے رسالہ موسومہ "الادب فی رجب" سے نقل کیا ہے کہ رجب میں عمرہ کا سنت ہونا بایں معنیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا یا اس کا حکم فرمایا ہو ثابت نہیں۔ البتہ یہ مروی ہے کہ ابن زبیرؓ جب کعبہ کی تعمیر کی تجدید سے ۲۷ رجب سے قبل فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے اونٹ کا نحر کیا۔ اور کئی بکرے ذبح کئے اور اہل مکہ کو عمرہ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ اور اس میں شک نہیں کہ صحابہ کا فعل حجت ہے اور جس چیز کو (اس قسم کے) مسلمان مستحسن سمجھیں وہ عند اللہ مستحسن ہوتی ہے۔ پس یہ وجہ ہے کہ اہل مکہ ماہ رجب میں خصوصیت سے عمرہ کرتے ہیں۔"

اور شیخ ابن قیمؒ مبسوط کلام کے بعد فرماتے ہیں: "مقصود یہ ہے کہ طریقۂ مشرکین کی مخالفت کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمرے حج کے مہینوں میں کئے کیونکہ مشرکین حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا ناجائز سمجھتے تھے اور اس کو افجر فجور (سب سے بڑی بدکاری) کہتے تھے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا رجب کے عمرے سے بلاشبہ افضل ہے۔

بحث دوم: عمرۂ شوال | امام مالکؒ نے مؤطا میں ہشام بن عروہؓ کی سند سے
حضرت عروہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے (مستقل طور پر) صرف تین عمرے کئے ان
میں سے ایک شوال میں تھا۔ یہ روایت امام محمد نے بھی مؤطا میں نقل کی ہے۔ اور اوجز میں ہے کہ
"یہ روایت مؤطا میں مرسل ہے مگر ابوداؤد نے اس کو حضرت عائشہ سے موصولاً روایت کیا ہے"
حافظ کہتے ہیں: اس کو سعید بن منصور نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے صرف تین عمرے کئے۔ ان میں ایک شوال میں ہوا، لیکن حضرت عائشہؓ کا قول کہ ایک شوال میں ہوا
اس کے معارض دوسروں کا قول یہ ہے کہ ذی قعدہ میں ہوا۔ اور ان دونوں کے درمیان تطبیق
یہ ہو سکتی ہے کہ یہ آخر شوال اور اوّل ذی قعدہ میں ہوا ہو، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے
جو ابن ماجہ نے بسند صحیح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے کہ آنحضرت نے کوئی عمرہ نہیں کیا
مگر ذیقعدہ میں" ابن قیم کہتے ہیں: "یہ حدیث مرسل ہے اور غلط بھی، یہ غلطی یا ہشام کو ہوئی یا عروہؓ
کو۔ اور ابوداؤد نے اس کو مرفوعاً حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور وہ بھی غلط ہے۔ اس
کا رفع بھی صحیح نہیں" ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ "جو مسند روایات امام مالکؒ سے صحتِ نقل سے ثابت
ہیں یہ روایت ان میں شامل نہیں" اور ابن قیمؒ کہتے ہیں: "اور حضرت عائشہؓ سے اس حدیث کے
باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ابن عباسؓ ان تینوں کا بیان ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قعدہ کے سوا کبھی عمرہ نہیں کیا۔ اور یہی صحیح ہے" پوری
تفصیل اوجز میں ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ "اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ جمہور نے عمرۂ شوال
کو مجازاً عمرۂ جعرانہ پر محمول کیا ہے"
اور جعرانہ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ بر تقدیر صحتِ روایت، محققین کے نزدیک عمرۂ شوال
کا محمل عمرۂ جعرانہ ہے اور اوجز میں ہے کہ "بعض نے عمرۂ شوال کو عمرۂ حدیبیہ پر محمول کیا ہے۔ مگر
یہ مناسب نہیں ہے۔ اور حاشیۂ ابوداؤد میں ہمارے شیخ المشائخ شاہ محمد اسحٰق دہلوی قدس سرہٗ
سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ کا یہ ارشاد کہ "ایک عمرہ شوال میں ہوا" یہ عمرۂ جعرانہ کی طرف اشارہ
ہے جو ذی قعدہ میں ہوا۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حُنین کی طرف تشریف لے جانا شوال
ہی میں ہوا تھا۔ اور حُنین سے واپسی پر اسی سال اسی سفر میں یہ عمرہ ہوا۔ اس لیے اسے شوال کی طرف

منسوب کر دیا اگرچہ ہوا ذی قعدہ میں "۔

بحث سوم ؛ عمرۂ رمضان | باقی رہا رمضان کا عمرہ ؟ تو اوجز میں عمرۃ القضا کے بیان میں ہے کہ "ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ یہ رمضان میں ہوا تھا، محب طبری نے کہا ہے کہ "یہ بات ابن حبان کے سوا کسی نے نقل نہیں کی۔ اور مشہور یہ ہے کہ ذیقعدہ میں ہوا" اور زرقانی میں ہے کہ "ابن قیمؒ نے اس امر کا انکار کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ رمضان میں بھی کیا تھا۔ البتہ دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ " میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے گئی تھی، پس آپؐ نے افطار کیا اور میں نے روزہ رکھا۔ اور آپؐ نے قصر کی اور میں نے پوری نماز پڑھی" دار قطنی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے اور ابن قیمؒ نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں کوئی عمرہ نہیں کیا، یہ بات حافظ نے نقل کی ہے۔ اور مصنفؒ (صاحب مواہب) نے اپنے قول میں ان ہی کی پیروی کی ہے کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول "فی رمضان" "خرجت" سے متعلق ہے (یعنی سفر رمضان میں ہوا تھا)، اور اس سے مراد فتح مکہ کا سفر ہے۔ کہ رمضان ہی میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال فتح کے بعد جعرانہ سے عمرہ کیا تھا۔ فتح کے بعد غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کے لیے تشریف لے گئے۔ پھر حنین کے غنائم تقسیم فرمائے اور بعد ازاں عمرہ ادا کیا۔ مگر وہ ذی قعدہ میں کیا تھا۔" اور حافظؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "یہ حدیث دار قطنی نے ایک اور سند سے بھی ذکر کی ہے۔ اور اس میں رمضان کا ذکر نہیں "۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی دار قطنی کی اس حدیث کا انکار کرتے ہوئے اس پر مفصل کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس حدیث کے رد کرنے کے وجوہ مفصل ذکر کئے ہیں۔

البتہ یہاں ایک بات باقی رہ گئی کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرۂ رمضان کی فضیلت بیان فرمائی۔ مگر خود رمضان میں عمرہ نہیں کیا۔ چنانچہ اوجز میں ہے کہ حافظؒ کہتے ہیں: " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اشہر حج ہی میں عمرے کئے، اور رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت حدیث الباب سے ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے افضل کیا ہے ؟ جو بات میرے لیے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے لیے تو رمضان میں

عمرہ کرنا افضل ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اس چیز کے جواز کو بیان کرنے کے لیے تھا، جس سے اہل جاہلیت منع کیا کرتے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قول وفعل کے ذریعہ ان کی تردید کا ارادہ فرمایا اور یہ چیز اگر دوسروں کے لیے مکروہ بھی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وہی افضل تھی۔" اور صاحب الہدی کہتے ہیں: "احتمال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایسی عبادت میں مشغول رہا کرتے ہوں جو عمرہ سے بھی افضل ہو، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی مشقت کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عمرہ کرتے تو لوگ بہرحال اس کی طرف سبقت کرتے، جبکہ انہیں عمرہ اور روزہ جمع کرنے سے مشقت لاحق ہوتی۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمل کرنا چاہتے تھے، مگر صرف اس بنا پر ترک فرما دیتے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔ اور ان کی مشقت کا اندیشہ عمل سے مانع ہو جاتا تھا۔"

شیخ ابن ہمام نے بھی اس پر جزم کیا ہے اور اس کی کچھ بحث جزء حجۃ الوداع کے آخر میں گزر چکی ہے۔

فوائد

پہلا فائدہ: عمرہ کے لیے حِل کی طرف نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

حافظ ابن قیمؒ کہتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرات میں سے کوئی عمرہ ایسا نہیں جو مکہ سے باہر نکل کر کیا گیا ہو۔ جیسا کہ آجکل بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عمرات باہر سے مکہ میں داخل ہو کر کئے گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہے مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس مدت میں کبھی مکہ سے باہر جا کر عمرہ کیا ہو۔ لہذا جو عمرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا اور جس عمرہ کو مشروع فرمایا وہ صرف ایسا عمرہ ہے جو باہر سے مکہ میں داخل ہونیوالا ادا کرے، نہ کہ اس شخص کا عمرہ جو مکہ میں مقیم ہو اور عمرہ کرنے کیلئے حل کی طرف نکل جائے۔ اس قسم کا عمرہ آپؐ کے دور میں کبھی کسی نے نہیں کیا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام رفقاء میں سے تنہا حضرت عائشہؓ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ انہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ چونکہ انکو ماہواری کا عذر پیش آگیا تھا اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے عمرہ پر

حج کا احرام باندھ کر قران کر لیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا کہ ان کا طواف بالبیت اور صفا و مروہ کی سعی انکے حج و عمرہ دونوں کے لیے کافی ہوگی۔ مگر انکے دل میں یہ کھٹک تھی کہ دیگر امہات المومنین تو مستقل حج اور مستقل عمرہ کر کے واپس جارہی ہیں کیونکہ ان کا تمتع تھا۔ اور انہیں ماہواری کا عارضہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ انہوں نے قران کیا تھا۔ اور یہ ایسے عمرہ کے ساتھ واپس ہوں گی جو بضمن حج ادا کیا گیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلجوئی کی خاطر ان کے بھائی کو حکم فرمایا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرالائیں۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حج میں تنعیم سے عمرہ نہیں کیا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور رفیق نے "۔۔۔ میں کہتا ہوں: ابن قیمؒ نے تو یہی کہا ہے، اور زرقانیؒ نے ان کا کلام نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمرہ کیا تو یہ اس کی مشروعیت کی دلیل ہے، اس کے بعد ابن قیمؒ کا سارا کلام بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ اور الفاکہی نے محمد بن سیرین کی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنعیم کو میقات مقرر فرمایا ہے" اور حضرت عطا سے نقل کیا ہے کہ: "جو شخص عمرہ کرنا چاہے خواہ وہ اہل مکہ سے ہو یا ان کے علاوہ۔ اسے چاہیئے کہ تنعیم یا جعرانہ کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے" اور موطا میں ہے کہ امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اہل مکہ میں سے ایک شخص عمرہ کرنا چاہتا ہے کیا وہ مکہ کے اندر ہی سے عمرے کا احرام باندھے ؟ فرمایا! نہیں بلکہ حِلّ کی طرف نکل جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔ اور اوجز میں ہے کہ جمہور اس کے قائل ہیں کہ احرام عمرہ کے لیے مکہ والوں کا میقات حِل ہے۔

موفقؒ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگرچہ علماء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ احرام کے لیے سب سے افضل جگہ کونسی ہے، اور حِلّ کی طرف نکلنے کے وجوب کی تصریح، حافظؒ، قسطلانیؒ، طیبیؒ، قاریؒ، نوویؒ، ابیؒ اور شوکانیؒ وغیرہ نے کی ہے۔ اور امام بخاریؒ نے "صحیح" میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے، "باب مہل اہل مکۃ للحج والعمرۃ" اور اس کے ذیل میں مواقیت کی حدیث ذکر کی ہے، جس میں یہ لفظ ہیں: "یہاں تک کہ احرام باندھیں اہل مکہ مکہ سے" لیکن شراح صحیحین نے عمرہ کے ساتھ حدیث کی تخصیص کی ہے (یعنی اہل مکہ کو صرف حج کا احرام مکہ سے باندھنے کا حکم ہے، عمرہ کے احرام کا یہ حکم نہیں، بلکہ عمرہ کا احرام حدود حرم سے باہر نکل کر باندھا جائے) اور انہوں نے ترجمہ بخاریؒ کی یہ توجیہہ کی ہے کہ

موصوف نے عموم لفظ پر نظر کی ہے۔ محب طبری کہتے ہیں: "مجھے علم نہیں کہ کسی نے مکہ کو عمرہ کا میقات کہا ہو" کذا فی الفتح، حافظؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ "جب حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمرہ کیا تو یہ اس کی مشروعیت کی دلیل ہے" اھ۔

دوسرا فائدہ: عمرہ کیلئے سب سے افضل میقات کون سا ہے؟

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں یہ عنوان قائم کیا ہے: "اس امر کا بیان کہ مکی عمرہ کرنا چاہے تو اسے کس جگہ سے احرام باندھنا چاہیئے"

اور اس کے ذیل حضرت عائشہؓ کے تنعیم سے عمرہ کرنے کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "پس کچھ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ اہل مکہ کے لیے تنعیم کے سوا عمرہ کا کوئی میقات نہیں۔ یہ لوگ اہل مکہ کے لیے عمرہ کا میقات صرف تنعیم ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ اہل مکہ کو اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، جس طرح غیر اہل مکہ کے لیے جو جو میقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں انہیں احرام کے بغیر ان سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں۔ اور دوسرے حضرات اس کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ اہل مکہ کا میقات، جس سے وہ عمرہ کا احرام باندھیں، حل ہے۔ لہٰذا حل کے جس حصہ سے احرام باندھ لیا جائے کافی ہے۔ ان کے نزدیک تنعیم اور غیر تنعیم حل کے تمام مقامات اس حکم میں یکساں ہیں" اور اس قول کے دلائل ذکر کرنے کے بعد امام طحاویؒ فرماتے ہیں: "اور یہ سب امام ابوحنیفہؒ، امام یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے" اھ مختصراً۔

اور امام مالکؒ مؤطا میں فرماتے ہیں: "رہا تنعیم سے عمرہ کرنا سو یہ متعین نہیں۔ جو شخص حل کی کسی جگہ سے عمرہ کا احرام باندھ لے یہ اس کیلئے ان شاء اللہ کفایت کرے گا۔ لیکن افضل یہ ہے کہ اس میقات سے احرام باندھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا، یا اس مقام سے جو تنعیم سے بعید تر ہو" اھ

اور اوجز میں محلی سے نقل کیا ہے: "جاننا چاہیے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اہل مکہ کے حج کا میقات مکہ اور حرم ہے اور عمرہ کا میقات حل ہے تاکہ ایک نوع کا سفر متحقق ہو جائے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ احرام عمرہ کے لیے حل کی کونسی جگہ افضل ہے؟ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں تمام حل یکساں ہے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تنعیم افضل ہے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سب سے افضل جعرانہ ہے، پھر تنعیم، پھر جو بعید سے بعید تر ہو" اور مغنی میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ مکی عمرہ کے احرام کے لیے جس قدر دور چلا جائے اسی قدر زیادہ ثواب ہوگا۔ اور فاکہیؒ نے حضرت عطاؒ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو وہ تنعیم یا جعرانہ چلا جائے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے، اور افضل یہ ہے کہ میقات حج

سے آئے اور ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے تنعیم کو میقات مقرر کیا ہے۔ اور تحفۃ المحتاج میں ہے کہ عمرہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے حِلّ کی افضل جگہ جعرانہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں سے رات کیوقت عمرہ کیا تھا اس کے بعد تنعیم، پھر حدیبیہ" اھ۔

میں کہتا ہوں کہ نوویؒ نے "مناسک" میں اور عام فقہائے شافعیہ اور ان کے شارحین نے یہی ترتیب ذکر کی ہے۔ حنابلہ کی کتب نیل المآرب اور الروض المربع میں کسی جگہ کی تعیین کو ترجیح نہیں دی، بلکہ صرف حِلّ کے شرط ہونے پر اکتفا کیا ہے اور ابن قدامہ کہتے ہیں: "حِلّ کی جس جگہ سے بھی احرام باندھ لے جائز ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو تنعیم سے اس لیے عمرہ کرایا تھا کہ وہ مکہ سے حِلّ کی قریب تر جگہ تھی" اور دردیر کہتے ہیں: "اور اس کا حِلّ کی طرف نکلنا ضروری ہے، اور جعرانہ دوسری جگہوں سے اولیٰ ہے، اس کے بعد تنعیم" میں کہتا ہوں کہ دسوقی نے ان دونوں کو یکساں قرار دیا ہے۔ کہ ان میں ایک کو دوسری جگہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ اھ۔

اور حنفیہ کے نزدیک تنعیم افضل ہے، جیسا کہ بہت سے اہل فروع نے، جن میں صاحب درمختار بھی شامل ہیں، اس کی تصریح کی ہے۔ اھ ملخصاً۔

تیسرا فائدہ: اشہر حج میں عمرہ کرنا اوجز میں ہے کہ اہل جاہلیت اس کو افجر فجور (سب سے بڑی بدکاری) سمجھتے تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قولاً فعلاً باطل قرار دیا، اور اسی بنا پر صحابہ کو حج فسخ کرکے عمرہ بنانے کا حکم فرمایا تاکہ اس کے جواز کی خوب شہرت ہو جائے۔ حافظؒ کہتے ہیں: "اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص اعمال حج میں مشغول نہ ہو اس کے لیے تمام ایام میں عمرہ کرنا جائز ہے، البتہ حنفیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عرفہ، یوم النحر اور ایام تشریق میں مکروہ ہے" میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یہ بات کمال عمرہ کی موجب ہے کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرے"۔ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: "حج کے معروف مہینے ہیں جن میں عمرہ نہیں" اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "کہ کسی اہل علم نے اس امر میں شک نہیں کیا کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرنا اشہر حج میں عمرہ کرنے سے افضل ہے" اور ابن عون سے نقل کیا ہے کہ قاسمؒ سے اشہر حج میں عمرہ کرنے کے بارے میں دریافت

کیا گیا تو فرمایا وہ (یعنی صحابہ کرام) اس کو تام نہیں سمجھتے تھے ۔ اھ ملخصاً۔

اور مؤطا میں ہے کہ امام مالکؒ، نافعؒ سے اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: "اپنے حج اور عمرہ کو جدا جدا ادا کیا کرو، یہ تمہارے حج کو زیادہ پورا کرنے والی چیز ہے۔ اور عمرہ کو زیادہ پورا کرنے والی بات یہ ہے کہ غیر اشہر حج میں عمرہ کرے۔" میں کہتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کا مقصود تمتع سے منع کرنا تھا اور اس مسئلہ میں ان کا مسلک معروف ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ مکہ مکرمہ کی طرف بکثرت سفر کیا جائے، تاکہ حج اور عمرہ کے لیے مستقل طور پر الگ الگ سفر ہوا کرے، علاوہ ازیں اس کی دیگر وجوہ معروف ہیں۔ جن کی تفصیل اوجز اور حاشیۂ لامع میں مذکور ہے۔

خاتمۂ رسالہ اس مختصر رسالہ میں جن امور کے ذکر کرنے کا ارادہ تھا یہاں بحمد اللہ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی مدد سے جمعۃ المبارک کی صبح، ماہ مبارک رجب المرجب کی پندرہ ۱۵ تاریخ کو ۱۳۹۰ھ تیرہ سو نوے ہجری (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیہ) میں اس کی تسوید سے فراغت ہوئی، اس کی تکمیل میں تقریباً ایک مہینے تک توقف رہا، جس کا سبب یہ ہوا کہ محرم الحرام میں جس آنکھ کا آپریشن ہوا اس کے طبی معائنہ اور علاج معالجہ کے لیے علیگڑھ جانا اور وہاں ہسپتال میں رہنا پڑا۔

اس بندہ پر اللہ رب العزت کے جو بہت ہی عظیم الشان انعامات اور بے شمار احسانات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس بندہ نے جس قدر فضائل کے رسائل تالیف کئے ہیں مثلاً فضائل قرآن اور فضائل حج وغیرہ اور ان کے علاوہ جو کتابیں تالیف کی ہیں ان سب رسائل و کتب کے بارے میں اس بندہ کو یا اس کے بعض مخلصین اصحاب کو رؤیا صالحہ اور بشرات سے نوازا گیا۔

یہ رسالہ "جزء عمرات" جب اختتام کے قریب پہنچا تو ہمارے ایک مخلص دوست جناب الحاج سلیمان افریقی نے (جو مدت تک مدینہ منورہ میں اس بندہ کے پاس رہ کر اوراد و اشغال میں مشغول رہے اور سعادت حج سے بہرہ ور ہونے کے بعد سہارنپور آئے۔ اور سفر و حضر میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں ایک خواب دیکھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں شرف قبول سے سرفراز ہوا۔ الحاج سلیمان کے الفاظ میں خواب کا متن درج ذیل ہے۔

"میں نے خواب دیکھا کہ میرے دل میں زیارت نبوی کا داعیہ پیدا ہوا اور میں مدینہ منورہ

کی طرف پیدل چل کھڑا ہوا۔ ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ مجھے دور سے حرم نبوی نظر آنے لگا۔ دریں اثنا کہ میں حرم شریف کی طرف جا رہا تھا اچانک میں اپنے تئیں آپ کے (یعنی حضرت شیخ کے) حجرے کے سامنے کھڑا پاتا ہوں۔ بہت سے لوگ حجرہ کے باہر کھڑے ہیں اور مولانا محمد یونس صاحب استاذِ حدیث مظاہر العلوم سہارنپور حجرہ سے باہر آرہے ہیں۔ اور مجھ سے کسی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ کے اندر رونق افروز ہیں، یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے داخل ہونے کا اشارہ کیا، میں اندر گیا تو فرحت و مسرت کو ضبط نہ کر سکا اور میرے جسم میں گویا بجلی کی لہر دوڑ گئی، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وصحبہ وسلم آپ کی چارپائی کے سرہانے کی جانب تکیہ لگائے تشریف فرما ہیں، سفید دستار زیب سر ہے، ریش مبارک سفید ہے، اور آنکھوں پر چشمے لگا رکھے ہیں۔ میں نے سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب مرحمت فرمایا اور مصافحہ کے لیے دستِ مبارک بڑھایا، پھر آپ کی جانب متوجہ ہوئے ـــ آپ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب زمین پر بیٹھے یہ رسالہ جزو، "حجۃ الوداع" سنا رہے تھے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سننے میں مصروف ہوگئے اور میں چارپائی سے نیچے اقدام عالیہ کی جانب بیٹھ گیا" اھ

اس رؤیا میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کا اس مبتلائے سیئات کی طرف سماع کے لیے متوجہ ہونا اور اس بندہ کا رسالہ کی قرأت میں مصروف ہونا۔ یہ اس بندۂ ضعیف کے لیے شرف و ابتہاج کا کافی سرمایہ ہے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

تصانیف

حضرت اقدس شیخ الحدیث

مولانا محمد زکریا صاحب، مظاہر العلوم سہارنپور

★ اردو تصانیف:

۱۔ خصائلِ نبوی شرح شمائل للامام الترمذی
۲۔ حکایاتِ صحابہؓ
۳۔ فضائلِ ذکر
۴۔ فضائلِ نماز
۵۔ فضائلِ قرآن مجید
۶۔ فضائلِ رمضان
۷۔ فضائلِ تبلیغ
۸۔ فضائلِ درود شریف
۹۔ فضائلِ صدقات
۱۰۔ فضائلِ حج
۱۱۔ تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور اُن کے مفصّل جوابات
۱۲۔ موت کی یاد
۱۳۔ قرآنِ عظیم اور جبریہ تعلیم
۱۴۔ تقریر بخاری
۱۵۔ تاریخ مشائخ چشت
۱۶۔ اکابر کا رمضان
۱۷۔ خوانِ خلیل
۱۸۔ اکابر کا سلوک و احسان
۱۹۔ مکتوباتِ شیخ
۲۰۔ آپ بیتی
۲۱۔ فتنۂ مودودیت
۲۲۔ حجۃ الوداع
۲۳۔ الاعتدال فی مراتب الرجال (اسلامی سیاست)
اس کتاب میں سیاسی مسائل حاضرہ کے متعلق کافی ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ سات سوالوں کے جوابات انتہائی سنجیدگی اور متانت سے تحریر کئے گئے ہیں۔

★ عربی تصانیف:

۱۔ امانی الاحبار شرح معانی الآثار
۲۔ لامع الدراری علی جامع البخاری
۳۔ اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالکؒ
۴۔ الکوکب الدری (شرح ترمذی)
۵۔ حجۃ الوداع و جزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۔ الابواب والتراجم للبخاری
۷۔ بذل المجہود فی شرح ابی داؤدؒ